گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اگست 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول

عید مبارک

عنیزہ سید اور رفعت سراج کے دلکش سلسلے وار ناول

کہنہ مشق رائٹر عطیہ عمر کی دلنشیں باتیں

مکمل ناول، ناولٹ، افسانے، مضامین اور بہت کچھ

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

افسانے

سلسلے وار ناول





ناولٹ



منی ناول



مکمل ناول



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: افرا .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹوگرافر: موسیٰ رضا
جلد 41 • شمارہ 05 • اگست 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

امانت

رفعت سراج

قسط 8

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمد خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوتی۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈ ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزق حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کررہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آجاتی ہے۔ شبینہ اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر بلانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔ برہان، وارث علی کو دیکھتا ہے تو صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی سے کہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے، جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ جابر علی ایس پی سے جہیز کے بارے میں بات کرتا ہے تو ایس پی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ گل جان کو کائناز اور شاہ عالم سے بہت ڈھارس ہوتی ہے، مہر جان کو ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں، برہان اپنے کلاس فیلو نعمان کے پاس چلا جاتا ہے اور اس کے سمجھانے پر صابرہ کو فون کرتا ہے۔ گل جان، شاہ عالم کی شکر گزار ہوتی ہے کہ انہوں نے روما کا خیال رکھا۔ رابی مری میں ایک چیزیں فروخت کرنے والی ایک عورت سے بہت متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس بڑھاپے میں اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہے۔ اس عورت کے پوچھنے پر رابی اسے بتاتی ہے کہ وہ ڈاک بنگلے میں رہتی ہے اور اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ صابرہ، جابر علی سے کہتی ہے کہ وہ برہان کو واپس لے آئے۔ مہر جان کا آپریشن ہوگیا لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تو گل جان بہت پریشان ہوتی ہے لیکن نرس اسے تسلی دیتی ہے۔ روما، کائناز اور شاہ عالم کے ساتھ اسپتال آجاتی ہے۔ شبینہ، جابر علی پر خط کے ذریعے شادی کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کردیتی ہے۔ واسطی صاحب فون پر اصیل خان کو بتاتے ہیں کہ وہ لڑکی تک پہنچ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت وہ پولیس کی حراست میں ہوگی۔ جابر علی کہتا ہے کہ اب شادی شبینہ کی نہیں ستارہ کی ہوگی۔ برہان اخبار میں اشتہار دیکھ کر شاہ عالم کے پاس انٹرویو کے لیے جاتا ہے اور وہ اسے کائناز کو پڑھانے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ رابی ہوٹل میں اپنے کمرے میں ہوتی ہے کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے وہ دروازہ کھولتی ہے تو سامنے پولیس کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ اصیل خان ماضی کے دنوں میں اپنے اور مہر جان کے گزرے یادگار لمحات میں گم ہوتا ہے کہ گل جان اسے مہر جان کے ہوش میں آنے کی اطلاع دیتی ہے۔ صابرہ، شبینہ کو بتاتی ہے کہ اب شادی شبینہ کی نہیں ستارہ کی ہوگی اب مسئلہ یہ ہے کہ ستارہ کو یہ بات کیسے بتائی جائے۔ اصیل خان، گل جان کو بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو کراچی لے کر آرہی ہے۔ وارث علی زیورات لے کر جابر علی کے گھر آتا ہے۔ جابر علی اتنا کچھ دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ وہ زیورات شادی کے لیے دے کر چلا جاتا ہے...... ستارہ وہ زیورات دیکھنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ ستارہ زیورات دیکھ کر شبینہ کی قسمت پر رشک کرتی ہے۔ کائناز، روما سے کہتی ہے کہ اب وہ اس کے ساتھ ٹیوشن پڑھے کیونکہ وہ ٹیوٹر سے بات کرچکی ہے روما اس کی بات پر متردد ہوتی ہے۔ پولیس اسٹیشن سے فون آتا ہے وہ اصیل خان سے کہتے ہیں کہ لڑکی کراچی پہنچ گئی ہے اب اس کو آکر لے جائیں۔

اب آگے پڑھیں

کائناز، برہان کے جانے کے بعد کھانا کھانے چلی گئی تھی۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں گئی تو اسے خیال آیا کہ اس کی ساری کتابیں تو ڈرائنگ روم میں ہی ہیں۔ وہ فوراً ڈرائنگ روم میں آئی اور اپنی کتابیں اکٹھی کیں تو اس کی نظر برہان کے موبائل پر پڑی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر موبائل اٹھالیا اور جیسے خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

''یہ تو سر کا موبائل ہے، اوہ لگتا ہے جلدی میں بھول کر چلے گئے۔ بہت پریشان ہو رہے ہوں گے لیکن اب کل آئیں گے تبھی اُن کو یہ موبائل مل سکے گا۔'' اس نے سوچتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور اپنی کتابیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''شاید دادا جان کے پاس سر کا کانٹیکٹ نمبر ہو، وہ یہ سوچ کر شاہ عالم کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے نائٹ بلب کی ہلکی سی روشنی میں آنکھیں موندے گویا وہ نیند کا انتظار کررہے تھے۔

کائناز ان کے قریب چلی آئی اور جھک کر دیکھنے لگی کہ وہ سو رہے ہیں یا ابھی تک جاگ رہے ہیں، انہیں شاید کمرے میں کسی کی آمد کا احساس ہوگیا تھا جبھی انہوں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں تو سامنے کائناز کھڑی انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دم پریشان سے ہوگئے...... اور اٹھنے لگے۔

کائناز نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے لیٹے رہنے کو کہا۔

''دادا جان آپ لیٹے رہیے، میں تو بس آپ سے یہ پتا کرنے آئی ہوں کہ آپ کے پاس برہان سر کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے؟''

''بیٹا اتنی رات کو تمہیں ان سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی اگر کوئی مسئلہ ہے تو کل وہ آئیں گے تو پوچھ لینا۔'' شاہ عالم نے حیرت اور تعجب سے پوتی کی طرف دیکھا۔

''نہیں دادا جان! مجھے ان سے کانٹیکٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنا سیل فون ہمارے گھر ہی بھول گئے ہیں اور شاید انہیں یہ خیال ہی نہ ہو کہ وہ اپنا فون بھول گئے ہیں اور وہ پریشان ہو کر اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے تو میں نے سوچا کہ انہیں فون کرکے بتا دیتی ہوں کہ ان کا سیل یہاں ہے۔''

''اوہ......'' شاہ عالم کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ''ہاں تمہاری بات بھی ٹھیک ہے... مگر میرے پاس تو ان کا صرف یہی نمبر ہے۔''

''جی بس میں یہی پتا کرنے آئی تھی کہ اگر آپ کے پاس ان کا کوئی نمبر ہو تو میں انہیں فون کرکے بتا دیتی ہوں مگر اب نہیں ہے تو ظاہر ہے جب وہ آئیں گے تبھی انہیں موبائل مل سکے گا۔ چلیں ٹھیک ہے آپ سو جائیں، آرام کریں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

''ہاں بیٹا تم بھی جلدی سے سونے کی کوشش کرو، روما سے بات کرنے لگ جاتی ہو تو تمہیں وقت کا پتا نہیں چلتا۔ وہ آج کل بہت پریشان ہے اسے ڈسٹرب نہ کرو۔'' شاہ عالم نے اسے تاکید کی۔

''جی دادا جان!'' وہ کہہ کر سر جھکا کر ایک جھٹکے سے باہر نکل گئی۔ برہان کا موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔

☆☆☆

''یار قسمت سے ایک سستا موبائل مل گیا تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا...... وہ کہتے ہیں ناں مصیبت اکیلی نہیں آتی۔'' برہان بڑی افسردہ سی کیفیت میں نعمان سے کہہ رہا تھا۔ نعمان اس کی طرف دیکھ کر کچھ سوچنے لگا پھر اس نے سوچتے سوچتے سر اٹھایا اور برہان کی طرف دیکھا۔ میرے پاس ایک ایکسٹرا موبائل رکھا ہوا ہے۔ میرے چاچو لاسٹ ائیر لے کر آئے تھے۔

''میرے پاس تو پہلے سے ہی بہت اچھا موبائل ہے۔ چاچو والا موبائل تو اسی طرح بالکل پیک پڑا ہوا ہے۔ میں نے تو اسے کھول کر بھی نہیں دیکھا۔ ایک منٹ رکو میں لے کر آتا ہوں۔'' نعمان اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تو برہان نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کے دباؤ ڈالا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ بیٹھ جائے۔ نعمان نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یار مجھے اتنا expensive موبائل نہیں چاہیے۔" نعمان اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

"یار کیسا مہنگا، مجھے تو مفت میں ملا ہے۔ میں نے کون سا اس کی پیمنٹ کی ہے۔ وہ تو چاچو نے گفٹ کیا تھا۔" برہان مسکرا دیا۔

"یار چاچو نے تمہیں گفٹ دیا ہے، انہوں نے تو خریدا ہوگا ناں اور کتنے شوق اور کتنی محبت سے تمہارے لیے لے کر آئے ہوں گے۔ یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا مگر میں وہ ہرگز نہیں لوں گا۔"

"یار یہ کمپلیکس انسان کو کھل کر جینے نہیں دیتے۔ بندے کو تھوڑا سا ڈھیٹ اور بے حس بھی ہونا چاہیے تو زندگی میں تھوڑی سہولت ہو جاتی ہے۔" نعمان بیٹھ گیا اس نے برہان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور بہت محبت سے بولا۔

برہان اس کی بات سن کر بے اختیار ہنس دیا۔ اس نے نعمان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی پھر بڑے اطمینان سے گویا ہوا۔

"میں کسی کمپلیکس کا شکار نہیں ہوں لیکن یہ سب کچھ اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے کہ اگر کوئی آپ کے ساتھ بہت اچھا چل رہا ہو تو اسے مزید نہیں آزمانا چاہیے اور دوستی میں تو ویسے بھی ایک دوسرے کو آزمانا بہت غلط بات ہوتی ہے، تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بہت ہے۔ میں تمہارا موبائل نہیں لوں گا چاہے تم مجھے کمپلیکسڈ سمجھو، چاہے تم مجھے کچھ اور کہو۔" برہان نے گویا اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

"یار تمہیں اندازہ ہے ناں موبائل کے بغیر تمہیں کتنا مسئلہ ہو جائے گا۔" نعمان نے ایک دفعہ پھر اسے اپنا موبائل لینے پر آمادہ کرنا چاہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" برہان نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری کون سی رشتے داریاں، یار دوستیاں چل رہی ہیں۔ امی کو بھی ہر وقت فون نہیں کرتا، یہی سوچ کر کہ شاید ابا جان گھر پر ہوں گے اور میرے فون کی وجہ سے وہاں پھر کوئی ایک نئی بحث شروع ہو جائے۔ ہاں، امی موقع محل دیکھ کر خود فون کر لیتی ہیں۔"

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم میرے موبائل سے فون کر کے گھر پر بتا تو دو ناں کہ تمہارا فون گم ہو گیا ہے۔ آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" نعمان نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے برہان کی طرف بڑھایا۔

برہان نے بھی موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر فوراً ہی ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ جیسے کسی خیال نے اسے روک دیا ہو۔ نعمان حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں یار اس وقت ابا جان گھر پر ہوں گے، میں فون نہیں کر سکتا۔"

"اوہ!" نعمان کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے موبائل واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ برہان کے چہرے پر تفکرات کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ وہ بہت فکر مند تھا لیکن کوشش کر رہا تھا کہ اس کی اندرونی کیفیت نعمان پر ظاہر نہ ہو۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی لیکن صابرہ کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جابر علی کے خراٹے پورے گھر میں گونج رہے تھے۔ جو اس کی گہری نیند کی غمازی کر رہے تھے۔ لڑکیوں کے کمرے میں کافی دیر پہلے خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سو رہی تھیں۔ صابرہ کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ بیٹے کی یاد نے اسے بے کل کیا ہوا تھا۔ ایک پل دل کو قرار نہیں تھا...... وہ ماں جس

کا بیٹا آنکھوں سے دور ہو اور جو اس سے ہی بے خبر ہو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے، اس نے پیٹ کا دوزخ ٹھنڈا کیا کہ نہیں...... اسے سونے کے لیے کوئی سکون کا بستر ملا کہ نہیں...... بستر پر لیٹ کر کیسے آنکھیں بند کر سکتی تھی۔ اس نے تڑپ کر جیسے برہان کو دل ہی دل میں صدائیں دیں۔ یوں جیسے کہ جواب آئے گا۔ کوئی ایسا جواب جس سے اس کا بے قرار دل سنبھل جائے گا لیکن جتنی خاموشی گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ اس کے دل میں تھی۔ چند لمحے وہ بیٹے کے خیال میں کھوئی رہی پھر اچانک ہی اس کے جسم میں...... توانائیاں سی دوڑنے لگیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے بیٹے سے بات کر کے اس کا حال پوچھ سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ اپنے جگہ سے اٹھی اور کمرے میں چلی آئی۔ اسے کبھی کسی کا ٹیلیفون نمبر زبانی یاد نہیں ہوا تھا۔ برہان کا بھی نہیں۔ اس نے گھر میں استعمال ہونے والی ڈائری اٹھا کر اس کے صفحے پلٹے......

برہان کا نمبر نکالا اسے زیرِ لب دُہرایا مگر اعتماد نہ ہوا کہ وہ بغیر دیکھے ڈائل کر لے گی تو وہ ڈائری اٹھا کر باہر چلی آئی۔ برآمدے کی لائٹ جلائی کیونکہ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ لائٹ جلتے ہی وہ تمام حصے بھی روشن ہو گئے جو کچھ دیر پہلے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے چند لمحے رک کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لائٹ جل جانے کے بعد کسی کو روشنی کا احساس تو نہیں ہوا بالخصوص جابر علی کی نیند میں خلل تو واقع نہیں ہوا۔ جب ہر طرح سے تسلی ہو گئی کہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کچھ دیر پہلے تھا تو اس نے بہت محتاط انداز میں دیکھ دیکھ کر برہان کا نمبر ڈائل کیا۔ ریسیور کان سے لگا لیا نمبر ڈائل ہوتے ہی رابطہ قائم ہو گیا تھا، رنگ جا رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ جیسے چند لمحے بعد برہان کی آواز گونجے گی اور اس کے مردہ وجود میں زندگی دوڑنے لگے گی لیکن چند لمحے بعد ہی اس کے چہرے پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ رنگ جاتے جاتے بند ہو گئی اور ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے اس وقت جواب موصول نہیں ہو رہا برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔

صابرہ کو ری ڈائل کرنا نہیں آتا تھا اس نے نئے سرے سے نمبر ملایا...... پھر وہی ہوا اور ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ صابرہ نے بھی جیسے ہمت نہ ہارنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے تیسری مرتبہ نمبر ملایا۔

☆☆☆

معمول کے مطابق آج کائنازکی روما سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے شاید اسے آج نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گئی تھی یوں لگا جیسے رات اسی طرح گزر جائے گی۔ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ روما کو کال کر لے لیکن اسے خود ہی خیال آیا کہ شاید روما سارا دن اسپتال میں مصروف رہی ہوگی۔ شاید اب تھک کر سو گئی ہوگی، وہ آنکھیں موند کر نیند کا انتظار کرنے لگی اور اسی لمحے برہان کے موبائل فون پر تیسری بار رنگ ہوئی..... دو بار تو اس نے رنگ سن لی تھی۔ یہ سوچ کر برہان کے فون پر آنے والی کال سے اس کا کیا تعلق ہے، ویسے بھی طبیعت میں عجیب سی بیزاری بھری ہوئی تھی۔ چپ چاپ آنکھیں موند کر بستر پر لیٹے رہنے میں زیادہ مزہ آ رہا تھا۔

خاموشی اور تنہائی بہت اچھی لگ رہی تھی...... لیکن برہان کے فون سیٹ پر آنے والی کال نے اسے نئے سرے سے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اٹھی کہ جو بھی کال کر رہا ہے اسے بتا دے کہ برہان کا فون اس وقت اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ یہاں بھول کر چلا گیا ہے پھر موبائل تک بڑھتے بڑھتے اچانک ہی اسے خیال آیا کہ کہیں برہان خود ہی فون کر کے چیک کر رہا ہو، اپنا فون ڈھونڈ رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے وجود میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ بڑی پھرتی سے آگے بڑھی اور اس نے فوراً دیکھے بغیر کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو......" دوسری طرف تو صابرہ پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس نے تو بہت دھیان سے برہان ہی کا نمبر ملایا تھا لیکن برہان کے نمبر سے کسی لڑکی کی آواز گویا وہ بری طرح چکرا کر رہ گئی۔ اس نے بے اختیار نفی میں اپنا سر ہلایا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ "میں نے تو برہان کا نمبر ملایا تھا یہ کس کا نمبر مل گیا۔" اس سے پیشتر کہ وہ فون بند کرتی دوسری طرف سے کائناز بول پڑی۔

"جی آنٹی، یہ برہان سر کا ہی نمبر ہے، میں کائناز بات کر رہی ہوں۔ سر اپنا موبائل ہمارے گھر بھول کر چلے گئے ہیں۔"

"سر! بیٹا آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔ میں اپنے بیٹے برہان کی بات کر رہی ہوں۔ یہ نمبر اسی کا ہے ناں......؟" صابرہ کائناز کی آواز سن کر بے اختیار چونک پڑی اور بڑے الجھن بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"جی آنٹی یہ برہان کا ہی نمبر ہے میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ اپنا سیل ہمارے گھر بھول گئے ہیں۔"

"بیٹا آپ کے گھر...... برہان آتا ہے، آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں۔" وہ جیسے حواس باختہ ہو گئی تھی۔

"آنٹی میں کلفٹن سے بات کر رہی ہوں، برہان سر مجھے ٹیوشن پڑھانے روز شام کو ہمارے گھر آتے ہیں۔" کائناز بولی تو دوسری طرف سے صابرہ نے بھی جلدی سے کہا۔

"اچھا...... اچھا بیٹا میں سمجھ گئی۔ آج برہان اپنا فون تمہارے گھر بھول گیا ہے...... ناں۔"

"جی...... جی آنٹی......"

"تو ٹھیک ہے بیٹا کل جب وہ آئے تو اسے کہنا مجھ سے بات کر لے میں اس کی امی صابرہ بات کر رہی ہوں، ٹھیک ہے بیٹا۔" صابرہ بہت محبت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔ اس کی آواز میں جادو تھا کہ کائناز لمحے بھر کے لیے دم بخود رہ گئی تھی۔ ایسا جادو جو محبت، شفقت اور بے پناہ اپنائیت لیے ہوا تھا۔

"بیٹا آپ کو میری آواز آ رہی ہے۔" صابرہ کو کائناز کی خاموشی نے قدرے پریشان کیا۔

"جی...... جی آنٹی مجھے آپ کی آواز آ رہی ہے اور میں نے آپ کی بات سن لی ہے، کل سر آئیں گے تو میں بتا دوں گی کہ آپ کے سیل پر آپ کی مدر کا فون آیا تھا۔" کائناز نے بہت اچھے طریقے سے صابرہ کو مطمئن کیا۔

"بہت بہت شکریہ بیٹا...... اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں۔" صابرہ پوچھ رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ کائناز، صابرہ کو جواب دیتی۔ اس نے ائیر پیس میں ایک مرد کے دہاڑنے کی زبردست آواز سنی۔ موبائل اس کے کان سے لگا تھا۔ آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

"یہ راتوں کو چھپ چھپ کر بیٹے کو فون ہوتے ہیں، سازشیں ہو رہی ہیں میرے خلاف، رپورٹیں دیتی ہو سارا دن کی۔" جابر علی دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا لیکن کائناز اپنی جگہ جیسے پتھر کا بت بن کر کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ کی تھی کہ اتنی شفیق اور مہربان آواز کے بعد فوراً ہی اس نے کسی جلاد کے دہاڑنے کی آواز سنی تھی۔

☆☆☆

صابرہ، برہان کو فون کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اب تو جو بھی ہوتا کم تھا۔

"بیٹے سے مذاکرات ہوتے ہیں راتوں کو...... میرا کھاتی ہے، وفاداری اولاد سے نبھاتی ہے۔" جابر علی نہایت طنطناتے ہوئے صابرہ کو گھور گھور کر کہہ رہا تھا۔ صابرہ کے اعصاب چیخ چیخ گئے۔

"میں ماں ہوں جابر علی، برہان میری اولاد ہے، یاد آ رہا تھا، دو چار باتیں کر لیں تو کیا ہو گیا۔" جانے

کہاں سے اس میں ہمت آ گئی تھی، وہ بڑی بے اختیار کیفیت میں بولی تھی۔

"ارے اولاد اتنی پیاری ہے تو یہاں کیا کر رہی ہو، اسی کے پاس چلی جاؤ۔" جابر علی نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی تھی۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، وہ تو گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"پھر تم بھی چلی جاؤ، تمہیں کس نے روکا ہے۔" جابر علی نے ایک مرتبہ پھر بڑی تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"جابر علی بات کرتے ہوئے کچھ تو سوچ لیا کرو، جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں گھر میں۔" صابرہ نے غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں شوہر کو ٹوکا تھا۔

"تجھ سے زیادہ خیال ہے مجھے اپنی بیٹیوں کا...... آئی سمجھ! سال میں صرف دو جوڑے کپڑے نہیں بناتا۔ جو کماتا ہوں تیری اولاد پہ خرچ کر دیتا ہوں اپنی ذمے داریوں کا اچھی طرح احساس ہے مجھے۔ میرے سامنے زیادہ افلاطون بننے کی ضرورت نہیں۔ خبردار جو میرے گھر سے آئندہ اپنے بیٹے کو فون کیا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" جابر علی نے دھمکی آمیز انداز میں بیوی سے کلام کیا اور اسی طرح غصے میں طنطناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"یا اللہ کیسی نیند ہے اس شخص کی پتا ہی نہیں چلتا میں تو سوچ رہی تھی کہ شاید بہت گہری نیند سو رہے ہیں۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "ہائے میری قسمت۔" صابرہ پلنگ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

☆☆☆

رابی پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہوئی تھی...... اس نے چادر سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل کرسی پر بیٹھا ہوا ایک ٹک اسے گھورے جا رہا تھا...... لیڈی کانسٹیبل رابی کے اردگرد ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے ذرا دیر کو رکتی، رابی پر نظر ڈالتی پھر ٹہلنا شروع کر دیتی...... پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ رابی کے پاس آ کر رک گئی اور اسے گھورتے ہوئے کہنے لگی۔

"یار کے ساتھ بھاگی تھی اور وہ تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا؟ یہی ہوتا ہے تم جیسی لڑکیوں کے ساتھ۔"

رابی نے ایک نظر لیڈی کانسٹیبل پر ڈالی اور اپنا سر جھکا لیا وہ بالکل خاموش تھی۔

"بہت مال لے کر بھاگی تھی تو ڈاکٹر صاحبہ کی نوکرانی نہ ہوتی تو تجھے پتا ہی لگ جاتا۔ وہ تو اوپر سے آرڈر ہے کہ تیرا خیال کیا جائے۔" لیڈی کانسٹیبل سر ہلاتے ہوئے بڑے دھمکی آمیز انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

رابی کی خاموشی اسی طرح تھی...... اس لیے کہ اس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

"یہ تو بتاؤ نوٹوں کے پیکٹ تم نے چرائے کیسے؟ بڑی ایکسپرٹ لگتی ہو، لگتا تو یہی ہے کہ پہلے ڈاکٹر صاحب کے گھر سے مال چوری کر کے اپنے یار کو سپلائی کر دیا ہوگا۔" یہ کہہ کر لیڈی کانسٹیبل نے اپنے میل کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی جیسے اس سے تائید چاہ رہی ہو...... کہ اس نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ بڑا زبردست پوائنٹ اٹھایا ہے۔

"حلیہ اور شکل تو دیکھو، لگتا ہی نہیں ہے کہ نوکرانی ہو...... بڑا مین ٹین رکھا ہوا ہے اپنے آپ کو۔" اس کی بات پر دوسرے کانسٹیبل نے مزید نظریں گاڑ دی تھیں اس کے اوپر۔

"خالی نوٹ لے کر بھاگی تھی یا زیور بھی اٹھایا تھا...... اگر اٹھایا تھا تو وہ کہاں ہے...... اور زیور غائب ہے

تواس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا یار لے کر بھاگ گیا لیکن یہ تو بتا نوٹ کیوں چھوڑ گیا؟"

"بکواس بند کرو!" رابی کی جیسے اب قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس نے بہت کس کے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور پوری قوت سے چلائی۔ دونوں نے ہکا بکا ہو کر رابی کی دیکھا تھا جیسے انہیں امید ہی نہیں تھی کہ وہ اتنی زور سے چلا بھی سکتی ہے۔

"پولیس والوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے، شرم تو بیچ کر کھا گئی...... عقل بھی ساتھ چھوڑ گئی کیا؟" لیڈی کانسٹیبل جو رابی کے قریب ہی کھڑی تھی اس نے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا۔

رابی اپنے گال پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور بے بسی کی کیفیت بھی...... لیڈی کانسٹیبل نے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اوپر سے آرڈر ہے کہ تجھے لاک اپ میں نہیں رکھنا، ڈاکٹر صاحب کے گھر بھیجنا ہے ورنہ تو میں تجھے بتاتی اچھی طرح۔" رابی کو یوں لگا جیسے اسے چکر آرہے ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

گل جان، ڈاکٹر مہر جان کے وی آئی پی وارڈ میں قریب ہی کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس وقت نرس نے آکر اسے اطلاع دی کہ ریسپشن پر آکر وہ اپنا فون ریسیو کرلیں۔

"فون......؟" گل جان اپنے خیال سے چونک پڑی تھی۔ اس نے نرس کی طرح الجھن بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی آپ کے گھر سے فون ہے۔" یہ کہہ کر نرس فوراً ہی نکل گئی تھی۔

گل جان نے بڑی فکر مندی سے ایک نظر بی بی جان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ شاید روما کا فون ہوگا...... وہ الجھی الجھی کیفیت میں ریسپشن تک آئی ریسیور کاؤنٹر پر پڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گل جان نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور بڑی کمزور سی آواز میں گویا ہوئی۔

"ہیلو......"

"گل جان بی بی میں اصیل خان بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے اصیل خان بات کر رہا تھا۔

"بولو اصیل خان۔" وہ پریشان ہو کر کہہ رہی تھی۔

"وہ بات یہ ہے کہ پولیس اسٹیشن سے فون آیا ہے۔" اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"پولیس اسٹیشن......؟" گل جان کے چاروں طرف جیسے بم کے گولے گر گر کر پھٹنے لگے۔

"جی، فون تو رات بھی آیا تھا لیکن ابھی جو فون آیا ہے اس سے پتا چلا ہے کہ رابی اب اسی شہر میں ہے اور پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہے پولیس اس کو مری سے گرفتار کر کے لائی ہے۔"

"گرفتار کر کے لائی ہے۔" گل جان کا دل کسی ان دیکھی گہرائی میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی تھی۔

"جی، اب آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟"

"میں بتاؤں کیا کرنا ہے؟" گل جان کو اصیل خان کا جواب کچھ سمجھ نہیں آیا۔

"جی، میرا مطلب یہ ہے کہ پولیس والے کہہ رہے ہیں کہ آکر لے جائیں۔"

گل جان نے اپنے تاریکیوں میں ڈوبتے ہوئے دل کو بڑی مشکل سے قابو کیا۔ "لانا تو ہوگا ناں اصیل

خان...... اور اسے کون لا سکتا ہے۔ ظاہر ہے تم ہی لے کر آؤ گے۔ جاؤ لے آؤ اسے ایک مرتبہ پھر روز مرنے کے لیے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

وارث علی، ایس پی شاہ زمان کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے چہروں پر فتح مندی اور کامرانی کے تاثرات چمک رہے تھے اور جیسے وہ قہقہے لگانے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔

"سر جی آپ سین تو دیکھتے، زیور دیکھ کر تو جابر علی کے ہوش ہی گم ہو گئے۔" وارث علی بڑے ڈرامائی انداز میں منظر کشی کر رہا تھا۔

"سارا کا سارا نقلی ہے یا کچھ اصلی بھی لے گئے تھے۔" ایس پی شاہ زمان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی ابھری۔

"تھوڑا سا اصلی بھی ڈالا ہے شاہ جی۔" وارث علی، شاہ زمان کی طرف جھک کر بڑی رازداری کے انداز میں بولا تھا۔

"میرا مطلب ہے چاندی پر سونے کی پالش کروائی ہے بھئی چاندی تو اصلی ہوئی ناں تو کہہ سکتے ہیں کہ زیور نقلی نہیں اصلی ہے۔" شاہ زمان نے یہ سن کر بڑا زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"واہ بھئی مان گئے تمہیں...... اور جو تم نے دلیل دی ہے ناں وہ بہت مضبوط ہے، میں ہارا تم جیتے......"

"ویسے یار کتنے سیٹ لے گئے تھے......؟"

"پورے پانچ سیٹ لے گیا تھا سر جی...... کوئی مائی کا لال ذرا کہہ دے اسے دیکھ کر کہ یہ اصلی زیور نہیں ایسا کندن کی طرح چمکتا ہوا بالکل پاسے کا سونا لگ رہا تھا۔"

"بہت خوب......" شاہ زمان نے جیسے وارث علی کو کوئی عظیم کارنامہ انجام دینے پر داد دی تھی۔

"یعنی کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمارے اچھے دن بہت قریب آرہے ہیں۔"

"آرہے ہیں نہیں سر جی آچکے ہیں، ایک ہفتے بعد تو شادی ہے، بس پھر سب کچھ اپنی جیب میں آگیا سمجھو......"

"لیکن یار شروع، شروع میں تو تمہیں بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ بیوی کے احساسات کا بھی بہت خیال رکھنا ہوگا۔ بیوی ہی بدک گئی تو پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"آپ نے کیا مجھے اتنا بے وقوف سمجھا ہوا ہے سر جی...... ارے، پہلے بیوی ہی کو تو شیشے میں اتارنا ہے، بیوی شیشے میں اتری سمجھو ہم کیس جیت گئے...... پھر جابر علی ہمارا کچھ نہیں کر سکے گا۔" وارث علی نے بڑے اعتماد سے ایس پی کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

"یار ویسے تمہیں آٹھویں شادی کرتے ہوئے کیسا لگ رہا ہے۔ سات شادیوں کا تجربہ کوئی مذاق نہیں، تم تو ڈیڑھ سو سال کے بوڑھے آدمی سے زیادہ تجربہ کار ہو چکے ہو۔ بندہ ایک شادی کے بعد تجربہ کار کہلانے لگتا ہے، یار تم تو تجربات کی حدیں پھلانگ گئے ہو۔" ایس پی شاہ زمان نے یہ کہہ کر زوردار قہقہہ لگایا۔ وارث علی بھی اتنی ہی اسپرٹ کے ساتھ قہقہہ لگانے میں اس کا ساتھ دینے لگا بہ مشکل دونوں نے قہقہوں کو کنٹرول کیا تھا۔

"ویسے یار تمہارے پاس ٹرک کیا ہے، عورتیں کیسے پھنس جاتی ہیں، ہم تو یار دوسری شادی کا نام لیں تو ہمارے گھر میں زلزلہ آجاتا ہے۔ میرا مطلب ہے مذاق میں بھی، سنجیدگی سے لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ تم نے شاید سنا نہیں پولیس والے کی بیوی اس سے زیادہ پولیس والی ہوتی ہے۔"

وارث علی شاہ نے ایس پی کی بات سن کر بھرپور زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"سات شادیاں تو ہوئیں مگر پھر بھی نہیں ہوئیں یعنی پانچ کو تو میں فارغ کر چکا ہوں، ٹرک یہ ہے کہ چار ہوجاتی ہیں، دو کی جگہ خالی کرتا ہوں پھر دو آجاتی ہیں...... پھر جو دو سینئر ہوتی ہیں وہ واپس کر دیتا ہوں دو جونیئر آجاتی ہیں۔ بھئی غیر قانونی اور غیر شرعی کام نہیں کرتا...... ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں رکھیں۔" وارث علی ..... بڑے بھونڈے انداز میں اپنی کارکردگی بتا کر شاہ زمان کو تسلی دے رہا تھا۔

شاہ زمان پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اتنا ہنسا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھیں اور کہنے لگا۔

"تمہارا ابھی جواب نہیں وارث علی، کہتے تو ہمیں سر جی ہو لیکن اصولی بات یہ ہے کہ سر جی تو تمہیں کہنا چاہیے۔" وارث علی اب جھک کر آداب بجالانے لگا۔ جیسے خاکساری کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

"یار وہ لوگ بہت تنگ کر رہے ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کے علاقے میں پاؤں رکھنے کے لیے جگہ چاہیے اور یہ آپ کا ایماندار افسر ہماری جان کو آگیا ہے۔ ہر وقت دھندا خطرے میں ہے، ہم اس بندے سے بھی نبٹ لیتے، ایسا غائب کر دیتے جیسے پیدا ہی نہیں ہوا مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ آئی جی صاحب کا سر چڑھا ہوا ہے اور ان کے بہت قریب ہے۔ اِدھر اُدھر سے پتا چلتا ہے کہ آئی جی صاحب ڈائریکٹ اس سے انفارمیشن لیتے ہیں اس لیے کوئی رسک نہیں لیا جاسکتا اگر اسے کچھ ہوا تو آئی جی صاحب فوری investigation کروائیں گے۔"

شاہ زمان اب سنجیدہ ہو چلا تھا۔ وارث علی، ایس پی کی بات سن کر اسی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"سر جی آپ کو کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے...... سمجھیں کام ہو گیا۔ لڑکی گھر میں آگئی تو سمجھو اس کا باپ جیب میں آگیا۔"

ایس پی شاہ زمان کے چہرے پر فتح مندی کے تاثرات بہت واضح نظر آرہے ہیں۔ جیسے وارث علی کی باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھا ہو۔

"ٹھیک ہے یار، تم شادی کی تیاری کرو، تمہاری شادی دھوم دھام سے ہوگی۔ تمہارے دوست احباب کم ہوں گے لیکن پچاس ساٹھ باراتی میری طرف سے۔ زیادہ تو نہیں ہیں......؟" وارث علی مسکرا دیا۔ شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

"بیچ سو بندے لے آئیں۔ ہم نے کون سا اپنی جیب سے کھلانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی کنگھی نکالی اور اپنے بچے ہوئے بالوں پر پھیرنے لگا۔

شاہ زمان اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اطمینان اور سکون کا وہ عالم تھا جیسے دنیا میں واحد یہ دو بندے ہوں...... جنہیں غم کے معنی ہی نہ پتا ہو۔

☆☆☆

کائناز آنکھیں پھیلائے حیران پریشان شاہ عالم کو بڑے رازدرانہ انداز میں بتا رہی تھی۔

"دادا جان میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔ سر کی امی جب بات کر رہی تھیں تو ایک آدمی اتنی زور سے چیخا کہ بیٹے سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ میرے خلاف سازشیں کر رہی ہے۔ دادا جان مجھے تو اتنا ڈر لگا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یہ سر کے گھر میں کون آدمی اتنی زور سے چیخ سکتا ہے۔" شاہ عالم بہت توجہ سے کائناز کی بات سن رہے تھے مگر ساتھ ساتھ ان کا اپنا ذہن اِدھر اُدھر قلابازیاں بھی کھا رہا تھا۔ اس کا سوال سن کر وہ زبردستی کے انداز میں مسکرائے کیونکہ ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

"بیٹا، ظاہر ہے تمہارے سر کی امی بات کر رہی تھیں اور ان سے کوئی شخص چلا کر بات کر رہا تھا ممکن ہے وہ تمہارے سر کے فادر ہی ہوں گے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" شاہ عالم نے کائناز کو تو تسلی دی لیکن خود اندر سے بری طرح فکر مند ہو گئے تھے کیونکہ یہ چند جملے یا چند الفاظ نہیں تھے۔ یہ پوری بائیوگرافی تھی برہان کی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے گھر کا کیا ماحول ہے، کیا حالات ہیں، لفظ سازشیں اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا تھا...... اور کچھ ایسے بھید دیتا تھا جس کی حقیقت کو تسلیم کرنے میں شاہ عالم کو بہت ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ ان کے کمزور اور ناتواں دل کو ہر پل ہر لمحے کسی خود فریبی کی لاٹھی درکار تھی۔ اندر ہی اندر ایک دکھ ان کو کاٹنے لگا کیونکہ وہ برہان سے بہت متاثر تھے۔ اس کی شائستگی، اس کا رکھ رکھاؤ...... اس کی بات چیت...... کائناز نے انہیں ایک نئی سوچ دے دی تھی۔ ان کا ذہن جیسے برہان میں اٹک کر رہ گیا۔ انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ برہان کا ان کے گھر میں آکر ٹیوشن پڑھانا صرف پارٹ ٹائم جاب نہیں ہے۔ شاید اس کی مجبوری ہے۔

"دادا جان آپ کیا سوچ رہے ہیں...... ہوں...... لگتا ہے آپ بھی یہ سن کر پریشان ہو گئے ہیں۔ میں بھی رات سے پریشان ہوں۔ دادا جان اس آدمی کی آواز اتنی تیز تھی، آپ یقین کریں ایسا لگا جیسے میرے کان کا پردہ پھٹ گیا ہو۔"

"بس بیٹا اب آپ خاموش ہو جائیں اور دیکھیں برہان کو یہ فون واپس کرتے ہوئے اتنا ضرور بتا دیں کہ ان کی مدر کی کال آپ نے ریسیو کی تھی لیکن آپ نے جو کچھ سنا وہ آپ اپنے سر سے شیئر نہیں کریں گی۔ انڈر اسٹینڈ!"

"yes I nder stand دادا جان مجھے پتا ہے کہ سر سے یہ والی بات نہیں کرنی ہے۔" کائناز نے انہیں تسلی دی اور شاہ عالم سوچ رہے تھے کہ اتنے ٹینس حالات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا بچہ نہایت قابلِ ستائش ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان گہری نیند سے جاگ چکی تھیں اور انہوں نے گل جان سے پانی مانگا تھا۔ گل جان نے گلاس میں پانی ڈال کر انہیں سہارا دیا اور پانی پلانے لگی۔ مہر جان نے ایک سانس میں ہی گلاس خالی کر دیا یوں جیسے پتا نہیں وہ کب سے پیاسی تھیں۔

"بی بی جان اور پانی دوں؟" گل جان نے پوچھا۔

مہر جان نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا...... دوبارہ لیٹ گئیں اور بڑے تھکے تھکے انداز میں جھٹ سے آنکھیں موند لیں لیکن جانے کس خیال کے تحت انہوں نے پٹ سے فوراً آنکھیں کھول دیں...... ساری سستی، نقاہت، نیند آناً فاناً کہیں ہوا میں اُڑ گئی۔ وہ بڑی تیز نظروں سے دیکھنے لگیں۔

گل جان ان کی نظروں کے تاثر سے گھبرا سی گئی تھی۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس وجہ سے نہیں کہ مہر جان اسے برا بھلا کہیں گی تو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس وجہ سے کہیں ان کا بی پی شوٹ نہ کر جائے۔ کہیں غصے کی شدت سے دوبارہ کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو جائیں مگر وہ کچھ بولی نہیں چپ چاپ مہر جان کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"وہ میرا موبائل کہاں ہے گل جان؟" گل جان نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر جیسے یاد آیا۔

"بی بی جان وہ تو آپ کے بیگ میں ہے۔"

"اور میرا بیگ کہاں ہے؟"
"وہ یہ رکھا......" گل جان نے ہاتھ کے اشارے سے دور رکھے ہوئے شولڈر بیگ کی طرف دیکھا۔
"دیکھو، اس میں میرا موبائل ہوگا۔"
"جی...... جی آپ کا موبائل اس میں ہے، مجھے پتا ہے مگر وہ آف ہے۔"
"تو آن کرو۔" مہر جان نے حکمیہ انداز میں کہا۔ گل جان جلدی سے آگے بڑھی، بیگ کھولا اور موبائل نکالا اور سوئچ آن کیا...... کمرے میں جیسے ہی ٹون گونجی...... مہر جان نے گل جان کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے کہہ رہی ہوں موبائل مجھے دو۔
گل جان نے موبائل انہیں تھما دیا۔ مہر جان نے موبائل پر نظر ڈالی یہ دیکھنے کے لیے کہ سگنل آرہے ہیں کہ نہیں...... لیکن جیسے ہی انہیں تسلی ہوئی کہ رابطہ ہوسکتا ہے۔ انہوں نے فوراً ہی ایک نمبر ڈائل کیا۔
"ہیلو......" وہ موبائل کان سے لگا کر جانے کس سے بات کر رہی تھی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوئی تھی۔
"ڈاکٹر مہر جان بات کر رہی ہوں لڑکی کا کچھ پتا چلا؟" جیسے ہی مہر جان کے منہ سے یہ جملے ادا ہوئے گل جان بے قراری کی کیفیت میں بلکہ اضطراری کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف سے جو جواب ملا تھا اس جواب کا تاثر مہر جان کے چہرے پر موجود تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔
"اچھا، لڑکی پولیس اسٹیشن میں ہے۔"
"ہاں کیونکہ میں کافی دن بے ہوش رہی اس لیے مجھے کسی نے بتایا نہیں بہرحال آپ کا بہت شکریہ...... میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ جی، جی ٹھیک ہے، بہت بہتر اگر آپ نے گھر اطلاع کردی تھی تو یقیناً اسے کوئی لینے پہنچ گیا ہوگا اگر نہیں پہنچا تو میں ابھی بھیجتی ہوں۔ بہت شکریہ، واسطی صاحب...... اسپتال سے ڈسچارج ہوکر میں آپ کو اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کروں گی اور میرے لائق جو بھی کام ہو آپ بلاتکلف کہیں...... بہت بہت شکریہ واسطی صاحب، بہت بہت شکریہ۔" مہر جان کے ایک، ایک لفظ میں اتنا جوش و خروش اور زندگی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ موت اور زندگی کی جنگ سے لڑ کر ستا رہی ہیں۔ موبائل بند کرکے انہوں نے گل جان کی طرف بڑی کاٹ دار نظروں سے دیکھا، ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔
"پرندے کے پر کٹ گئے... ہے ناں گل جان...... آگئی واپس...... اسے اپنی ماں کے اثر رسوخ کا شاید اندازہ نہیں تھا۔ underestimate کرگئی مجھے...... چلو خیر...... اسے ایک سبق تو ملا اب زندگی بھر کم سے کم ایک جگہ تو بیٹھے گی۔ اپنی اوقات پتا چلنے کے بعد آئندہ کبھی کوئی خطرہ مول نہیں لے گی۔ میں اصیل خان کو کہتی ہوں کہ وہ اسے لے کر سیدھا میرے پاس چلا آئے۔ میں اسے کچھ نہیں کہوں گی بس ایک منٹ کے لیے اس کی صورت دیکھوں گی اور اسے کہوں گی بس ایک بار ایک جملہ مجھ سے بول دے کہ ماں میں تم سے ہار گئی۔" یہ کہہ کر مہر جان موبائل پر گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ گل جان اپنی جگہ یوں کھڑی تھی جیسے فرشتہ اس کی روح قبض کرچکا ہو اور وہ صرف اور صرف ٹھنڈا وجود بن کر رہ گئی ہو۔ خاک کا ڈھیر...... مہر جان نمبر ڈائل کرچکی تھیں موبائل ان کے کان سے لگا تھا اور کہہ رہی تھی۔
"اصیل خان، رابی کو پولیس اسٹیشن سے جا کر لے آؤ لیکن اسے گھر لے کر مت جانا...... سیدھے میرے پاس لے آنا۔" مہر جان نے صرف اتنا کہا اور فون بند کردیا۔

☆☆☆

"وہ بیگم صاحبہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں، ان کا حکم ہے کہ آپ کو لے کر سیدھا اسپتال پہنچوں۔" اصیل خان سر جھکائے بہت ادب سے رابی سے مخاطب ہوا تھا۔ دور کھڑی لیڈی کانسٹیبل حیرت سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
ایک ملازم، ملازمہ سے کس انداز میں بات کر رہا تھا۔ البتہ رابی کے سپاٹ چہرے پر کسی قسم کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ جس سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے...... پریشان ہے یا فکرمند......
"میں اسپتال نہیں جاؤں گی اصیل خان...... تم مجھے گھر چھوڑ دو۔"
"نہیں رابی بی بی...... میں بیگم صاحبہ کے حکم کے خلاف نہیں جاسکتا۔ انہوں نے مجھے خود فون کیا ہے کہ آپ کو لے کر اسپتال پہنچوں۔ آپ کو اسپتال ہی جانا ہوگا۔"
"میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی اصیل خان کہ اماں اسپتال میں ایڈمٹ ہیں کہیں مجھے سامنے دیکھ کر انہیں پھر کچھ نہ ہوجائے۔ ابھی تم نے خود ہی تو بتایا ہے کہ موت اور زندگی کی جنگ لڑ کر فارغ ہوئی ہیں۔" اس مرتبہ رابی کے لہجے میں ہلکی ہلکی تلخی تھی۔
لیڈی کانسٹیبل بڑے اچنبھے کی کیفیت میں دیکھے جا رہی تھی۔
"بڑے میاں اس آوارہ کو یہاں سے لے جاؤ۔ اکیلی ہی پکڑی گئی ہے۔ جو اس کا یار تھا وہ ہاتھ نہیں لگا۔ اب روپیہ، پیسہ تو تمہارا سمجھو گیا بس لڑکی مل گئی۔ شکرانہ پڑھو، جاؤ اسے لے جاؤ یہاں سے۔ ہمارا ٹائم خراب نہیں کرو گھر جا کر باتیں کرلینا۔" لیڈی کانسٹیبل نے بڑے اکھڑپن سے اصیل خان کو مخاطب کیا تھا۔
"بہت بولتی ہے تو...... کسی دن یہ زبان تجھے مروا دے گی۔" رابی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر بولی۔ لیڈی کانسٹیبل نے رابی کے منہ سے جو یہ جملہ سنا تو اس کی تو آنکھیں گویا چھت سے لگ گئیں۔
"ارے پولیس والوں سے اس طرح بات کر رہی ہے اور وہ بھی پولیس اسٹیشن میں کھڑی ہوکر، اتنی ہمت تیری...... میں کہہ رہی ہو بڈھے اس کو یہاں سے لے جا...... اوپر سے آرڈر نہیں ہے ورنہ اس کی زبان نہیں دیکھتی۔ آوارہ...... بے حیا...... گھر سے بھاگی ہوئی بھگوڑی...... میرے سامنے زبان کھولتی ہے۔"
اصیل خان نے ایک دم دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے لیڈی کانسٹیبل کو بولنے سے روکا...... اس کے چہرے پر انتہائی کرب اور اذیت کی لکیریں کھنچ گئی تھیں پھر اس نے رابی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔
"رابی بی بی بس بات کو نہ بڑھائیں، جلدی سے چلیں یہاں سے۔" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔ رابی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ لیڈی کانسٹیبل نے ایک پاؤں زور سے دے کر زمین پر مارا۔
"سالی دو نمبر، ہم افسروں کے منہ لگتی ہے۔" رابی نے کس قیامت سے گزر کر اس کا یہ جملہ برداشت کیا تھا یہ وہی جانتی تھی۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن سے اسپتال تک کا راستہ رابی نے جس کیفیت میں طے کیا تھا اس کیفیت کو کوئی خاص نام نہیں دیا جاسکتا...... لیکن محسوس یہ ہوتا تھا جیسے وہ ایک دنیا کا سفر طے کرنے کے بعد دوسری دنیا کی حدود میں داخل ہوگئی ہو اور آگے پل صراط کا مرحلہ ہو...... اب جانے وہ کٹ کر ادھر اُدھر کب گرتی ہے یا اس پل کو پار کرکے کسی ایسی نئی دنیا میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں موت کا شعور نہ ہو اور زندگی سزا کی صورت مسلط ہوجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...... ایسی زندگی جس کے دوسرے کنارے پر موت کے بجائے پھر ایک نئی زندگی کھڑی ہو...... اور اس

زندگی کے بعد پھر ایک موت پھر زندگی در زندگی...... سزا در سزا...... محرومی در محرومی اور ایک لازوال خالی پن...... گاڑی بڑی اسپیڈ سے اسپتال کی طرف دوڑتی جارہی تھی۔

اصیل خان ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا...... رابی نے اپنے شل ہوتے ذہن کو بڑی مشکل سے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب موت راہِ نجات نہیں اور زندگی میں کوئی راہ فرار نہیں......

''اب زندگی سے کھیلوں گی اور جم کے کھیلوں گی...... ہار نہیں مانوں گی۔'' اس کی رگ رگ میں لہو کے بجائے ایک بے خوف عزم دوڑ رہا تھا۔ جس طرح اس نے موت کے احساس کو الوداع کہا تھا...... اسی طرح اس نے ہر قسم کے خوف کو بھی الوداع کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

گل جان کے دل کو جیسے پنکھے لگے ہوئے تھے خوف سے اس کا رواں رواں کھڑا ہوا تھا۔ رابی، اصیل خان کے ساتھ کسی بھی وقت پہنچ سکتی تھی۔ آنے والے وقت کا سوچ، سوچ کر ذہن ماؤف ہورہا تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ اندیشے بھی تھے کہ کہیں رابی پر نظر پڑتے ہی مہر جان کو پھر کچھ نہ ہوجائے۔ کہیں ایسا نہ ہو اس کے ذہن پر پھر کوئی شاک لگے اور بہت کچھ ہاتھ سے نکل جائے۔

مہر جان برابر گل جان کو دیکھے جارہی تھیں انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر گل جان کو پریشانی کیا ہے۔ وہ بیٹھتی کیوں نہیں ہے۔ اتنی بے قرار کیوں ہے۔

''گل جان تمہیں کیا مسئلہ ہے، بیٹھتی کیوں نہیں...... میں اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم مسلسل ٹہل رہی ہو۔'' آخر کار وہ بول ہی پڑیں۔

''بی بی جان مجھے تو بس آپ کا خیال ہے، اتنی بڑی تکلیف سے گزری ہیں آپ''۔ گل جان نے سہمی سہمی نظروں سے مہر جان کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ اس سے پیشتر کہ اس کا جملہ مکمل ہوتا۔ مہر جان نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''اس کے باوجود مری نہیں، زندہ ہوں...... بچ گئی......''

''بی بی جان یہ جو انتقام کی آگ ہوتی ہے ناں اس میں بھی بڑی قوت ہوتی ہے۔ بارود بھرا ہوتا ہے اس میں...... یہ انسان کو جینے نہیں دیتی۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی ضد پیدا کردیتی ہے۔''

''یعنی کہ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں اور مجھے اس انتقام کی آگ نے زندہ رکھا ہوا ہے۔''

مہر جان اس کی بات سن کر مسکرائیں۔

گل جان جواب میں خاموش رہی۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا...... دروازہ کھلنے کی آواز نے گل جان کی رہی سہی جان بھی نکال دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف دیکھا تو سامنے وہی حقیقت کھڑی تھی۔ جس کا سامنا ہونے کے احساس سے ہی اس کی روح فنا ہورہی تھی۔

اصیل خان، رابی کو لے کر اندر داخل ہورہا تھا۔ رابی چادر میں لپٹی ہوئی سر جھکائے اصیل خان کے پیچھے بہت آہستہ قدموں سے آرہی تھی۔

گل جان کا دل بیٹھ گیا...... اور اس نے خوفزدہ ہوکر مہر جان کی طرف دیکھا تھا۔

ڈاکٹر مہر جان کی نظریں رابی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔ آنکھوں میں

گویا انگارے دہک رہے تھے۔ کمرے میں ایک گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے سانسوں کا زیر و بم ماحول میں گونج رہا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی آواز نہ ہو...... رابی دروازے کے قریب ہی رک گئی تھی جبکہ اصیل خان ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔

مہر جان چند لمحے رابی کی طرف دیکھتی رہیں پھر اُن کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''آخر کار قدرت نے پھر تمہیں مجھ تک پہنچادیا۔ دنیا میں روز سیکڑوں لوگ خودکشی کرکے مرجاتے ہیں، تجھے مرنے کے لیے کہیں سے چٹکی بھر زہر بھی نہیں ملا۔ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے تو تیرا مرنا شرط ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مہر جان بیڈ سے نیچے اتر آئیں۔

''بی بی جان آپ کھڑی مت ہوں، بیٹھ جائیں۔'' گل جان جلدی سے آگے بڑھی تاکہ انہیں سہارا دے۔

مہر جان نے ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور آہستہ آہستہ رابی کی طرف بڑھی۔

اب اصیل خان نے بھی بہت خوفزدہ ہوکر مہر جان کی طرف دیکھا تھا اور وہ صرف رابی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ رابی کا سر اسی طرح جھکا ہوا تھا۔ مہر جان آگے بڑھیں انہوں نے رابی کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوا اور اس کا چہرہ اونچا کیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''کیا پوچھ رہی ہو میں تجھ سے...... اتنا کچھ لے کر بھاگی تھی۔ دو روپے کا زہر نہیں خرید سکی کہیں سے...... کیوں واپس آگئی۔ مجھے تو تیری لاش بھی مل جاتی تب بھی سکون مل جاتا...... اب جو میں تیرے ساتھ کروں گی تجھے اس کا اندازہ نہیں ہے۔'' رابی نے آہستگی سے پلکیں اٹھائیں اور مہر جان کی طرف دیکھا پھر بہت اطمینان سے ان کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''اماں جان میں روز مرنے کے لیے آگئی ہوں...... لیکن سہراب خان کے گھر نہیں جاؤں گی۔''

''تجھے سہراب خان کے گھر میں ہی آباد ہونا ہے۔ ہاں اگر تجھے سہراب خان پسند نہ آئے تو اس کے گھر میں خودکشی کرکے مرجانا...... لیکن اب میری انا کا سوال ہے، میں نے سہراب خان کو بیٹی دینے کی حامی بھری ہے۔ بیٹی تو میں اسے دے کر رہوں گی۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے مجھے ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔'' مہر جان نے یہ سنا اور جیسے ان کے اندر قیامت برپا ہوگئی۔

''اماں جان آپ کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے آپ میری ڈیڈ باڈی ضرور دیکھیں...... لیکن یہ ڈیڈ باڈی آپ اپنے گھر میں ہی دیکھ سکیں گی...... پھر بھی آپ کی تسلی اور اطلاع کے لیے اتنا کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں بزدل نہیں ہوں آپ سے پہلے مرنا نہیں چاہتی۔'' رابی نے پھر مہر جان کی طرف دیکھا اور بہت اطمینان سے مسکرائی۔

گل جان ایک دم آگے بڑھی اور دونوں کے درمیان آکے کھڑی ہوگئی پھر دونوں ہاتھوں سے اس نے رابی کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور آنسو بھری آواز میں گویا ہوئی۔

''بی بی جان، بچی ہے یہ چھوڑ دیں اسے۔ آپ کے پاس اختیار ہے، طاقت ہے، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ آپ خود کو سنبھالیں۔''

مہر جان نے دونوں ہاتھوں سے بہن کو ایک طرف دھکیل دیا، ان کی نظریں ابھی تک رابی پر جمی ہوئی تھیں۔

''زبان چلاتی ہے، سوال جواب کرتی ہے، حکم ماننے سے انکار کرتی ہے۔ میں نے تجھے بہت برداشت کرلیا رابی۔''

"اماں جان اگر آپ صرف نام کی ماں ہیں تو سن لیجیے میں نے بھی آپ کو بہت برداشت کرلیا۔"

اتنا سننا تھا کہ مہر جان چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں اور تابڑ توڑ رابی کے چہرے پر طمانچے مارنے شروع کردیے۔

اصیل خان اور گل جان آگے بڑھ کر مہر جان کو رابی سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگے...... لیکن جنون میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پہلوان مقابلہ نہیں کرسکتے۔ مہر جان نے اسی جنونی کیفیت میں دونوں کو ایک ہی جھٹکے سے اِدھر اُدھر کردیا تھا...... اور پھر رابی کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کردیے تھے۔

"احسان فراموش، کہیں بھیک مانگ رہی ہوتی، میں نے تجھے اپنی عزت کے لیے عزت دی۔ اصیل خان بتادو اسے کہ یہ میری بیٹی نہیں ہے، کچرے سے اٹھا کر لائی تھی میں اسے۔" اتنا کہہ کر مہر جان کو جیسے چکر آنے لگے، انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور اِدھر اُدھر ڈولنے لگیں۔

"بی بی جان...... بی بی جان دیکھیں میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ رابی کو یہاں نہ آنے دیں، خدانخواستہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوسکتی ہے۔" وہ بڑی مشکل سے مہر جان کو کھینچتی ہوئی بیڈ تک لے جارہی تھی۔

اصیل خان نے رابی کو اشارے سے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا وہ اپنی چادر درست کرتے ہوئے اور اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں اور رابی کو گھر پہنچا دیتا ہوں، باقی جیسے آپ کہیں......" اصیل خان نے گل جان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں، ہاں اسے پہلی فرصت میں یہاں سے لے جاؤ، خدا کے لیے لے جاؤ اسے یہاں سے...... میری بہن مرجائے گی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اصیل خان خاموشی سے کمرے سے نکلا اور گل جان، بی بی جان کے چہرے کو چھو چھو کر آواز دینے لگی۔

"بی بی جان...... بی بی جان...... بی بی جان آپ میری آواز سن رہی ہیں، خدا کے لیے بولیں، بی بی جان ہم اپنی سزا پر راضی ہیں اگر آپ نہ رہیں تو سزا ادھوری رہے گی پھر ہمارا کیا بنے گا۔ ہم تو روز اپنا بویا ہوا کاٹتے ہیں، اسی لیے زندہ ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اس دنیا کو چھوڑنے سے پہلے دھل کر پاک ہوجائیں، بی بی جان خدا کے لیے کچھ تو بولیں۔" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

مہر جان ہوش و حواس سے بیگانہ ہوچکی تھیں۔

☆☆☆

"کائناز تم سمجھنے کی کوشش کرو، تمہیں پتا ہے ناں آج کل کیا حالات ہیں، گھر کا ماحول کیا ہو رہا ہے۔ اماں جان اسپتال میں ہیں، میں کیسے ٹیوشن لینے آسکتی ہوں۔" وہ کائناز سے کہہ رہی تھی۔

"لیکن اگر تم اسپتال جاؤ تو اپنی اماں جان سے اجازت لے لینا، دیکھو اب وہ حالات بھی نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ رابی آپا کے جانے کے بعد اماں تمہارے ساتھ بہت زیادہ سختی نہیں کریں گی۔"

"لیکن اگر انہیں سنتے ہی غصہ آگیا اور ان کی طبیعت خراب ہوگئی تو مجھے بہت گلٹی فیل ہوگا۔ وہ تو شروع ہی سے کہتی ہیں کہ ٹیوشن پڑھنے والے بچے dependened ہوجاتے ہیں۔ کوئی اچھی پروگریس نہیں آتی۔ انہیں سہارے کی عادت پڑجاتی ہے۔"

"لیکن تم انہیں سمجھانے کی کوشش کرو کہ آج کل کالجز میں اس طرح سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ جیسے پہلے

زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ اب ٹیچرز اپنے اسٹوڈنٹ کو ایکسٹرا ٹائم نہیں دیتے۔ ہمارے یہاں تو نہیں دیتے شاید کہیں اور دیتے ہوں۔" کائناز اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کررہی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں جان کا موڈ دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر تم سے وعدہ نہیں کررہی۔"

"روما ایسے نہ کہو، سچ مجھے اکیلے پڑھنے میں مزہ نہیں آرہا۔ میں نے تو ان سے تمہاری بات بھی کرلی ہے۔" کائناز نے ایک دفعہ پھر بتایا۔

"میری بات...... میری کیا بات کرلی تم نے؟" روما حیرانی سے پوچھنے لگی۔

"بھئی یہی کہ میری ایک دوست بھی آپ سے ٹیوشن پڑھے گی، آپ اپنا ذہن بنالیں کہ آپ ایک کو نہیں دو کو ٹیوشن دیں گے۔" روما نے یہ سن کر ایک گہری سانس لی۔

"بھئی میں تو ہر وقت ہر کام تمہارے ساتھ کرنا چاہتی ہوں لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس سلسلے میں اماں جان کی پرمیشن کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں ویٹ کرنا ہوگا۔ اماں جان گھر آجائیں تو بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ فی الحال تو تم اکیلے ہی پڑھو۔" اسی وقت گھر میں گاڑی کے تیز ہارن کی آواز گونجی تھی۔ روما چونک پڑی۔

"کائناز مجھے لگتا ہے کہ شاید اماں ڈسچارج ہوکر آگئی ہیں۔ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی ہے۔ میں ذرا دیکھتی ہوں بعد میں تم سے بات کروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ ریسیور رکھ کر وہ دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی...... لیکن لاؤنج سے باہر آتے ہی جیسے نظر پورچ میں کھڑی کار پر پڑی۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا کیونکہ کار کے پچھلے دروازے سے رابی باہر آرہی تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ پتھر کا بت بنی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ رابی نے کار کا دروازہ بند کرتے ہی روما کی طرف دیکھا تھا۔ روما کی کیفیت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ اصیل خان پہلے ہی اتر کر اپنی جگہ مستعد کھڑا تھا۔

رابی آگے بڑھی۔

"نذیر محمد تم آرام کرو، تھوڑی دیر بعد واپس اسپتال جانا ہے۔" اصیل خان نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ رابی نے آگے بڑھتے ہوئے اصیل خان کا یہ جملہ سنا اور روما کی طرف دیکھنے لگی۔

روما کو جیسے جنبش کرنا محال تھا حیرت کا کوئی پہاڑ تھا جو اس پر ٹوٹا تھا۔ رابی نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو، اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو، اماں جان کو گھر آجانے دو پھر تمہیں بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ کتنا حیران ہوگی، لوگوں کو بیماری سے حادثے سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حیرت سے مرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ لہٰذا اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں زندہ رہنے کے لیے بے حسی کی ضرورت ہے، حیرانی کی نہیں......" یہ کہہ کر رابی بڑے اعتماد سے اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

روما جو اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ چیخیں مار مار کر رونا چاہتی تھی۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرسکی۔

☆☆☆

فائزہ نے بڑے جتن کرکے آخر کار ماں سے شبینہ کے گھر جانے کی اجازت لے ہی لی۔ پتا نہیں کیوں شروع ہی سے شائستہ بیگم کو فائزہ اور شبینہ کی یہ دوستی کچھ بھائی نہیں تھی۔ انہیں دبی دبی مسکین چہرے والی شبینہ پتا نہیں کیوں کھٹکتی تھی۔ بلکہ وہ حیران ہوتیں کہ فائزہ کو آخر اس میں ایسی کیا بات نظر آئی ہے جو اس کے پیچھے دیوانی

ہوئی جاتی ہے۔ اسٹیٹس کا بھی فرق تھا...... ماحول کا بھی...... پہننے اوڑھنے کا بھی...... دور دور تک کسی چیز میں بھی مماثلت یا مشابہت نہیں تھی۔ انہوں نے بیٹی کی خوشی کی خاطر اسے جانے کی اجازت دے تو دی تھی مگر ساتھ ہی شرط لگائی تھی کہ وہ اکیلی نہیں جائے گی۔ بھائی کے ساتھ جائے گی۔

فائزہ خوشی خوشی تیار ہونے چلی گئی تھی۔

شائستہ بیگم کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان کی بیٹی سے زیادہ تو ان کے بیٹے کو شبینہ کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ احمر لاؤنج میں بیٹھا بہن کا انتظار کر رہا تھا جبھی شائستہ بیگم نے آ کر اسے خاص تاکید کی۔

''دیکھو بیٹا یہ تو بالکل پاگل ہے، کسی دوست کے ساتھ بیٹھ جائے تو اٹھنے کا دل نہیں چاہتا...... مگر تم دیر نہ کرنا، جلدی آ جانا۔''

''جی امی، اب یہ اس پر ہے آپ اس کو بھی تاکید کر دیں۔'' فائزہ نے برا سا منہ بنا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''اتنے دنوں کے بعد اپنی دوست کے گھر جا رہی ہوں، کیا تھوڑی دیر اس کے ساتھ باتیں بھی نہیں کروں۔''

''ہاں، ہاں باتیں ضرور کرنا مگر بھائی کو ڈرائیور سمجھ کر انتظار نہ کروانا۔''

''ہاں تمہیں دیر ہوئی تو تم بس سے آتی رہنا۔'' احمر نے ہی گویا دھمکی دی۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے، اب ظاہر ہے یہ تو اندر بیٹھنے سے رہا۔ کتنی دیر باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کرے گا۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ بیٹھنا۔ ویسے بھی اچھا خاصا فاصلہ ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ممی، جیسے ہی پندرہ منٹ پورے ہوں گے میں ہارن پر ہارن بجانا شروع کر دوں گا۔'' احمر نے فائزہ کی طرف شریر مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں اگر بہت زیادہ ہارن بجا دیے ناں تو شبینہ کے ابو لاک اپ میں بند کر دیں گے۔ پتا ہے ناں پولیس والے ہیں۔''

''اتنا ڈراؤ گی تو میں نہیں لے کر جا رہا، اکیلی چلی جاؤ۔'' احمر نے اس کو جیسے دھمکی دی تھی۔

''ارے بیٹا کیوں بحث میں الجھ کر ٹائم ضائع کر رہے ہو، اب جلدی جاؤ تاکہ جلدی واپس آ جاؤ۔'' فائزہ اور احمر لاؤنج سے باہر جانے لگے تو شائستہ بیگم سوچنے لگیں۔

''یہ پولیس والے کی بیٹی، شکل سے تو کسی غریب مسکین آدمی کی بیٹی لگتی ہے، پتا نہیں اس لڑکی کو اس میں کیا دکھائی دیا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

جابر علی حسبِ معمول بہت آف موڈ میں گھر میں داخل ہوا تھا اور آتے ہی بیوی کو آواز دی تھی۔

''ارے بھئی کہاں ہو، ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔'' اس نے سر سے کیپ اتار کر بستر پر اچھال دی اور خود ایک کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور...... فرض شناس بیوی صابرہ ذرا سی بھی تاخیر کیے بغیر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر حاضر ہو گئی تھی۔

جابر علی نے جوتے اتارے اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ بھرا لیکن گھونٹ بھرتے ہی اپنے بائیں جانب کلی کر دی اور گلاس کا سارا پانی ایک طرف اچھال دیا۔

''دوزخ کا پانی نہیں مانگا تھا، ٹھنڈا پانی مانگا تھا۔'' صابرہ کو گھورتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''وہ...... پانی تو ٹھنڈا ہی تھا۔''

''یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں تو جیسے دیکھتے ہی دیکھتے خون اتر آیا۔ صابرہ ایک

دم سہم سی گئی۔

''میں پانی میں برف ڈال کر دیتی ہوں، فریج سے ہی لے کر آئی تھی۔''

''ہاں فریج سے لے کر آئی تھی تو ابھی کسی نے بھر کے رکھا ہوگا وہی اٹھا کر لے آئی۔ یہ تو خیال ہی نہیں ہوگا کہ دیکھ لوں کہ ٹھنڈا بھی ہے یا نہیں۔ سر سے بلا اتارتی ہے۔ پتا نہیں کس دل سے کام کرتی ہے۔ زور نہیں چلتا ورنہ بیٹے کی طرح آج ہی گھر سے چلی جائے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر...... وہ تو اللہ نے کھونٹا کمزور کیا ہوا ہے، آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ مجبوری میں بیٹھی ہے اس گھر میں۔''

صابرہ کے دل پر ایک قیامت سی بیت گئی لیکن صبر اور برداشت کے مرحلے اسے شاید آخری سانس تک طے کرنا ہی تھے۔ چپ چاپ ٹھنڈا پانی لینے چلی گئی اور بہت احتیاط سے دیکھ بھال کر ٹھنڈا پانی لے کر آئی پھر جابر علی کو گلاس تھما دیا۔ اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا اور اس انداز میں گلاس واپس کیا کہ اگر صابرہ تھام نہ لیتی تو زمین پر گر کر چور چور ہو جاتا۔ گلاس لے کر جیسے ہی وہ جانے لگی جابر علی نے پیچھے سے پکارا۔

''کہاں جا رہی ہو ایک منٹ اِدھر بیٹھو میری بات سن لو۔''

صابرہ خالی گلاس گود میں رکھ کر اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی...... کچھ بولنے کے بجائے صرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''ایک دو روز میں نیا چاند ہو جائے گا، میرے خیال میں بارہ تاریخ ٹھیک ہے، وہ تو اگلے ہی ہفتے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن میں نے کہا بھئی مجھے اپنے دفتر سے قرضہ ورضہ بھی لینا ہوگا، ہفتہ دس دن تو لگ جاتے ہیں تو اس لیے میں نے دو چار دن تاریخ آگے کر دی ہے۔'' صابرہ نے بڑی مشکل سے جیسے تھوک نگلا تھا۔ یوں جیسے حلق میں کچھ پھنس گیا تھا۔

''بارہ تاریخ...... بارہ تاریخ تو بس پاس ہی کھڑی ہے، ان دو چار دنوں میں شادی کی تیاری کیسے ہوگی؟''

''ہمیں کوئی تیاری ویاری نہیں کرنی۔'' جابر علی نے صابرہ کی بات کاٹ کر کہا۔

''رات کو تمہیں کپڑے، زیور وغیرہ دے دیے ہیں اسی میں سے جو پہننے کے لیے سلوانا چاہتی ہو سلوا لو، خود سینا چاہتی ہو تو سی لو، ہمیں کوئی خریداری وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے سختی سے منع کر دیا ہے۔''

''لیکن خالی ہاتھ بیٹی کو رخصت کرنا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ انہوں نے جو کہا وہ ٹھیک ہے لیکن ہمیں خود بھی تو کچھ سوچنا چاہیے۔'' صابرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہہ دیا۔

''ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے سوچنے وچنے کی...... جو سوچنا تھا سوچ لیا۔ اب خالی ہاتھ یا بھرا ہاتھ...... بس شادی تو ہو رہی ہے۔ مجھے یہ دوغلا پن پسند نہیں ہے، دل میں کچھ زبان پر کچھ...... کل کلاں کو کچھ کہیں گے تو کہہ دیں گے کہ بھئی تم نے تو خود ہی منع کیا تھا۔ ہمارا کیا قصور ہے، دے دیتے ہمیں مہینہ دو مہینہ شادی کے لیے، کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے۔''

''تو آخر اتنی جلدی کیا ہے؟'' صابرہ نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

''بھئی ہم کون ہوتے ہیں اُن سے پوچھنے والے کہ اتنی جلدی کیوں ہے، پتا نہیں ان کی کیا مجبوری ہو، کیوں جلدی میں شادی کرنا چاہ رہے ہوں۔'' جابر علی نے جیسے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اگر اُن کی کوئی مجبوری ہے تو ہماری بھی تو کوئی مجبوری ہو سکتی ہے۔ آپ انہیں کہہ دیں کہ ہمیں بھی تو ایک مہینہ دیں۔'' صابرہ نے بڑی ہمت کر کے بات کی۔

"بھئی میں کیوں کہوں...... مجھے اتنی فالتو باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔ شادی پندرہ دن بعد بھی ہونی ہے اور ایک مہینے بعد بھی ہونی ہے۔ ایک مہینہ ہمیں مل جائے گا تو کیا ہم دو چار کروڑ روپے کی زمین اس کو دے دیں گے۔ آج ہے ہمارے پاس وہی ایک مہینے بعد ہوگا، فضول میں ٹائم برباد کرنا۔" بات کرتے کرتے وہ دھیما ہوا تھا۔

"پچاس ہزار کالون میں نے اپلائی کیا ہے، ستارہ کے ہاتھ پر یہ پچاس ہزار کیش رکھ دینا جو مرضی اپنی پسند سے لے لے۔ سمجھو یہی ہماری طرف سے جہیز ہے اور ہاں ستارہ کو بتا دینا کہ بارہ تاریخ کو اس کا نکاح ہے۔"

صابرہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی وہ بڑی بے بسی سے جابر علی کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ ستارہ کو بتا دو اس کا بارہ تاریخ کو نکاح ہے۔

"لیکن میں جابر علی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی کہ وہ خود ہی بیٹی کو بتا دے کہ بارہ تاریخ کو اس کا نکاح ہو رہا ہے۔ اپنی عمر سے دُگنے آدمی کے ساتھ۔" جابر علی کو ستارہ کے سامنے کھڑا کرنا ایسا ہی تھا جیسے جلتی ہوئی پر تیل ڈالنا...... ہمت تو اسے ہی کرنا تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنے اوسان سنبھالنے کی کوشش کی اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ جابر علی پاؤں سے جرابیں کھینچتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"گھر میں عورت ڈھنگ کی نہ ہو تو سمجھو خانہ بس خراب...... یہی رہ گئی تھی میری قسمت میں۔" وہ بڑبڑانے لگا۔

صابرہ کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی تھی کیونکہ یہ پچیس برسوں کی خدمت کا بہت بڑا انعام تھا۔

☆☆☆

روما، اصیل خان کو ڈھونڈتی ہوئی لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اسے پکا یقین تھا کہ وہ اسے یہیں ملے گا...... اور ہوا بھی ایسا ہی...... اصیل خان سر پر ٹوپی لگائے پنج سورہ ہاتھ میں پکڑے تلاوت کر رہا تھا۔ روما فاصلے پر کھڑی الجھی، الجھی سی اس کی طرف دیکھتی رہی کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے وہ اس سے بات کرے یا نہ کرے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ اصیل خان نے اپنی تلاوت مکمل کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ روما کو اطمینان ہوا کہ چند لمحوں بعد اب اس سے بات کر سکتی ہے۔ اصیل خان نے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا تو روما تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے قریب گئی۔

"وہ بابا اصیل خان مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی...... رابی آپا تو دروازہ ہی نہیں کھول رہیں، میں ان سے باتیں کرنا چاہتی ہوں، پوچھنا چاہتی ہوں، وہ کہاں چلی گئی تھیں، کہاں سے آئی ہیں، وہ تو آپ کے ساتھ آئی تھیں آپ کو پتا ہے کہ وہ کہاں تھیں؟"

"بیٹا آپ پریشان مت ہوں جو کچھ بھی ہے میرا مطلب ہے جو کچھ بھی ہوا کہاں تھیں، کہاں سے آئی ہیں سب آپ کو پتا چل جائے گا، ابھی وہ آرام کر رہی ہیں، انہیں آرام کرنے دیں، ہو سکتا ہے وہ تھکی ہوئی ہوں اور وہ سو گئی ہوں۔" اصیل خان نے ایک گہری سانس لے کر اپنی دکھ کی کیفیت چھپاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بڑی شفقت سے مسکرایا۔

"لیکن آپ تو مجھے بتا دیں ناں، آپ آپا کو کہاں سے لے کر آئے ہیں؟" اصیل خان، روما کے سوال پر دم بخود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

"آپ کو سب پتا چل جائے گا، گھر کی بات ہے گھر والوں سے کیسے چھپ سکتی ہے۔ مجھے زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں ہے بیٹا۔ آپ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا ہے رابی بٹیا سے معلوم کریں یا اپنی اماں جان سے۔ میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتا مجھے معاف کر دیں۔" یہ سن کر روما جیسے کسی سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا تو یہی بتا دیں کہ اماں گھر کب آئیں گی؟ آپ اسپتال گئے تھے ناں، ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں۔" کچھ دیر بعد اس نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے بیٹا وہ جلدی آ جائیں گی، اللہ کا شکر ہے اب وہ بہت بہتر ہیں، چل پھر سکتی ہیں۔"

"آپ کی اماں جان سے بات ہوئی تھی بابا؟" روما بڑی سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

"جی روما بی بی...... ڈاکٹر صاحبہ سے میری بات ہوئی تھی۔ جبھی میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہ ماشاء اللہ پہلے سے بہت بہتر ہیں۔" اصیل خان نظریں جھکائے جھکائے بولا تھا۔

"لیکن آپ اماں جان کو کیسے بتائیں گے کہ رابی آپا گھر آ گئی ہیں، ویسے اماں جان کو بتا تو دینا چاہیے تھا کیونکہ آپا کی وجہ سے ہی تو اماں جان اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی ہیں، ہو سکتا ہے کہ جب ان کو پتا چلے کہ آپا گھر میں ہیں تو وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔" بولتے بولتے روما کے چہرے پر خوف کے تاثرات بہت نمایاں ہو گئے۔ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور سہمی سہمی نظروں سے اصیل خان کی طرف دیکھنے لگی۔

اصیل خان زمین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اسے روما کے تاثرات اچانک بات کرتے کرتے بدل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ تو خود شاید کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

"اماں جان گھر آ گئیں تو پھر ایک بڑی قیامت آئے گی، ہے ناں......؟ وہ رابی آپا کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ویسے آپ کے خیال میں وہ آپا کے ساتھ کیا کر سکتی ہیں، انہیں ماریں گی...... اس سے زیادہ کیا کریں گی۔" روما خود کلامی کے انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ اصیل خان کا جھکتا سر مزید جھکتا چلا جا رہا تھا۔ روما کی باتوں کے جواب میں اس کے پاس ایک بات نہ تھی۔

"بابا مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہم لوگوں کی بھی کیا زندگی ہے، آخر ہم لوگ مر کیوں نہیں جاتے۔ اتنے سارے لوگ روزانہ مرتے ہیں، ہم کیوں زندہ ہیں، ہمارے زندہ رہنے کا کوئی فائدہ تو نہیں۔" بولتے بولتے روما کی آواز آنسوؤں کی دھند میں گم ہونے لگی۔

اصیل خان نے ایک دم تڑپ کر نظریں اٹھائی تھیں اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وہ سب کچھ روما سے نہیں کہا جا سکتا تھا بس تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار اپنا لرزتا ہاتھ روما کے سر پر رکھ دیا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا...... گناہ ملتا ہے اللہ سے کبھی موت نہیں مانگتے، اس لیے کہ ہم موت نہ بھی مانگیں وہ تو تب بھی ہمیں مل ہی جائے گی تو ہم اپنی دعا میں وہ کیوں نہ مانگیں جو ہمیں ہماری زندگی میں موت سے پہلے ہی مل سکتا ہے۔"

روما کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر مایوسی کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔

"چھوڑ دیں اصیل بابا...... وہ کوئی اور ہوتے ہوں گے جنہیں بن مانگے بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ہم تو سو سال بھی جئیں گے تو ایسے ہی رہیں گے۔ اماں جان گھر آ جائیں گی تو پھر دیکھیے گا کیا کچھ نہیں ہوگا اس گھر میں...... مگر ایسا پھر بھی کچھ نہیں ہوگا کہ سب کے سب ایک ساتھ مر ہی جائیں۔" وہ روتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی...... اور اصیل خان اپنی جگہ یوں کھڑا تھا جیسے اس کے قدموں تلے زمین شق ہو گئی ہو اور وہ پاتال میں گرتا جا رہا ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان گل جان کے ساتھ گھر آ چکی تھیں۔ اسپتال میں تمام جونیئر اور سینئر ڈاکٹرز نے پوری کوشش

جمعۃ الوداع اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو سمیٹنے کا دن

رمضان المبارک کو جس طرح بقیہ گیارہ مہینوں پر عظمت عطا فرمائی گئی ہے، اس طرح جمعۃ الوداع کو بھی دوسرے جمعوں سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ جسے ہمارے رسول مقبولﷺ نے مسلمانوں کے لیے عید کا دن قرار دیا ہے۔ کریمﷺ کا فرمان ہے کہ جمعے کے دن ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ اس لمحے انسان جو بھی دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے پوری فرما دیتے ہیں۔ جمعۃ المبارک کی قرآن وحدیث میں بہت زیادہ فضیلت واہمیت بیان ہوئی ہے۔ جمعۃ الوداع کو دیگر ایام سے اس لحاظ سے انفرادیت حاصل ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں کو عید الفطر کی شکل میں ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔ جمعۃ الوداع اس لحاظ سے بھی بڑا اہم ہے کہ یہ جمعہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں آتا ہے، حضورﷺ کی حدیث کے مطابق جہنم سے آزادی کا عشرہ قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو رمضان المبارک کے اختتام پر دنوں کا سردار میسر آجاتا ہے، جس میں خصوصی اہتمام سے انسان اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اللہ سے جہنم سے ہونے کا سوال کرتا ہے۔ جمعۃ الوداع کو باقی جمعوں کی نسبت یہ بھی انفرادیت حاصل ہے کہ اس دن مساجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی بلکہ نمازیوں کے لیے کیے گئے وافر انتظامات بھی کم پڑ جاتے ہیں اور ایسے ایسے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں جنہیں سال بعد جمعۃ الوداع کے دن ہی دیکھا جاتا ہے۔ جمعۃ الوداع کی ادائیگی کے دوران مسلمان دو بڑی خوشیاں محسوس کرتے ہیں۔ آج رحمتوں، برکتوں اور فضیلتوں والے مہینے کے اختتام پر اور عید الفطر سے قبل انہیں ایک عید میسر آرہی ہوتی ہے۔ یہ دن ماہِ رمضان المبارک کے جدائی کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو سمیٹنے کا دن ہے ہر مسلمان کو ان آخری گھڑیوں کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے تاکہ اپنے گناہوں کی بخشش کی راہ ہموار ہو۔ کیا معلوم کہ آئندہ یہ رحمتوں کا مہینہ اور جمعۃ الوداع کا دن دیکھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں رمضان المبارک کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے اور رمضان المبارک کے اس جمعۃ الوداع کے موقع پر پچھلے سالوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر معافی مانگنے کی توفیق دے...... آمین یارب العالمین .... مرسلہ: حنا مشتاق، حیدرآباد

کی تھی کہ ڈاکٹر مہرجان کو ابھی ڈسچارج نہ کریں لیکن کیونکہ وہ سینئر موسٹ تھیں، وہ ایک حد سے زیادہ انہیں اصرار نہیں کر سکتے اور مہرجان اسپتال میں کیسے رک سکتی تھیں جبکہ رابی گھر پہنچ چکی تھی۔ انہیں تو پتا نہیں کون کون سے ادھار چکانے کی جلدی تھی۔ ایک قیامت تھی جو رگ رگ میں برپا تھی...... گل جان سارے راستے لرزتی کانپتی رہی تھی۔ کبھی ایک خیال آتا تھا کبھی دوسرا...... سوچ ایک جگہ پر آکر رک جاتی تھی کہ آخر اب رابی کا بنے گا کیا... رابی کا اگر کچھ بنا یا نہ بنا لیکن مہرجان کا کیا ہوگا...... کہیں دوبارہ انہیں ایسا شاک نہ لگے، ایسی بات نہ ہوجائے اس سے آگے سوچ کر اس کا ذہن جواب دے جاتا تھا۔ جانے کس طرح سے اسپتال سے گھر تک راستہ طے ہوا۔ وہ گھر پہنچ کر مہرجان کو شیشے کے سامان کی طرح سنبھالتی آگے بڑھی تو مہرجان نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس سے چھڑا لیا۔

"میں اپنے پیروں پر چل سکتی ہوں اور دیکھو جب تک میں نہ بلاؤں، کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔" یہ کہہ کر مہرجان نے اپنے سر کو یوں تھاما جیسے انہیں چکر آرہے ہوں لیکن ساتھ ہی انہوں نے پوری کوشش سے اپنے آپ سنبھالا بھی...... گل جان اپنی جگہ پتھر بنی کھڑی رہ گئی۔ مہرجان بغیر سہارے کے تیزی سے اندر داخل ہوگئیں۔ ان کے غائب ہوتے ہی گل جان نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور بڑے صدقِ دل سے دعا کی۔

"یا اللہ تو ہمیں معاف کردے، رحم کردے، میری بی بی جان پر......"

☆☆☆

شبینہ بے یقینی اور خوشی کی کیفیت میں فائزہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"فائزہ تم......؟ مجھے یقین نہیں آرہا......"

"لو پہلے بھی تو آچکی ہوں تو اتنی بے یقینی کی آخر ضرورت کیا ہے، تم تو جیسے کالج والج سب بھول گئی ہو، کیا مسئلہ ہے کیوں اتنی چھٹیاں کر رہی ہو؟"

فائزہ کی آواز سن کر صابرہ بھی اپنے کام چھوڑ کر باہر آگئی تھی۔ فائزہ نے جیسے ہی صابرہ کو دیکھا تو فوراً سلام کیا۔ صابرہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے سلام کا جواب دیا۔

"بیٹے! اکیلی آئی ہو؟"

"نہیں آنٹی اکیلے آنا تو allowed ہی نہیں ہے، امی کہتی ہیں کہ آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ گھر

سے نکلنا ہی نہیں چاہیے۔" صابرہ کو یہ جملہ سن کر عجیب سا احساس ہوا کہ کاش فائزہ کی ماں بہت زور دے کر یہ بات کرتی اور اپنی بیٹی کو روک لیتی...... کیونکہ جو اس وقت اُن کے گھر کا ماحول ہو رہا تھا اس میں کسی مہمان کی آمد کی گنجائش نہیں تھی اب اسے اپنا بھرم...... اپنی بچی کا بھرم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ اس نے بہت محبت اور شفقت بھرے لہجے میں فائزہ کو مخاطب کیا۔

"بیٹا آپ بیٹھو میں آپ کے لیے کچھ ٹھنڈا بنا کر لاتی ہوں۔"

"آنٹی پلیز کوئی تکلف نہیں کریں، میں بہت جلدی میں ہوں، بس اس شبینہ کی بچی نے تو مجھے پریشان کردیا۔ کالج سے چھٹیاں کیے جارہی ہے حالانکہ میں نے فون کیا تھا لیکن شاید شبینہ کے ابو نے فون اٹھایا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ شبینہ سو رہی ہے۔ بس پتا نہیں کیوں اس کے بعد میری ہمت ہی نہیں پڑی۔ میں نے سوچا میں گھر جاکر ہی پتا کرتی ہوں کہ یہ کر کیا رہی ہے۔"

صابرہ اور شبینہ نے بے اختیار لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بڑی بے بسی سے نظریں جھکا لی تھیں۔

"اچھا...... بیٹھو تو سہی، تھوڑا بہت چائے پانی تو چلے گا ناں......"

"آنٹی میں بالکل بھی تکلف نہیں کر رہی ہوں، باہر بھائی گاڑی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں، میں تو بس کھڑے کھڑے شبینہ سے ملنے آئی تھی، اسے دیکھنے آئی تھی۔ اب دیکھ تو لیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے خیریت سے ہے، بس یہ پتا کرنا ہے کہ کالج کی چھٹیاں کس حساب میں ہو رہی ہیں۔"

شبینہ نے پھر بے اختیار ماں کی طرف دیکھا تھا۔ صابرہ نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی۔

"وہ دراصل گھر میں بہت سارے کام چھڑے ہوئے ہیں۔ میں اکیلی تھک جاتی ہوں تو اس وجہ سے اس کی چھٹیاں ہوگئیں اور بیٹا بھائی کو باہر کیوں کھڑا کیا ہوا ہے۔ اُن کو بلاؤ اور ادھر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

"نہیں ٹھیک ہے آنٹی...... وہ تو اے سی چلا کر آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انتظار کرلیں گے میرا دس پندرہ منٹ......"

"لیکن پھر بھی بیٹا برا لگتا ہے۔" صابرہ نے تکلفات نبھانے کی کوشش کی حالانکہ جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ جابر علی نماز پڑھنے مسجد تک گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ بعد اس نے آہی جانا تھا اسے تو اپنی بیٹیوں کی لڑکیوں کے ساتھ دوستی پر بھی اعتراض تھا اور فائزہ تو اپنا بھائی لے کر آگئی تھی۔ صابرہ سوچ، سوچ کر

پریشان ہو رہی تھی کہ یہ دونوں بہن بھائی تو چلے جائیں گے اور گھر میں ایک نئی بحث شروع ہو جائے گی۔ ابھی وہ اسے بارہ تاریخ کا مژدہ سنا کر گیا تھا...... اب شبینہ کو بھی آخر کار تکلف سے زور دے کر کہنا ہی پڑا۔

''فائزہ اتنی دیر سے کھڑی ہو کر باتیں کر رہی ہو پلیز بیٹھ جاؤ ناں۔''

''ہاں بیٹا بھائی اندر نہیں آ رہا تو کوئی بات نہیں، تم تو بیٹھو، میں تمہارے لیے شربت بنا کر لاتی ہوں۔'' کہہ کر صابرہ وہاں سے چلی گئی۔

فائزہ، شبینہ کے ساتھ قریب پڑے پلنگ پر ہی بیٹھ گئی جو اکثر جابر علی کے لیے بچھا رہتا تھا۔

''یار کیا ہو گیا ہے، کم از کم مجھے فون پر تو بتا دیتیں کہ کوئی مسئلہ ہے، جس وجہ سے نہیں آ رہیں۔ میرا بالکل نہیں لگ رہا کالج میں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو فائزہ، تم کالج میں میرے لیے آتی ہو یا پڑھنے کے لیے؟''

''ٹھیک ہے کالج میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ہم سب ان کے لیے کر رہے ہیں۔''

''آج تو تم بڑی عجیب، عجیب باتیں کر رہی ہو۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟'' شبینہ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اس کے لیے فائزہ کی نظروں سے بچنا بڑا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ فائزہ اسے سر سے پاؤں تک بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی خاص بات محسوس ہو رہی ہو...... اسی وقت باہر سے ہارن کی آواز آئی تھی۔ شبینہ نے چونک کر فائزہ کی طرف دیکھا۔ فائزہ مسکرا دی۔

''بھئی یہ چھٹی سے پہلے والی بیل ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے احمر بھائی نے کہا تھا کہ جب میں پہلا ہارن بجاؤں گا تو اس کا مطلب ہے کہ اسٹینڈ بائی، دوسرے ہارن کا مطلب ہے کہ باہر آ جاؤ اور تیسرے ہارن کا مطلب ہے کہ اگر نہیں آ رہیں تو میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

احمر کے نام پر شبینہ کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگائے لیکن فوراً ہی یاسیت کے بادلوں میں گم ہو گئے۔

''لیکن ابھی تمہیں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔'' اس کی بات پر وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

''شبینہ بھئی تمہیں دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی کہ ماشاء اللہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو، کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں دوبارہ بھی آ جاؤں گی لیکن آج ممی سے وعدہ کیا تھا کہ میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگاؤں گی۔''

اسی وقت صابرہ شربت سے بھرا گلاس لے کر آ گئی تھی۔

''بیٹا اتنی بھی کیا جلدی ہے، آ ہی گئی ہو تو بیٹھو، تھوڑی دیر...... اچھا یہ شربت تو پی لو۔''

''آنٹی، میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا کہ کوئی تکلف کی ضرورت نہیں۔''

''کیسا تکلف بیٹا...... ٹھنڈا میٹھا پانی ہے، ایسے کیا جتن کیے میں نے۔ وہ آپ کا بھائی تو بے چارہ باہر ہوا ہے اندر ہی نہیں آیا۔ اندر آتا تو وہ بھی کم از کم ایک گلاس شربت تو پی لیتا۔''

''نہیں آنٹی بس...... شکریہ...... اب ہم چلیں گے۔ آپ نے ہارن کی آواز سنی ناں، احمر بھائی بلا رہے ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر شربت پینا شروع کیا اور اتنی عجلت دکھائی جیسے اسے کسی نے شربت پینے کی دی ہو جو پوری کرنا ضروری ہو...... اور فوراً ہی اس نے خالی گلاس شبینہ کے ہاتھ میں تھما دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا شبینہ ابھی تو میں جا رہی ہوں پھر کبھی آؤں گی تو آرام سے بیٹھ کر تم سے باتیں کروں گی۔''

''او کے، اللہ حافظ آنٹی۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اس سے پیشتر کہ فائزہ گیٹ کھول کر باہر جاتی جابر

دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔
فائزہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی اور اس نے بڑی شائستگی سے جابر علی کو سلام کیا۔
''السلام علیکم انکل......'' جابر علی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔ ایک بڑی چبھتی ہوئی تنقیدی نظر کے ساتھ جسے فائزہ تو نہ سمجھی لیکن شبینہ اور صابرہ سمجھ سکتی تھیں۔
فائزہ تو سلام کر کے گیٹ پار کر گئی تھی لیکن جابر علی اپنی جگہ پر گہری سوچ میں گم کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر ابھری لکیریں گہری ہو رہی تھیں۔ شبینہ تو باپ کی شکل دیکھتے ہی اندر بھاگ گئی تھی جبکہ صابرہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑی تھی۔
جابر علی نے گیٹ کی طرف پلٹ کر دیکھا پھر اپنی تسلی کے لیے مزید گیٹ کے لاک چیک کیے کہ وہ ٹھیک سے بند ہے کہ نہیں۔ تسلی کر لینے کے بعد اس نے قدم آگے بڑھائے تو صابرہ کسی طرف جانے کے بجائے گرنے کے سے انداز میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے قریب آ رہا ہے اور کیا کہنے آ رہا ہے۔
''یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟'' اس نے صابرہ کو مخاطب کیا، صابرہ کچھ بولی نہیں صرف سوالیہ نظریں جابر علی کے چہرے پر جما کر دیکھنے لگی۔
''وہ اتنی لمبی چم چم کرتی ہوئی گاڑی میں باہر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، کون ہے وہ......؟''
''شبینہ کے ساتھ کالج میں پڑھتی ہے یہ بچی...... فائزہ نام ہے، شبینہ کالج نہیں جا رہی تھی اس لیے اس سے ملنے آ گئی پتا کرنے...... ظاہر ہے بھائی کے ساتھ آئی ہو گی۔''
''آخر تم لوگوں کے اوپر میری کہی گئی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ صابرہ بیگم میں تمہیں ہزار مرتبہ بتا چکا ہوں کہ مجھے یہ سہیلاپے، دوستیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ یہ دوستیاں لڑکیوں کو خراب کرتی ہیں، آخر تمہیں ایک دفعہ کی کہی بات سمجھ کیوں نہیں آتی، تمہیں سمجھ آئے تو تم اپنی بیٹیوں کو سمجھاؤ...... تمہاری انہی بے وقوفیوں کی وجہ سے یہ وقت آیا ہے کہ آج جلدی میں بیٹی کی شادی کرنا پڑ رہی ہے اگر تم نے بیٹی کی تربیت ٹھیک سے کی ہوتی تو مجھے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔'' وہ یہ کہتا ہوا پاؤں پٹختا اندر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

سہراب خان، اصیل خان کے ساتھ اپنی شکاری رائفل اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ دونوں کسی بات پر زبردست قہقہے لگا رہے تھے۔
''یار اصیل خان اس معاملے میں تو میں تمہیں استاد مانتا ہوں کہ تمہارا نشانہ بڑا پکا ہے، سالوں سے پوچھ رہا ہوں بتا دو کہ استاد کون ہے؟''
''یار میرا استاد جو بھی ہے اب تم شاگردی والی عمر سے نکل گئے ہو، چاہو تو مجھے استاد بنا سکتے ہو۔ ہاں تو تین چار سال بڑا ہوں تم سے۔'' اصیل خان اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
''بس اب تم اپنی استادی مہر جان پر دکھاؤ ناں تو تمہیں مانیں گے۔'' سہراب خان نے زور سے اصیل خان کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔
''یار بڑی اڑیل گھوڑی ہے، بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔'' اصیل خان مسکرا دیا۔
''خوش فہمی ہے تمہاری۔'' سہراب خان نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ''ابھی وہ تمہارے قابو میں نہیں آئی...... اور ہاں...... یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لو...... ہو سکتا ہے نکاح کے بعد بھی قابو میں نہ آئے۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔''

''مجھے کیا پڑی ہے سوچنے کی...... ابھی تم نے خود ہی تعریف کی ہے کہ میرا نشانہ پکا ہے۔'' اصیل خان شریر انداز میں گویا ہوا۔

''دل کا بھی؟'' سہراب خان نے بڑی شوخی سے پوچھا تھا۔ اسی وقت مہر جان اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دونوں کے زبردست قہقہوں نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا جو وہ اندر سے سنتی چلی آئی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے تم دونوں کو...... آہستہ آواز میں نہیں ہنس سکتے؟'' وہ مصنوعی برہمی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ہمارا دل چاہ رہا ہے ہنسنے کو اور دل پر کسی کا زور نہیں۔''

''ایسی کی تیسی اس دل کی۔'' مہر جان آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھے ہوئے اپنے ریکٹ اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''سن رہے ہو، دل کی ایسی کی تیسی کردی ہے...... اتنی پرانی منگنی ہوگی تو پھر یہی کچھ سننے کو ملے گا۔ ظاہر ہے کتنے دن ہوگئے صبر سے انتظار کرتے ہوئے۔ اب تو دل کی ایسی تیسی ہو ہی گئی۔'' سہراب خان نے بڑی شوخی سے ٹکڑا جڑا اور دونوں پھر ہنسنے لگے۔

مہر جان نے ریکٹ اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

''بہت ظالم ہے یار...... میرا کیا بنے گا۔'' اصیل خان نے سہراب خان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور جان بوجھ کر بظاہر بڑے دل گرفتہ انداز میں بولا۔ مہر جان نے باہر نکلتے نکلتے یہ جملہ سن لیا تھا۔

☆☆☆

گل جان، بی بی جان کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے میں ایک گہری تاریکی کا راج تھا۔ سب دریچوں کے پردے پڑے ہوئے تھے اور وہ درمیان میں ایزی چیئر پر بیٹھی جھول رہی تھیں۔ ماضی کا ایک حسین منظر ٹیسیں دے رہا تھا۔

گل جان نے پلکیں جھپک جھپک کر پہلے تو اپنی بصارت معمول پر لانے کی کوشش کی پھر جیسے ہی وہ کمرے میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئی تو اُن کی طرف بڑھی۔

''بی بی جان آپ اس طرح کیوں بیٹھی ہیں؟ لیٹ جائیں ناں۔''

''ہاں میں لیٹ جاؤں گی، ذرا میرا موبائل مجھے دو۔''

گل جان نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا اور انہیں تھما دیا۔ مہر جان نے اس پر ایک نمبر پریس کیا اور چند لمحوں بعد کال ریسیو ہوگئی۔

''کون سہراب خان!'' گل جان نے چونک کر مہر جان کی طرف دیکھا۔ وہ سہراب خان سے مخاطب تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نئے سرے سے قیامت کو آواز دے رہی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر مہر جان کی طرف دیکھتی رہی۔

بی بی جان دوسری طرف سے سہراب خان کی بات سن رہی تھیں جو اللہ جانے کیا، کیا کہہ رہا تھا چند لمحے سراب خان کی بات سننے کے بعد مہر جان گویا ہوئیں۔

''سہراب خان آج ہی نکاح کرنا ہے، چاہے رات کے بارہ بج جائیں یا ایک...... یا صبح فجر کی اذان ہوجائے۔''

(جاری ہے)



ابھی تو روزے باقی ہیں

نسرین خالد

''بھائی! اٹھ جاؤ سحری کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔'' ہانیہ نے علی کے اوپر سے چادر ہٹاتے ہوئے کہا۔ علی نے کروٹ بدلتے ہوئے سر کے پاس رکھا تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

''بھائی جلدی اٹھ جاؤ، ابا تین دفعہ تمہارا پوچھ چکے ہیں۔'' ہانیہ نے اس کا بازو ہلایا۔

''کہہ دو ابا کو ہمیں سونے دیں۔ ہم جانے ہمارا خدا جانے۔'' علی نے شاعرانہ انداز میں کہا اور

دوبارہ چادر سر تک تان لی۔

''ٹھیک ہے اب ابا خود آ کر تم سے نمٹیں گے، میں تو جارہی ہوں نفل پڑھنے۔'' ہانیہ نے اسے دھمکی دی۔

''اچھا، اچھا اٹھ رہا ہوں، اب تم شکایت لگانے نہ پہنچ جانا۔'' علی منہ بناتے ہوئے اٹھا۔

''ابا کہاں ہیں؟'' علی نے صحن میں نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو سحری کھا کر مسجد چلے گئے ہیں، اب فجر پڑھ کر ہی آئیں گے۔ جاتے ہوئے وہ کہہ کر گئے تھے کہ تمہیں بھی فجر کے ٹائم مسجد بھیج دوں۔'' ہانیہ نے کھانا اس کے سامنے رکھا۔

''کیا زبردستی ہے یار ویسے بھی ابھی تو دوسرا روزہ ہے اٹھائیس روزے باقی ہیں، رکھ ہی لوں گا۔ دین میں کوئی جبر تھوڑی ہے مگر یہاں......'' علی نے کھانے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سحری کا ٹائم ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔'' مسجد کے اسپیکر سے پھر آواز آئی۔

''ایک تو ان کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ ایک دفعہ بتا دیا تھا کہ بیس منٹ باقی ہیں اب ضروری ہے کہ ہر پانچ منٹ بعد اعلان کریں۔'' علی سحری کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

''صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں، میں نوافل ہی پڑھ لوں۔'' ہانیہ صحن میں لگے نل کی طرف بڑھی۔

''ساری دنیا رمضان المبارک کی رحمتیں، برکتیں سمیٹنا چاہتی ہے مگر یہ......'' ہانیہ نے سحری کھاتے علی کو دیکھا جس کے چہرے سے ہی پتا چل رہا تھا کہ اس سے زبردستی روزہ رکھوایا جارہا ہے۔

''یا اللہ! میرے بھائی کو ہدایت دے۔'' ہانیہ نے دل سے دعا مانگی وہ جب وضو کر کے آئی تو علی سحری کر کے دوبارہ لیٹ چکا تھا۔

''بھائی سونا نہیں بس سات آٹھ منٹ رہ گئے ہیں فجر کی اذان میں۔'' ہانیہ کو ڈر تھا کہ کہیں وہ دوبارہ نہیں سو جائے اگر وہ سو جاتا تو اسے جگانا ایک مشکل کام تھا۔

''میں جاگ رہا ہوں بس ایسے ہی لیٹا ہوں'' علی نے اپنے موبائل میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

ہانیہ نے جلدی سے جا نماز بچھائی اور نفل پڑھنے لگی۔ فجر کی اذان سے پہلے ہی وہ دو نفل پڑھ چکی تھی فجر کی اذان کی آواز سن کر اس نے مڑ کر علی کو دیکھا تو وہ سو چکا تھا۔

''امی! بھائی دوبارہ سو چکے ہیں۔'' ہانیہ نے کمرے میں جا کر امی کو آگاہ کیا۔

''کیا کروں میں اس لڑکے کا، کتنی بار سمجھایا ہے کہ سحری کے بعد نماز پڑھ کر ہی سو جایا کرے اگر نیند آتی ہے۔'' صفیہ جانماز کا کونا موڑ کر باہر آئیں۔

''علی بیٹا اٹھو نماز پڑھ آؤ۔'' صفیہ نے علی کا بازو ہلایا۔

''اٹھتا ہوں۔'' علی نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا اٹھ جاؤ، جماعت کھڑی ہونے والی ہے ابھی موذن نے ٹائم بتایا ہے۔''

''اوہوں، بس میں سو رہا ہوں، کل سے پڑھوں گا۔'' علی نے چادر منہ تک لیتے ہوئے اپنا والا جملہ دُہرایا۔

''جانے کب آئے گی وہ کل۔'' صفیہ نے افسوس سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

''امی... کھانا۔'' علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا تو ہانیہ اور صفیہ بیگم حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

''علی تمہارا تو روزہ تھا ناں؟'' صفیہ بیگم نے اسے گھورا۔

''امی وہ یونیورسٹی میں دوستوں کے ساتھ کولڈ ڈرنک پی لی تھی تو......''

''علی تم نے روزہ توڑ دیا؟''

''نہیں امی توڑا نہیں ہے، میں نے تو روزے کی نیت ہی نہیں کی تھی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ صفیہ بیگم نے افسوس سے اسے دیکھا۔

''آپ لوگ زبردستی روزہ مت رکھوایا کریں، اتنی گرمی ہوتی ہے اور میرے کسی دوست کا روزہ نہیں ہوتا تو پھر......'' اس نے وضاحت دینی چاہی مگر صفیہ بیگم نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ انہیں اس پل جوان بیٹے پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا چار چار گھنٹے انٹرنیٹ کے سامنے بغیر کچھ کھائے پیے گزار سکتا ہے مگر روزہ رکھ کر وہ بھوک اور پیاس برداشت نہیں کرسکتا۔

''آپ کا تو روزہ ہے، میں خود ہی کھانا لے لیتا ہوں۔ ویسے بھی ابھی تو روزے باقی ہیں ناں۔'' علی نے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت سمجھی کیونکہ معلوم تھا کہ اگر ایک دفعہ امی شروع ہوجائیں تو روکنا مشکل ہوجاتا۔

''یا اللہ...... اس لڑکے کو ہدایت دے۔'' صفیہ بیگم نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆☆☆

''ہانی بیٹا! جاؤ علی سے بھی پوچھو کیا پتا روزہ رکھ لے۔'' صفیہ بیگم نے چائے پیتی ہانیہ کو کہا۔

''بھائی! روزہ رکھنا ہے تو سحری کرلیں۔'' اب ہانیہ روز سحری کے وقت اس سے ایک دفعہ ضرور پوچھتی تھی۔ کل اس نے کہا تھا کہ وہ جمعے کا روزہ رکھے گا۔

''بھائی آج جمعہ ہے آپ نے کل کہا تھا کہ جمعے کا روزہ رکھیں گے۔'' ہانیہ نے اسے یاد دلایا۔

''ہانی! تم سونے دو مجھے...... اگر مجھے رکھنا ہوا تو بغیر سحری کے بھی رکھ لوں گا۔'' اس کا جواب سن کر ہانیہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''سحری کر کے تو آپ رکھ نہیں سکتے بغیر سحری کے تو ضرور رکھیں گے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور کچن میں آکر برتن سمیٹنے لگی۔

''ہانی میری بلیو شرٹ کہاں ہے؟'' ناشتے سے

میری محبوبہ

تمہیں کیسے بتاؤں، کیا ہے وہ اور کس کے جیسی ہے
نہیں ہے اپسرا کوئی مگر پریوں کے جیسی ہے

حیا کے بوجھ سے پلکیں جب اپنی وہ جھکاتی ہے
تو اک سرخی سی رخساروں پہ پل بھر جھلملاتی ہے
جھکی نظروں کو جب چپکے سے وہ ظالم اٹھاتی ہے
تو مانو، من کی دنیا اس ادا پر ڈول جاتی ہے

گماں کی حد سے ہے بالا، مثال اس پیاری صورت کی
نہ ہو حوروں کی بھی شاید، جبیں کچھ اس کی ایسی ہے

نہایت دل رُبا منظر سی اس کی مسکراہٹ ہے
سبھی دلکش سُروں سے دلنشیں قدموں کی آہٹ ہے
چلو چھوڑو زیادہ اس سے کچھ اب ہم نہیں کہتے
حُسن جاگیر اس کی اور حیا سکھیوں کے جیسی ہے

سنو اب حال اس کی کلیوں سے پیاری اداؤں کا
کہ ہے محور جو میری سب بے کل وفاؤں کا

قیاس آرائیاں بے حد، سویر وشام کرتی ہے
کہ آہیں سرد اس کو تک کے، یہ دنیا کیوں بھرتی ہے
زمانے بھر کی ہے سادہ، بلا کی بھولی دِکھتی ہے
کسی چوکھٹ سے چھپ کر جب ہمیں دیکھا وہ کرتی ہے

میں اور کیا کیا بتاؤں تم کو میری جان کیسی ہے
فقط یہ جان لو، اِک دلنشیں ارمان جیسی ہے

نظم: آتش ساگر۔ پسند: نادیہ، کوئٹہ

فارغ ہو کر اس نے ہانیہ سے پوچھا۔
''وہیں الماری میں ہینگ کی ہوئی ہے، میں دیتی ہوں ڈھونڈ کے۔'' ہانیہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
علی نے ایک نظر ماں کو دیکھا اسے معلوم تھا وہ اس سے ناراض ہیں۔ ''آج یونیورسٹی سے آکر امی کو منالوں گا اور کوشش کروں گا کہ جمعے کا روزہ تو رکھ ہی لوں۔'' علی نے جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے سوچا۔
''شکر ہے ابا سے ملاقات نہیں ہوتی، نہیں تو لمبی کلاس لیتے۔'' اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کم از کم رمضان میں ابا سے ملاقات کم ہی ہو کیونکہ اگر ہوئی تو وہ روزے کا ضرور پوچھیں گے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی تھا کیونکہ رمضان میں ابراہیم صاحب کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا۔
اس نے اپنی تیاری مکمل کر کے خود کو ایک دفعہ پھر آئینے میں دیکھا۔
''ٹھیک کہتا ہے جنید، ایک دم ٹام کروز لگتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور ٹیبل سے بائیک کی چابی اٹھائی اور یونیورسٹی کے لیے چل دیا۔

☆☆☆

فون کے بجنے کی آواز سن کر ہانیہ نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔
''ہیلو السلام علیکم......'' دوسری طرف سے جانے کیا کہا کہ اس کے منہ سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ ''کیا......؟'' برآمدے میں بیٹھی صفیہ بیگم جلدی سے کمرے میں آئی۔
''کیا ہوا ہانی؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔
''ا...... امی...... بھائی...... بھائی۔''
''کیا ہوا میرے بچے کو؟'' صفیہ بیگم کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''جلدی بتاؤ ہانی میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے...... میرا بچہ......''
''امی...... بھائی کا ایکسیڈنٹ ......امی ٹرک......ٹرک۔'' ہانیہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے صرف اتنا ہی بول پائی۔ بچپن سے ٹرک سے خوف آتا تھا۔ عجیب جناتی سواری لگتی تھی اتنے بڑے بڑے ٹائر، اس نے بچپن میں سنا تھا کہ کوئی بچہ ٹرک کے ٹائر کے نیچے آکر کچل گیا۔ تب سے ٹرک سے اسے خوف آتا تھا۔
''ہانی جلدی اپنے ابا کا نمبر ملاؤ، مجھے اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے۔ میرا بیٹا......ارے میرا علی تکلیف میں ہے۔'' صفیہ بیگم نے ہانی کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ہانیہ کو جیسے ہوش آیا وہ جلدی جلدی ابا کا نمبر ملانے لگی۔
صفیہ بیگم پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔
''یا اللہ میرا بچہ...... یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرما، یا اللہ میرے بچے کو زندگی دے۔'' وہ گردن ہلائے بس یہی بولے جا رہی تھیں۔
پندرہ منٹ بعد ابراہیم احمد ٹیکسی لے کر پہنچ چکے تھے۔
''امی میں بھی جاؤں گی۔'' ہانیہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔
''نہیں بیٹا تم گھر پر رہو، بس بھائی کے لیے دعا کرو۔'' انہوں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ہدایت کی۔
''انکل، علی آئی سی یو میں ہے۔'' انہیں دور ہی سے بیٹے کا دوست دکھائی دیا۔ داؤد نے آگے بڑھ کر انہیں بتایا تھا۔
صفیہ بیگم کی حالت بالکل سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔
''آپ......آپ ڈاکٹر سے پوچھیں تو سہی میرا بچہ کیسا ہے؟''
''ڈاکٹر کو آنے تو دو صفیہ۔''
آپریشن تھیٹر سے نکلتے نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ کر ابراہیم صاحب آگے بڑھے۔
''ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟'' پُرامید نظروں سے انہوں نے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''معجزے آج بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں انکل، آپ دعا کریں ہم دوا کر رہے ہیں۔''
''سسٹر...... آپ نے ڈاکٹر لغاری کو انفارم کر دیا ہے۔'' سامنے سے آتی نرس کو دیکھ کر ڈاکٹر اسد نے اس سے پوچھا۔
''جی سر...... میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ......ایمرجنسی کیس ہے، وہ آ رہے ہیں۔'' صفیہ بیگم ایک طرف جا نماز بچھائے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ زبان سے صرف ایک جملہ بولے جا رہی تھیں۔
''یا حی یا قیوم، میرے بچے کو زندگی دے دے۔''

☆☆☆

آٹھ گھنٹے بعد اسے ہوش آیا تھا وہ خاموشی سے چھت کو تک رہا تھا۔ صفیہ بیگم جب شکرانے کے نفل پڑھ کر آئیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو گئیں۔
''علی بیٹا زیادہ درد ہو رہا ہے کیا......؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟''
''نہیں امی...... بس آپ یہاں میرے پاس بیٹھ جائیں۔'' وہ سسکا۔
''امی...... اگر میں مر جاتا تو......؟''
''نہیں بیٹا...... ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔'' ان کے دل کو کچھ ہوا۔
''امی میں بھی مرنا نہیں چاہتا۔ میرے پلے کچھ ہے ہی نہیں، جسے لے کر اپنے رب کے حضور حاضری دوں۔''
وہ کیا بتاتا وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی چوبیس سالہ زندگی میں کی گئی کوئی نیکی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کوئی ایک نیکی بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔
''تم دنیا کے سب سے غریب شخص ہو، علی ابراہیم، تم نے چوبیس سالوں میں کوئی ایک ایسی نیکی بھی نہیں کی جسے سوچ کر تم مطمئن ہو سکو، جس پر تم فخر کر سکو اور نمازیں...... قبر میں سب سے پہلے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔'' بچپن میں پڑھایا گیا یہ جملہ اسے آج بھی یاد تھا۔
''اگر میں مر جاتا تو مجھ سے سب سے پہلے میری نمازوں کے بارے میں پوچھا جاتا۔ ان چوبیس سالوں میں، میں نے کتنی نمازیں پڑھی ہوں گی، ایک وقت کی بھی نماز مشکل سے چوبیس بنیں گی۔'' اسے بے حد شرمندگی ہوئی۔
''میں اس کا کتنا نافرمان بندہ ہوں......اور اس کی عنایتیں...... میری اتنی نافرمانی کے باوجود مجھ پر اس کا اتنا کرم......'' وہ آج سارے حساب کیے جا رہا تھا۔ اپنی چوبیس سالہ زندگی کا رجسٹر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔

☆☆☆

صفیہ بیگم بے حد خوش تھیں۔ علی جب سے اسپتال سے آیا تھا بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اب خود سحری کے ٹائم اٹھ جاتا تھا۔ سحری کھا کر ابراہیم صاحب کے ساتھ ہی مسجد چلا جاتا تھا پھر فجر کے بعد آتا تھا۔
آج چاند رات تھی، علی کھانا کھا کر مسجد جا چکا تھا۔ ہانیہ گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔ صفیہ بیگم عبادت میں مصروف تھیں۔ وہ چاند رات کو دیر تک عبادت کرتی تھیں۔ آج تو ان کا روم، روم اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا۔ یہ ماہِ مبارک ان کے اور ان کے خاندان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔
قرآن پاک سامنے رکھے وہ تلاوت کر رہی تھیں۔ اس آیت کا ترجمہ پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔
''اے گروہ جن وانس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''





ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

گیارھواں حصہ

خدیجہ بیگم ردا کو فون ملاتی رہیں مگر ردا کا موبائل اس کے بیگ میں Silent mode پر پڑا تھا، وہ اپنی ہی سوچوں میں گم فہام کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ شمیلہ نے ہی زبردستی اسے فہام کے ساتھ بٹھایا تھا اور فہام بہت محبت سے اس کے ساتھ باتیں کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ دھیمے سے مسکرا کر بھائی کا دل رکھ رہی تھی۔

''ردا......فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔'' خدیجہ

بیگم بڑبڑائیں اور فہام کا نمبر ملانے لگیں۔
''ہیلو...... مما خیریت تو ہے؟'' فہام نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے فون ریسیو کیا۔
''ہاں بیٹا...... روحیل، ردا کو لینے آیا تھا اس کی ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' خدیجہ بیگم نے قدرے گھبرائے ہوئے جواب دیا۔
''لیکن مما...... ردا تو آج یہاں ہمارے پاس رہے گی۔'' فہام نے حیرت سے کہا۔
''بحث کرنے کی ضرورت نہیں...... تم لوگ گھر واپس آجاؤ...... روحیل کافی غصے میں تھا۔'' خدیجہ بیگم نے جلدی سے جواب دیا۔
''اوکے...... ہم آرہے ہیں۔'' فہام نے گہری سانس لے کر کہا۔
''مما کا فون تھا...... روحیل گھر میں تمہارا انتظار کررہا ہے۔'' فہام نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔
''کیا...... روحیل گھر آئے ہیں' کیوں؟'' ردا نے گھبرا کر پوچھا۔
''شاید اس کی ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مما گھر آنے کو کہہ رہی ہیں۔'' فہام نے کہا تو ردا خاموش ہوگئی۔
''یہ کیا بات ہوئی...... ابھی تو ہم لوگ آئے ہیں۔ آئس کریم بھی نہیں کھائی۔'' شمیلہ نے برا سا منہ بنایا۔
''ردا کیا خیال ہے؟'' فہام نے ردا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''گھر چلتے ہیں۔'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
''اوکے۔'' فہام نے کہا اور گاڑی ریورس کرنے لگا جبکہ شمیلہ ''اونہہ'' کہہ کر رہ گئی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم نے فہام کو فون کرنے کے بعد کافی دیر کچھ سوچا پھر ردا کی سسرال فون کرنے لگیں۔ کافی بیلز کے بعد زرینہ نے فون اٹھالیا۔
''ہاں زرینہ...... میں خدیجہ بیگم بول رہی ہوں۔ کیا روحیل گھر آگیا ہے؟'' انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔
''نہیں بیگم صاحبہ...... ابھی تو نہیں آئے۔'' زرینہ نے جواب دیا۔
''کیا اس کی ماں جی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟'' خدیجہ بیگم نے گہری سانس لے کر پوچھا۔
''نہیں...... وہ تو دوا کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔'' زرینہ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا تو وہ اچھا کہہ کر چپ ہوگئیں۔
''کیا بات ہے...... آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟'' زرینہ نے استفہامیہ انداز میں کہا۔
''ک...... ک...... کچھ نہیں...... تم روحیل کو میرے فون کے بارے میں کچھ نہ بتانا...... اچھا خدا حافظ۔'' خدیجہ بیگم نے ایک دم بوکھلا کر جواب دیا اور فون بند کردیا۔ اسی لمحے فہام کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ سب لوگ گاڑی سے باہر نکلے اور جلدی سے لاؤنج میں داخل ہوئے۔
''مما...... روحیل کہاں ہیں، باہر تو ان کی گاڑی نہیں ہے؟'' ردا نے دوڑ کر ماں کے قریب آکر پوچھا تو وہ پریشانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ فہام اور شمیلہ بھی ان کے پاس آگئے۔
''روحیل کہاں ہے مما! ہم لوگ تو آئس کریم کھائے بغیر ہی آگئے۔'' فہام نے ماں سے پوچھا۔
''وہ تو چلا گیا۔'' خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر بتایا۔
''کیوں؟'' ردا نے گھبرا کر پوچھا۔
''معلوم نہیں، میں تم لوگوں سے بات کررہی تھی وہ پیچھے سے چلا گیا۔''
''اگر اسے ردا کو لے جانے کی اتنی جلدی تھی تو پھر انتظار کیوں نہیں کیا؟'' شمیلہ نے اعتراض کیا۔
''فہام بھائی! آپ مجھے گھر ڈراپ کردیں' ہوسکتا ہے ماں جی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہو۔''

ردا نے پریشانی سے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔
''نہیں...... اگر اسے ضرورت ہوتی تو وہ تمہیں لے کر ہی جاتا۔ بس اب صبح ہی جانا۔'' فہام نے ایک دم غصے سے کہا تو ردا پریشانی سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔
''فہام ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا۔'' انہوں نے بھی آہستہ سے کہہ دیا۔ فہام سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور شمیلہ بھی عجیب انداز سے ردا کو دیکھتی شوہر کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

روحیل انتہائی ریش ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔ اس کے دل میں آگ سی لگی تھی جس کے شعلے اس کے دماغ تک پہنچ کر اسے بے حال کررہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ردا سامنے ہوتی تو وہ اس کا منہ ہی نوچ ڈالتا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔
''اس نے مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ محبت کسی اور سے کرتی تھی اور شادی مجھ سے کی، اگر میں وہ خط نہ پڑھتا تو نہ جانے وہ کب تک مجھے یونہی دھوکا دیتی رہتی...... مکار...... دھوکے باز...... جھوٹی۔'' روحیل نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر سوچا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے دیوار پر مکے مارنے لگا۔
''میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' وہ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ اسی لمحے اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا جہاں ردا کا نام چمک رہا تھا۔ روحیل نے غصے سے yes کا بٹن دبادیا۔
''روحیل! آپ گھر کیوں چلے گئے...... میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟'' ردا نے جلدی سے پوچھا۔
''اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔'' اس نے نہایت خفگی سے جواب دیا۔
''کیوں؟'' ردا نے چونک کر پوچھا۔
''تم جیسی جھوٹی اور دھوکے باز کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ ہی میرے گھر کو۔'' روحیل غصے سے بولا اور فون آف کردیا۔
''یہ...... یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ہیلو، ہیلو کہتی رہی مگر وہ فون آف کرچکا تھا۔ اس نے انتہائی فکرمندی سے روحیل کا نمبر دوبارہ ملایا مگر اب اس کا موبائل آف تھا۔
''روحیل کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے؟ اس سے پہلے تو انہوں نے میرے لیے ایسے برے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ خدا معلوم ایسا کیا ہوگیا ہے کہ وہ اتنے غصے میں ہیں۔'' ردا پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

☆☆☆

زرینہ نے صبح سویرے اٹھ کر روحیل کے لیے ناشتا تیار کردیا تھا مگر وہ تیار ہوکر سیدھا باہر چلا گیا۔ آج ماں جی کا بھی حال نہ پوچھا۔ زرینہ ابھی ناشتے کی چیزیں سمیٹ ہی رہی تھی اسی لمحے ردا قدرے گھبرائی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔
''روحیل کہاں ہیں؟'' اس نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔
''وہ...... تو آفس چلے گئے ہیں اور وہ بھی ناشتا کیے بغیر۔'' زرینہ شکایتی لہجے میں بولی۔
''کیوں؟'' ردا نے چونک کر پوچھا۔
''پتا نہیں...... غصے میں ہی لگ رہے تھے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔
''کیا انہوں نے تم سے کچھ کہا؟''
''کہا تو نہیں مگر اُن کے چہرے پر غصہ صاف دکھائی دے رہا تھا...... میں نے ناشتے کے لیے کہا تو جواب دیے بغیر ہی چلے گئے۔''
''اوہ...... اور...... ماں جی؟''
''وہ سو رہی ہیں...... میں رات بھر ان کے پاس ہی رہی۔'' زرینہ نے بتایا تو وہ خاموش ہوکر

اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ردا نے گھر آتے ہی پہلے اپنا حلیہ درست کیا پھر ماں جی کے پاس چلی آئی۔ اس نے ماں جی کو خود اپنے ہاتھ سے ناشتا کروایا اور اُن کا لباس تبدیل کیا، بستر ٹھیک کیا اور وہیں ان کے پاس بیٹھ کر خوش دلی سے ان سے باتیں کرنے لگی۔

ماں جی اسے تمام امور انجام کرتا دیکھتی رہیں اور دل ہی دل میں اس کے اور روحیل کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔

''ماں جی...... آپ ابھی تک ریڈی نہیں ہوئیں۔ مجھے آپ کو آج اسپتال لے کر جانا ہے۔ آپ کی ٹانگ کا پلاسٹر remove کرانا ہے۔'' روحیل کمرے میں داخل ہوتے ہی بغیر کچھ دیکھے کہنے لگا۔

''بیٹا میں تیار ہوں، ردا بیٹی میری چادر مجھے دے دو۔'' ماں جی نے کہا تو اس نے وارڈ روب سے چادر نکال کر ماں جی کو اوڑھا دی اور انہیں وھیل چیئر پر بٹھانے میں روحیل کی مدد کرنے لگی۔ روحیل نے جلدی سے ردا کا ہاتھ پیچھے ہٹایا تو ردا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''ماں جی...... جلدی کیجیے۔'' روحیل غصے سے منہ پھیر کر بولا۔

''ردا بیٹے تم بھی میرے ساتھ چلو...... تمہاری موجودگی سے مجھے بہت سکون ملتا ہے۔'' ماں جی نے اس کی طرف دیکھ کر محبت سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں...... میں آپ کے ساتھ ہی ہوں گا۔'' روحیل قطعیت سے بولا۔

''روحیل...... تمہارے لہجے میں اتنا غصہ کیوں ہے...... کیا تم آرام سے بات نہیں کر سکتے؟'' ماں جی نے خفگی سے کہا۔

''آپ کو ہمیشہ میری باتیں اور لہجہ برا لگتا ہے۔ دوسرے منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اندر ہی اندر کتنے ہی بڑے گناہ کریں، وہ آپ کو دکھائی نہیں دیتا۔'' روحیل نے نشتر چبھوتی نظروں کے ساتھ ایک نگ ردا کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بری طرح چونکی۔ روحیل ماں جی کو وھیل چیئر پر بٹھا کر لے گیا اور ردا حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

''روحیل کی اس بات کا کیا مطلب ہے اور اس نے یہ بات کس کو کہی ہے؟ شاید مجھے...... لیکن مجھے کیوں......؟'' وہ انتہائی پریشان ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

اماں جی نے یمنیٰ کو مولوی رحمت اللہ سے ملوایا تھا اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے چند روز پڑھانے کے بعد ہی وہ کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔ وہ ہر روز سہ پہر کے بعد قرآن پاک ترجمے سے پڑھانے آتے تھے اور وہ بہت توجہ اور دھیان سے ان سے پڑھتی اور انتہائی مشکل اور حیران کن سوالات کرتی کہ مولوی صاحب بھی چونک کر رہ جاتے...... لیکن اندر ہی اندر وہ اس کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے۔ یمنیٰ نے چند دن ان سے پڑھنا کیا شروع کیا کہ اسے ایک دم اپنے اندر عجیب سی تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے اندر پھیلا اضطراب اب کچھ کم ہونے لگا تھا۔ مولوی صاحب کی محنت اور علمی گفتگو نے اس کا ذہن علم دین سیکھنے کی طرف راغب کر دیا تھا۔ اماں جی کے کہے بغیر اس نے اپنے حلیے کو بھی کافی حد تک بدل لیا تھا۔ وہ پہلے بھی جب گاؤں آتی تھی تو ہمیشہ شلوار قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے چھوٹا سا اسٹول گلے میں جھولتا رہتا تھا مگر اب کی بار اس نے بڑا سا دوپٹا جو سر پر اوڑھا تو پھر کبھی سر سے اترنے نہ دیا۔ اماں جی بھی اس میں یہ تبدیلی دیکھ کر حیران بھی تھیں اور خوش بھی مگر انہوں نے اس سے کوئی ذکر نہیں کیا۔

''مولوی صاحب! یمنیٰ کے بارے میں آپ

کی جو بھی رائے ہے مجھے واضح طور پر اور صاف، صاف بتا دیں۔'' اماں جی نے ایک دن اس کی عدم موجودگی میں مولوی صاحب سے پوچھا۔

''ماشاء اللہ بچی بہت ذہین ہے اور اس میں سمجھ بوجھ ہمارے گاؤں کی عام لڑکیوں سے کہیں زیادہ ہے اور علم کی جستجو بھی بہت زیادہ ہے۔'' مولوی صاحب نے اپنی رائے دی۔

''آپ کے خیال میں کیا وہ اتنی بھاری ذمے داری اٹھا سکے گی؟ دیکھیں مولوی صاحب یہ کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔ یہ بہت بڑی ذمے داری کا کام ہے۔'' اماں جی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کسی کے بارے میں کوئی دعویٰ کرنا بہت مشکل ہے لیکن ساری بات تو اللہ کے کرم اور توفیق کی ہے۔ وہ چاہے تو ذرے کو آفتاب بنا دے اور چاہے تو پہاڑوں کو ذرہ ذرہ خاک بنا دے۔ وہ بچی سے کیا کام لینا چاہتا ہے ہم نہیں جانتے۔ اگر وہ اسے کوئی توفیق بخش رہا ہے تو ہم اسے نہیں روک سکتے۔'' مولوی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا تو اماں جی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگیں۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں اور کہاں سے شروع کروں۔ اتنے بڑے کام کا آغاز کوئی آسان بات تو نہیں ہے ناں۔'' اماں جی نے سوالیہ نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔

''آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ اس کے مکمل ہونے تک بچی کی تعلیم و تربیت بھی مکمل ہو جائے گی بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کے لیے کوئی ماہر عالم دین مقرر کریں۔ آپ جمال بیٹے سے بات کریں اگر کوئی ایسا عالم انہیں شہر سے مل جاتا ہے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔'' مولوی صاحب نے رائے دی۔

''کیوں...... آپ کیوں نہیں۔ میری نظر میں تو آپ ایک قابل استاد ہیں، عالم ہیں۔ کیا آپ اسے تعلیم نہیں دے سکتے؟'' اماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں گاؤں کا پڑھا لکھا، ایک سادہ سا انسان ہوں اور بچی کا ذہن ماشاء اللہ بہت متحرک ہے۔ ایک ذہین ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کہیں زیادہ ماہر اور مستعد مربی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح ہیرے کو ایک جوہری تراش سکتا ہے کوئی لوہار نہیں اسی طرح ذہانت کو بھی کوئی عالم، عاقل ہی جلا بخش سکتا ہے۔ میں اسے ابتدائی تعلیم تو ضرور دوں گا مگر بہتر یہی ہے کہ آپ اس کے لیے کسی عالم دین یا مذہبی اسکالر کو مقرر کریں۔'' مولوی صاحب نے سمجھایا تو اماں جی خاموش ہو گئیں۔

''ٹھیک ہے میں جمال سے بات کرتی ہوں اور پھر اس کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' اماں جی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں گا اور مجھے امید ہے کہ بچی یہ کام بہت اچھے طریقے سے انجام دے گی۔'' مولوی صاحب نے پُرامید لہجے میں کہا اور اماں جی سے اجازت لے کر چلے گئے۔

اماں جی کی آنکھیں بھی امید سے چمکنے لگیں اور انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے بیٹے کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

آزر کے والدین چند گھنٹوں میں جس طرح دبئی بھاگے تھے وہی جانتے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ صرف جان بچانے کی فکر تھی۔ نیشا کا باپ نہ معلوم کس وجہ سے پولیس تک نہیں جا سکا، وہ اپنے ہی ذرائع سے عظیم کا پتا کر رہا تھا۔ اس نے ایک عقل مندی یہ کی کہ پاکستان میں موجود عظیم کے بزنس پارٹنر کو سارا حال کہہ سنایا جو خود بھی عظیم سے نالاں تھا اور اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکا تھا۔ آزر کے والدین دبئی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد پاکستان اپنے گاؤں واپس آ چکے تھے کہ وہی انہیں جائے پناہ نظر آئی تھی جبکہ آزر نے دبئی سے فوری جانے سے انکار کر دیا تھا جب یہ لوگ لٹے پٹے حال میں گاؤں پہنچے تو وہاں موجود آزر

کے دادا اور دیگر رشتے دار ہکا بکا تھے۔ اسی عالم میں ایک مصیبت اور یہ نازل ہوئی کہ نیشا کے والد نے عظیم کے بزنس پارٹنر کے ساتھ مل کر عظیم کے اوپر فراڈ کا مقدمہ کر دیا۔ پولیس جب چھان بین کے لیے آئی تو عظیم پتا نہیں کیسے گھر سے فرار ہو گیا اور اب ساری مصیبت آزر کی ماں کے سر آ گئی۔ پولیس آئے دن آ کر انہیں تنگ کرتی جبھی اس کے سسرال والے بھی بیزار آ گئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ لوگ اس پر طنز کرتے اور اتنی باتیں سناتے کہ اسے وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ بات تو خیر سچ تھی کہ شمیم نے اپنے عروج کے دنوں میں کبھی ان لوگوں کو گھاس نہیں ڈالی تھی۔ کبھی کبھار کوئی گاؤں سے اس کے پاس آتا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگتے اور اسے ان سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے رویے کی وجہ سے سسرال والوں نے اس کے گھر ہی آنا چھوڑ دیا تھا مگر اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اب وہ ان کے در پر بے یار و مددگار پڑی تھی۔ سب آتے جاتے مختلف باتیں سناتے رہتے اور یہی کہتے رہتے کہ اس کا اپنے گھر چلے جانا ہی بہتر ہے۔ وہ آزر کو فون کر کر کے تھک چکی تھی مگر آزر اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گئی تھی۔ نہ گھر جا سکتی تھی اور نہ وہاں رہنے کو اس کا دل چاہ رہا تھا۔ عظیم کی بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں غائب ہوا تھا۔ وہ دن رات اٹھتی بیٹھتی آہیں بھرتی اور روتی رہتی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے حالات یوں ایک دم بدل جائیں گے۔ وہ رات کو آنکھیں بند کیے ایک چارپائی پر خستہ حال کمرے میں لیٹی تھی اور اپنے ماضی اور حال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

مصیبت جب آتی ہے تو جان، مال، عزت، آبرو سب اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے ایسا ہی کچھ ان کے خاندان کے ساتھ بھی ہوا۔ عظیم احمد کی ڈیڈ باڈی کسی رشتے دار نے اسپتال میں دیکھی تو گاؤں میں اطلاع کر دی گئی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں تھا اور کیا حادثہ اس کے ساتھ پیش آیا۔ عظیم کی ڈیڈ باڈی کو اسپتال سے جب لایا گیا تو اس کا جسم گولیوں سے بری طرح چھلنی ہو چکا تھا۔ اسپتال والوں نے یہی بتایا کہ وہ انتہائی زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا اور ابتدائی طبی امداد دینے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا لیکن عظیم کو کس نے مارا؟ سب لوگوں کے لیے یہ ایک سوال تھا۔ پولیس کے پاس پہلے ہی اس کے خلاف فراڈ کا مقدمہ درج تھا اور اسے مفرور قرار دیا گیا تھا۔ آزر کو باپ کی موت کی اطلاع دی گئی تو اسے مجبوراً پاکستان آنا پڑا کیونکہ ماں نے اسے رو رو کر پاکستان آنے کو کہا تھا۔ کوئی اور حالات ہوتے تو شاید وہ نہ آتا مگر اب اسے مجبوراً آنا پڑا تھا۔

تدفین کے بعد آزر گاؤں سے جانا چاہتا تھا مگر اس کے دادا اور دادی نے اسے زبردستی روک لیا۔ اس کے لیے گاؤں میں رکنا ایک عذاب تھا مگر ماں کے کہنے پر مشکل سے دو دن ہی رہا اور اپنے شہر والے گھر چلا گیا۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ ابھی کا دروازہ کھولنا تھا کہ اسے ہر طرف حمنہ کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے گھبرا کر دیواروں کی طرف دیکھا تو ہر طرف یمنیٰ کی گھورتی ہوئی آنکھیں دکھائی دینے لگیں۔ اس نے گھبرا کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور نیچے لاؤنج میں آ گیا۔ اسے کسی بھی کمرے میں جاتے ہوئے انتہائی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ وہیں لاؤنج میں ہی صوفے پر نیم دراز ہو گیا مگر جونہی اس نے آنکھیں بند کیں تو اسے یمنیٰ کی دھمکی سرگوشیوں میں سنائی دینے لگی۔

''تم دنیا کے جس کونے میں بھی جاؤ گے۔ میرا سایہ تمہارے تعاقب میں رہے گا۔'' آزر گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اسے گھر کے در و دیوار سے عجیب طرح کی وحشت اور خوف محسوس ہونے لگا۔ اچانک ڈور بیل بجی تو وہ چونک کر کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اس کے باپ کا بزنس پارٹنر ملک شعیب پولیس کے ہمراہ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ آزر ہڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگا۔

''انکل آپ؟'' آزر نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

''خبردار، تم نے مجھے انکل کہا۔ تمہارے گھٹیا اور خبیث باپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ کوئی دشمن بھی اپنے دشمن کے ساتھ نہیں کرتا مگر اس میں تو کوئی انسانیت تھی اور نہ ہی کوئی اخلاقیات...... میرا سب کچھ لوٹ کر اس نے مجھے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ اب تمہیں اپنے باپ کے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔'' ملک شعیب نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''میں...... مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' آزر گھبرا کر بولا۔

''تم اس کی ہی اولاد ہو ناں جس نے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کرنے کی کوشش کی اگر میرے پاس ثبوت نہ ہوتے تو آج میں گلیوں میں کوڑا اٹھا رہا ہوتا...... لیکن اب یہ کام تم کرو گے۔ اس گھر پر میرا قبضہ ہے۔ صرف گھر ہی نہیں...... اس گھر کی ہر، ہر شے میری ملکیت ہے تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔'' ملک شعیب غصے میں نہ جانے کیا، کیا کہہ رہا تھا۔

''نہیں، یہ میرا گھر ہے اور میں آپ کو یہ ہرگز نہیں لینے دوں گا۔'' آزر نے بھی غصے سے کہا۔

''یہ کورٹ کا فیصلہ ہے...... مرنے سے پہلے آپ کے والد اپنا سب کچھ ان کے نام کر گئے ہیں، یہ گھر...... اس کی ساری چیزیں، گاڑی، بینک بیلنس اور یہ رہے سرکاری کاغذات۔'' ایک پولیس والے نے اسے کاغذات دکھاتے ہوئے کہا تو آزر

نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ کاغذات کھول کر دیکھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

''نہیں...... یہ...... یہ...... نہیں ہو سکتا۔'' وہ بڑبڑایا اور عجیب ہونق نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اسے دھکے دے کر یہاں سے باہر نکالو پھر اسے یقین آئے گا کہ اس کے ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' ملک شعیب نے انسپکٹر سے کہا تو اس نے آزر کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالنا چاہا جبھی وہ مشتعل ہو گیا اور ملک شعیب کو مارنے کو لپکا۔ ایک پولیس کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر اس قدر زور کا تھپڑ لگایا کہ آزر کا دماغ گھوم گیا۔ وہ بے انتہا مشتعل ہو کر اسی انسپکٹر پر چڑھ دوڑا۔

''گھٹیا باپ کی گھٹیا اولاد...... ذلیل۔ تم لوگوں کے خون میں ہی ناپاکی ہے...... دھوکے باز...... فراڈیے۔'' ملک شعیب نے بھی اسے دو تین تھپڑ لگائے اور اسے دھکے دیتا ہوا گیٹ تک لے گیا۔ چوکیدار حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ ملک شعیب نے اسے گیٹ سے باہر زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ آج اس کا غرور خاک میں ملا تھا۔ کسی کا بدلہ کسی اور نے لیا تھا۔ یہی اللہ کا قانون ہے، اسی دنیا میں اللہ کے بندوں کے ساتھ کی گئی زیادتی کا صلہ مل جاتا ہے مگر انسان realize ہی نہیں کرتا۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی جانب بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

جمال احمد گاؤں میں ایک بہت بڑے مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھنے جا رہے تھے اور انہوں نے ایمن کو ساری بات بتا کر ساتھ چلنے کو کہا تو ایمن بری طرح شپٹا گئیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی تھیں کہ یمنیٰ کو گاؤں میں اماں جی نے اپنے پاس اس کے رشتے کے لیے روک رکھا ہے مگر وہاں اس کے رکنے کا اصل مقصد کیا تھا اب انہیں معلوم ہوا تھا یہ سن کر وہ انتہائی مشتعل ہو گئیں۔

"جمال! آپ جانتے ہیں آپ کیا کرنے جارہے ہیں؟ اسے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھانے کے بعد اب آپ اسے ملانی بنانا چاہتے ہیں؟ اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو پھر اسے اسکول اور کالج میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ایمن! تمہیں کس بات پر اعتراض ہے۔ کیا اس کے قرآن سیکھنے اور مدرسہ بنانے پر یا پھر اس کا سوشل سیٹ اپ چینج ہونے پر؟" جمال صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"دونوں باتوں پر۔" ایمن نے خفگی سے بس اتنا ہی کہا۔

"دیکھو وہ ایک اچھا کام کرنے جارہی ہے اور ہمیں اسے فل سپورٹ کرنا چاہیے۔" جمال صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اس کے نتائج جانتے ہیں۔ اس طرح کے سیٹ اپ کے بعد کوئی بھی آؤٹ اسٹینڈنگ فیملی اسے قبول نہیں کرے گی۔ آج کل لوگ ماڈرن اور گرومڈ لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ مذہبی لڑکیاں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں ان سے شادیاں کرتے ہوئے لڑکے بھی ہچکچاتے ہیں اور ان کی فیملیز بھی۔ شکل صورت یمنیٰ کی پہلے ہی نارمل ہے اوپر سے آپ اسے مذہبی وضع قطع دے کر بالکل ہی ناقابل برداشت بنا رہے ہیں...... اگر کل کو اس کی شادی نہیں ہوتی تو ہم سب کے لیے وہ ایک آزمائش بن جائے گی۔" ایمن نے انتہائی مایوس لہجے میں کہا۔

"ایمن! میں نے اتنا عرصہ تم سے اسی لیے یہ بات چھپائے رکھی کہ تم یونہی مایوسی کی باتیں کرو گی۔ اللہ تعالیٰ انسان کا نصیب اس کی شکل صورت دیکھ کر نہیں بناتا۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی خوب صورت عورت کو کبھی طلاق نہ ہو...... لیکن یہ سب قدرت کے فیصلے ہیں اور یمنیٰ کی شکل صورت کو تم معمولی سمجھتی ہو۔ معلوم نہیں خدا کو اسی رنگ روپ اسی حلیے میں وہ کتنی عزیز ہو...... اور ویسے بھی یمنیٰ کا اچھا یا برا نصیب ہمارے ہاتھ میں نہیں اور یمنیٰ جو کچھ کرنے جارہی ہے یہ میرے فیصلے سے نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے سب کچھ ہو رہا ہے۔" ایمن حیرت سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ "یمنیٰ نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اماں جی کے گھر سے نکل کر ایک بہت بڑے مدرسے میں جاکر بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہے اور تم تو اس کے خوابوں کے بارے میں جانتی ہو وہ کتنے سچ ثابت ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے اور ان میں ضرور کوئی اشارہ بھی ہوتا ہے۔ یمنیٰ نے قاری صاحب سے بات کی تو انہوں نے اسے فوراً گاؤں جاکر تعلیم حاصل کرنے کو کہا تو اس لیے میں اسے اماں جی کے پاس گاؤں چھوڑ آیا اور وہاں اس نے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کی ہے۔ میں نے اور اماں جی نے بہت سوچ سمجھ کر اور اس کے اندر ان صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ اب ماشاء اللہ وہ کافی حد تک سیکھ بھی چکی ہے اور مدرسہ مکمل ہونے تک وہ ان دینی علوم میں کافی مہارت بھی حاصل کرلے گی اور یوں اس کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ ایمن ایسے نیک کاموں کی توفیق ہر کسی کو نہیں ملتی۔ یہ بہت سعادت کی بات ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے کسی کسی کو عطا کرتا ہے۔" جمال احمد ان پر گویا انکشاف کر رہے تھے اور وہ حیرت سے سب کچھ سن رہی تھیں۔

"اور یمنیٰ کے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے تم اور میں اسے نہ بڑھا سکتے ہیں اور نہ کم کر سکتے ہیں۔ بات اپنے، اپنے ایمان اور یقین کی ہوتی ہے۔ اس لیے تم اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقینِ کامل رکھو وہ اپنے بندے کے لیے جو بہتر سمجھتا ہے اسے عطا کرتا ہے اور جب کسی سے کچھ چھینتا ہے تو اس میں بھی اس کی حکمت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی بیٹی پر فخر ہونا چاہیے نہ کہ یوں پریشان۔" جمال صاحب نے انہیں نرمی سے سمجھایا

تو ایمن کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ اثبات میں سر ہلاکر رہ گئیں۔

"یاد رکھو اولاد کے لیے سب سے بڑی سپورٹ والدین کی ہوتی ہے اور جب والدین اولاد پر یقین کرکے ان کا پورا ساتھ دیتے ہیں تو ایسی اولاد کوئی نہ کوئی اچھا کارنامہ ضرور انجام دیتی ہے۔ یمنیٰ کو بھی ہماری سپورٹ کی ضرورت ہے۔ اب اٹھو اور تیار ہو جاؤ اور خوشی، خوشی اس کے اس نیک کام میں شامل ہونا۔ کوئی ایسی منفی بات نہ کرنا جو اس کی فیلنگز ہرٹ کرے۔" جمال صاحب نے محبت سے انہیں سمجھایا تو وہ مطمئن ہوگئیں۔

☆☆☆

گاؤں میں حویلی کے قریب ہی ایک بہت بڑی اور کھلی جگہ پر مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اماں جی، یمنیٰ، جمال احمد، ایمن اور مولوی رحمت اللہ کے علاوہ گاؤں کی بہت سی مذہبی معزز شخصیات وہاں موجود تھیں۔ یمنیٰ نے شلوار قمیص کے اوپر بہت بڑی چادر کے ساتھ اپنا آپ اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ایمن تو اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔ وہ ماڈرن حلیے میں کٹے بالوں کے ساتھ پھر بھی کسی حد تک قابلِ قبول لگتی تھی مگر اب سفید چادر میں اس کی سیاہ رنگت اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ ایمن کو ایک دم دھچکا لگا مگر وہ خاموش رہیں۔ اماں جی اور جمال صاحب بہت زیادہ خوش تھے مگر ایمن چپ چپ سی تھیں۔ سب نے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد دعائے خیر کی۔ اماں جی نے یمنیٰ کو پھولوں کے ہار پہنا کر مبارک باد دی۔ جمال صاحب بھی بہت زیادہ خوش تھے اور گاؤں کے دیگر لوگ بھی ان کی اور یمنیٰ کی بہت تعریفیں کر رہے تھے جو گاؤں میں لڑکیوں کے لیے ایک اعلیٰ معیار کا مدرسہ تعمیر کرنے جارہے تھے۔ اماں جی نے ایمن کو بھی ہار پہنایا اور مبارک باد دی تو انہوں نے خاموشی سے ہار اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ

لیا۔ دعا کے بعد سب لوگوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی اور اس کے بعد سب لوگ خوشی، خوشی واپس آ گئے مگر ایمن کی آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا۔ وہ یمنیٰ کو دیکھتیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتیں۔

''ایمن کیا تم یمنیٰ بیٹی کی اس کامیابی پر خوش نہیں ہو؟'' اماں جی نے بالآخر اُن کی طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''بہت خوش ہوں۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور اٹھ کر اس جگہ سے چلی گئیں۔ اماں جی نے حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''ایمن کچھ پریشان لگ رہی ہے جمال، کیا بات ہے؟'' اماں جی نے ان سے پوچھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

''دراصل اسے یمنیٰ کے مستقبل کی فکر لگی ہوئی ہے۔''

''کیا تم نے اسے سمجھایا نہیں؟'' اماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ صرف بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی ہے...... اور ماؤں کو سب سے بڑی فکر بیٹیوں کے گھر بسانے کی ہوتی ہے۔ میں اسے بہت سمجھا چکا ہوں مگر اس کا خیال ہے کہ ایسی مذہبی لڑکی کا رشتہ کسی اچھے گھرانے میں نہیں ہوگا۔'' جمال صاحب نے بیوی کا خدشہ ان کے سامنے بیان کیا۔

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی...... کسی کے نصیب کا اس کے حلیے اور کپڑوں سے کیا تعلق؟ ایمن اتنی بے وقوف ہوگی یقین نہیں آ رہا...... ہر بچے کا نصیب ماں کے پیٹ میں لکھا جاتا ہے تب وہ کہاں کا تعلیم یافتہ یا ماڈرن ہوتا ہے۔ خیر تم اسے چھوڑو...... اس کی اپنی سوچ ہے لیکن میں یمنیٰ سے بہت خوش ہوں۔ یقین مانو...... پہلے تو مجھے بھی اندیشے تھے کہ نہ جانے یمنیٰ کچھ سیکھ بھی پائے گی یا نہیں لیکن مولوی رحمت اللہ نے بہت توجہ سے اسے قرآن پاک کی تعلیم دی ہے۔ بلکہ وہ تو اس کے لیے کوئی ماہر استاد مقرر کرنے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے خود بھی یمنیٰ سے قرآن پاک سنا ہے ماشاء اللہ اس میں واقعی خداداد صلاحیت ہے۔ اللہ نے اسے اپنے خاص کرم سے نوازا ہے۔ اس لیے اب میں بہت پُرامید بھی ہوں اور خوش بھی۔'' اماں جی نے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

''میں شہر جاتے ہی کسی عالم فاضل استاد کا بندوبست کرتا ہوں اور اس مدرسے کو شہر کے کسی ماڈرن اور جدید آلات سے لیس اعلیٰ اسٹینڈرڈ کے مدرسوں سے کم نہیں بناؤں گا۔'' جمال صاحب نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''اللہ تمہیں بھی جزا دے اور میری بچی کو بھی...... کسی ایک کو صحیح معنوں میں تعلیم دینے سے اس کی نسلیں سنور جاتی ہیں اور یہ بہت بڑی نیکی ہے۔'' اماں جی نے مسکرا کر کہا۔

''انشاء اللہ...... میں پوری کوشش کروں گا اور آپ بھی دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔''

''آمین۔'' اماں جی نے بیٹے کی بات پر دل سے دعا دی تو دونوں مسکرا دیے۔

☆☆☆

آزر انتہائی پریشان حال ایک دکان پر کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے انتہائی گندے تھے اور شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ گھر سے دھکے کھا کر نکلنے کے بعد وہ مارا مارا پھر رہا تھا کبھی کسی چھپر ہوٹل میں سو گیا کبھی کہیں...... اتفاق سے اس کا موبائل اس کے پاس ہی تھا اب اس نے وہ مہنگا موبائل بیچ کر سستا سا موبائل لے لیا تھا اور اب جواد کو مسلسل فون ملا رہا تھا مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جبھی اس نے دکاندار سے اسی کی دکان پر نوکری کی بات کی۔

''پہلے یہ بتاؤ بھائی تم کہاں سے آئے ہو؟ میں دو تین دن سے یہیں گھومتے پھرتے تمہیں دیکھ رہا

ہوں، کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟''

''میں بہت پریشان ہوں، میرا گھر بار سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب بس یہی ایک دوست کا آسرا ہے اور اس سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔'' آزر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''پڑھے لکھے لگتے ہو، کہیں اور نوکری کر لو کیونکہ میرے پاس تو گنجائش نہیں، چھوٹی سی دکان ہے۔ ہاں یہاں آگے جا کر ایک فیکٹری ہے، سنا ہے اس کا مالک بہت اچھا آدمی ہے بے روزگار پڑھے لکھے نوجوانوں کی بہت مدد کرتا ہے تم اس کے پاس جا کر دیکھو ممکن ہے وہ تمہاری مدد کر دے۔'' دکاندار نے کہا۔

''مدد......؟'' آزر زیرِ لب بڑبڑایا۔

''ہاں...... تمہیں اب کسی ہمدرد انسان کی مدد کی ہی ضرورت ہے، یوں پریشان ہو کر اِدھر اُدھر پھرنے کے بجائے کیا یہ ٹھیک نہیں کہ تم کوئی نوکری کر لو پھر تمہیں دوست سے مدد لینے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔'' اس نے کہا تو آزر سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟ ڈوبتے ہوئے کے لیے تو تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا ہوتا ہے، تم بھی اسے سہارا سمجھ کر اس کے پاس چلے جاؤ۔'' دکاندار نے اسے راستہ سمجھاتے ہوئے کہا تو آزر خاموشی سے وہاں سے بوجھل قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ جب اس نے حمنہ کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا تھا اس کے بعد سے مسلسل اس کی اذیتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ تنہائی میں بھی بیٹھ کر سوچتا تو اسے خود شدید دکھ کا احساس ہوتا کہ اس نے حمنہ جیسی اچھی اور نیک لڑکی کے ساتھ برا کیا۔ وہ تو یمنیٰ سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اس نے بہت پلاننگ کے ساتھ یمنیٰ کو گھر بلایا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یمنیٰ اپنی جگہ حمنہ کو بھیج دے گی اور وہ اتنا مدہوش تھا کہ بغیر دیکھے، سمجھے اس نے اپنے انتقام کی آگ حمنہ سے بجھالی۔ حمنہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اسے خدا اور رسولؐ کے واسطے دیتی رہی مگر اس وقت تو وہ شیطان بنا ہوا تھا اور آج قدرت اسے اپنے کرشمے دکھا رہی تھی مگر اس صورتِ حال پر وہ خدا سے کوئی شکوہ نہیں کر رہا تھا...... اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ اسی قابل ہے، وہ بہت لوگوں کا گنہگار ہے۔ یمنیٰ، حمنہ، نینشا اور نہ جانے کس، کس کا...... اب اس کی سزا کا عمل شروع ہو چکا تھا اور یہ عمل نہ جانے کتنا طویل ہوگا وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ آہیں بھرتا ہوا فیکٹری کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اِک حسرت بھری نگاہ سے عمارت کو دیکھنے لگا کبھی اس کے باپ کی بھی اپنی فیکٹری تھی جو اب دوسروں کے قبضے میں تھی، چوکیدار کو اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتا کر وہ اندر چلا گیا۔ فیکٹری کی طرف جانے سے پہلے اس نے اپنا منہ ہاتھ اچھی طرح دھو لیا تھا اور بظاہر اپنا حلیہ قابلِ قبول بنا لیا تھا جبھی چوکیدار نے بھی آگے جانے دیا۔ اتفاق سے فیکٹری کا مالک اسی وقت گاڑی سے اترا تھا اس نے ایک نوجوان کو اس طرح آتے دیکھا تو سیکرٹری سے کہہ کر سیدھا اپنے آفس میں بلوا لیا۔ رانا دلاور حسین انتہائی ڈیسنٹ آدمی تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا متناسب جسم، دراز قد، گرے فرنچ کٹ ڈاڑھی اور سفیدی مائل بالوں کے ساتھ بہت سوبر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سنہری فریم کی نظر کی عینک لگا رکھی تھی اور بڑے اسٹائل سے پائپ پی رہا تھا۔ اس نے ایک ٹک آزر کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟''

''آ...... آزر عظیم۔'' آزر نے اپنا نام بتاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا سحر تھا کہ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔

''آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ کے اندر کسی گلٹ کا احساس ہے، آپ آنکھیں اٹھاتے ہیں

اور فوراً جھکا لیتے ہیں۔ کیا بات ہے؟" رانا دلاور نے پھر پوچھا تو آزر بری طرح ہڑبڑا گیا۔

"ن...... نن...... نہیں۔" اس نے بہ مشکل جواب دیا۔

رانا دلاور خاموشی سے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پائپ کے گہرے کش لگاتا رہا اور آزر اس کے یوں دیکھنے پر پسینے پسینے ہونے لگا۔ اسے انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح رانا صاحب کے آفس سے بھاگ جائے۔ اسے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

"آپ ڈر کیوں رہے ہیں؟ میں کوئی پولیس مین تو نہیں۔" رانا دلاور بولا تو آزر مزید گھبرا گیا۔

"آپ بہت زیادہ مینٹلی ڈسٹربڈ ہیں... شاید جاب سے زیادہ آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔ کسی قسم کی بھی ذہنی اذیت انسان کو کسی پل سکون نہیں لینے دیتی...... سکون تب ہی ملتا ہے جب اندر سے گلٹ کا احساس ختم ہوتا ہے یا پھر......؟" وہ اتنا کہہ کر رکا اور آزر کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ آزر بے انتہا خوفزدہ ہو گیا۔

"پھر...... کیا......؟" نادانستہ اس کے منہ سے نکلا۔

"پھر...... یہ...... کہ جس کی وجہ سے گلٹ پیدا ہوا ہے اس سے معافی مانگ لی جائے۔" رانا دلاور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور اگر وہ موجود نہیں ہو تو......؟" نادانستہ آزر کے منہ سے پھر نکلا۔

"تو پھر...... خدا سے معافی مانگنی چاہیے۔"

"خدا ہی تو معاف نہیں کرتا۔" اس نے بہ مشکل کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...... رانا بغور اس کی جانب دیکھتا رہا اور پھر اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔

"گناہ کے مطابق معافی مانگیں، جتنا بڑا گناہ...... اتنی بڑی سزا...... تاوان تو ہر صورت دینا پڑتا ہے اور آپ کا گناہ بھی تو کوئی معمولی نہیں تھا۔" رانا کی اس بات پر وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔

"آپ...... ک...... کیسے؟" وہ بوکھلا کر بولا۔

"میرا علم بتا رہا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"ک...... ک...... کیسا علم......؟" وہ پہلی بار کسی ایسے شخص سے مل رہا تھا جو سیدھا اس کے دل تک پہنچ رہا تھا آزر حیران ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں...... بس فیس ریڈنگ کرتا ہوں۔" اس نے جلدی سے بات گول کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو آزر حیرت سے دیکھنے لگا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص کس طرح اتنی آسانی سے کسی دوسرے کے دل و دماغ تک پہنچ سکتا ہے۔ آزر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کل سے جاب پر آ سکتے ہیں۔" رانا دلاور نے کہا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیسی جاب؟" اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا کیونکہ اس نے نہ تو اس کی تعلیم پوچھی تھی اور نہ ہی کسی قسم کا انٹرویو لیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ میرے پاس جاب کے لیے ہی آئے تھے اور میں اس وقت سے آپ کے ساتھ جو باتیں کر رہا ہوں وہ آپ کا انٹرویو ہی تو ہے۔ آپ میرے منیجر سے مل لیں جہاں وہ آپ کو مناسب سمجھیں گے۔ ایڈجسٹ کر دیں گے۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ۔" وہ آہستہ آواز میں بولا اور اٹھ کر آفس سے باہر جانے لگا تو رانا نے پیچھے سے آواز دی۔

"اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کریں۔" اس کے یوں کہنے پر آزر نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

رانا دلاور حسین سے ملنے کے بعد اس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اسے جاب ملنے کی خوشی نہیں تھی۔ اسے تو اپنی چوری پکڑے جانے اور گناہ کے احساس نے اتنا پریشان کر دیا تھا کہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... وہ منیجر سے ملنے کے بجائے فیکٹری سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یمنیٰ اپنی زندگی میں بہت مصروف ہو گئی تھی۔ جمال صاحب نے اس کے لیے ایک پروفیسر صاحب کو خصوصی طور پر شہر سے بھجوایا تھا جو اسلامی علوم کے ساتھ دیگر علوم میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کا اپنی فیلڈ میں بہت زیادہ نام تھا۔ پروفیسر خلیل الرحمٰن قدرے ادھیڑ عمر کے انتہائی شفیق انسان تھے۔ انہوں نے یمنیٰ کو خصوصی توجہ سے پڑھانا شروع کیا تو یمنیٰ کی سوچ میں بھی نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ مولوی رحمت اللہ سے جن سوالوں کے جوابات نہ پا کر وہ کچھ مضطرب رہتی تھی...... اب ان کے تسلی بخش جوابات پا کر بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی...... پروفیسر صاحب یمنیٰ جیسی لائق اور ذہین اسٹوڈنٹ کو پڑھا کر بہت خوش ہوتے تھے جو اُن سے ایسے ایسے سوالات کرتی تھی جو اکثر ان کو بھی چونکا دیتے تھے اور ان کے جوابات دینے کے لیے انہیں اکثر کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا...... اور نیٹ پر ریسرچ بھی کرنی پڑتی تھی...... اور اکثر اس ریسرچ میں وہ یمنیٰ کو بھی شامل کرتے تھے...... اور جب اپنی، اپنی ریسرچ پر ڈسکشن کرتے تو انہیں مزید سوچنے کے لیے پوائنٹس ملتے...... یمنیٰ زیادہ وقت اپنی کتابوں اور ریسرچ میں بزی رہتی۔ تھک ہار کر جب وہ اپنے بستر پر جاتی تو اسے آزر اور حمنہ کا خیال آ جاتا تھا، حمنہ کو یاد کر کر کے اس کی آنکھیں بھرنے لگتیں اور دکھ کا گہرا احساس اسے مضطرب کرنے لگتا۔

"حمنہ تم مت سمجھنا، میں تمہیں کبھی بھول پاؤں گی۔ تم تو ایک سنہری یاد کی طرح میرے اندر زندہ رہو گی میں اس شخص کو ہرگز معاف نہیں کروں گی جس نے تم سے تمہاری عزت اور زندگی چھینی...... خدا کرے وہ کبھی سکون سے نہ رہے، اس کی زندگی کا ایک، ایک لمحہ ایسی اذیت سے پُر ہو جو اسے ہر لمحہ تمہاری یاد دلاتا رہے۔" وہ بے انتہا افسردہ ہو جاتی۔

☆☆☆

آزر نے اسی دکاندار شاہد کو آ کر اپنی جاب کے بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوا مگر آزر کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا تھا اور وہ ہر بات کے بعد ایک دم خاموش ہو جاتا...... شاہد اس کی طرف بغور دیکھتا۔

"یار...... اس فیکٹری کے مالک کی ہر طرف دھوم مچی ہے، کہتے ہیں بہت ہی نیک اور پہنچا ہوا انسان ہے سب کے لیے اور بالخصوص نوجوانوں کے لیے بہت ہمدردی رکھتا ہے۔ مجھے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تمہیں وہ کیسا لگا؟" اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"ہاں، لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔" آزر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"سن اب تو کہاں رہے گا؟" شاہد نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" آزر نے مایوسی سے کہا۔

"یہ سڑک کے ساتھ گلی میں ایک کمرا کرایے پر خالی ہے۔ اس کا مالک ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پاس ہی آیا تھا۔ وہ اس کمرے کو کرایہ پر دینا چاہتا ہے، تم وہ لے لو۔" اس نے اسے رائے دی۔

"ٹھیک ہے۔" آزر نے کہا تو شاہد اسے لے کر گلی میں چلا گیا اور مالک کے ہمراہ اسے کمرا دکھایا تو آزر بری طرح چونک گیا۔ انتہائی خستہ حال اور سیلن زدہ کمرا تھا جس کی دیواروں سے چونے کے کھرپے اترے ہوئے تھے۔ فرش بھی ٹوٹا پھوٹا اور چھت لکڑی کے شہتیروں سے بنی تھی۔ جن میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ آزر ایک دم دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"کمرا تو بہت اچھا ہے۔" شاہد نے کہا تو آزر نے ایک دم اس کی جانب دیکھا پر خاموش رہا...... مالک بھی کمرے کی تعریفیں کرنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، کمرا ٹھیک ہے ناں؟" شاہد نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" آزر نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، آپ میرے دوست کو چار پائی اور بستر بھی دے دیں۔"

"لیکن چار پائی اور بستر کے پیسے علیحدہ ہوں گے۔" مالک نے قدرے بے رخی سے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... کوئی بات نہیں...... اب میرے یار کی نوکری لگ گئی ہے۔ جتنے پیسے کہو گے وہ دے دے گا۔"

"میں ابھی چار پائی لاتا ہوں۔" مالک کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یار تو خوش قسمت ہے، آج نوکری بھی مل گئی اور رہنے کی جگہ بھی ویسے اس علاقے میں گھر ملنا بہت مشکل ہے۔" شاہد تعریفیں کرنے لگا اور آزر بے بسی سے کمرے کی خستہ حالی دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کی چار پائی اور خستہ حال میلا کچیلا بستر آ گیا۔ مالک نے اسے بچھایا اور آزر کے حوالے کر کے دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے میں 60 واٹ کا بلب جل رہا تھا...... ہر طرف سیلن کی بدبو۔ اس پورے کمرے سے تو بڑا اس کا واش روم تھا اور وہ بھی خوب صورت ٹائلوں سے مزین...... اور جدید سامان سے آراستہ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تو حمنہ کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حمنہ کی چیخیں بلند تر ہونے لگیں...... خوف و ہراس سے اس کی آنکھیں باہر نکلنے کو بے

تاب تھیں۔ اس کی گھبراہٹ پر یمنیٰ قہقہے لگانے لگی ہر دیوار پر یمنیٰ قہقہے لگا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھ اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ اتنا خوفزدہ ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر بھاگا۔ کچے صحن م پڑی اینٹ سے اس کا پاؤں بری طرح ٹکرایا اور منہ کے بل گرا...... دیوار کے ساتھ کھڑا لکڑی کا تختہ ا کے اوپر گرا اور وہ بری طرح چلانے لگا...... اس چیخیں سن کر مالک مکان چھت پر سے آیا اور لکڑی تختہ اٹھا کر اسے نیچے سے نکالا...... وہ بری طرح ز ہوگیا تھا، وہ اسے کمرے میں لے جانے لگا تو آ چلانے لگا۔

"نہیں، نہیں...... میں اندر نہیں جاؤں گا۔ اندر وہ ہے...... اندر......"

"کون...... یہاں کوئی بھی نہیں...... باؤ... خوامخواہ میرے گھر کو بدنام نہ کر۔ چل نکل یہ سے...... ایویں شور مچا رہا ہے۔ تو، تو چلا جائے گا اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا۔ جا یہاں۔ بھاگ۔" مالک نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

رات گہری ہو رہی تھی اور آزر خاموش ور سڑک پر اسی دکان کے پھٹے پر بیٹھا رو رہا تھا۔

"گناہ کے مطابق معافی مانگیں...... جتن گناہ...... اتنی بڑی سزا، تاوان تو ہر صورت میں پڑتا ہے اور آپ کا گناہ بھی تو معمولی نہیں تھا۔" صاحب کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو اسے بار بار دھکے کھا کر ذلت اور رسوائی کا کیوں کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

"وہ...... وہ...... صاحب جی نے ہمیں مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔" زرینہ نے ہچکیاں کر بتایا تو فہام کی آنکھوں میں ایک دم خون اتر آ

"کیوں......؟" فہام نے غصے سے پو

زرینہ روتے روتے اسے ساری بات سنانے لگی...... فہام غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا...... وہ ردا کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں گیا...... اور اپنی دراز سے فور آ ریوالور نکال کر لاؤنج میں آیا۔

"آج میں روحیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس گھٹیا انسان نے میری بہن پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس کی اتنی جرأت...... ہم نے اپنی بہن کو کبھی ڈانٹا تک نہیں اور اس نے اسے مارا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"خدا کے لیے فہام...... اتنے غصے میں مت آؤ......" خدیجہ بیگم نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"مما...... میں...... اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے کیا سمجھا ہے کہ ردا کے پیچھے کوئی نہیں۔" فہام غصے سے چلایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ شمیلہ اور ردا روتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگیں مگر وہ اپنے آپ کو چھڑواتا گاڑی میں بیٹھ کر فوراً نکل گیا۔

☆☆☆

روحیل دونوں کو گھر سے باہر نکال کر انتہائی غصے میں پاؤں پٹختا ہوا اماں جی کے کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ اشتعال سے سرخ ہو رہا تھا اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ ماں جی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم ردا کو کہاں لے گئے، کیا کیا اس کے ساتھ......؟" ماں جی نے نہایت غصے سے اس سے پوچھا۔

"میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔" اس نے اسی غصے کے عالم میں جواب دیا۔

"ک...... ک...... کیا؟ تم نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ تمہیں ذرا سا بھی خدا کا خوف نہیں آیا؟" ماں جی نے انتہائی طیش سے کہا۔ وہ اپنا درد اور تکلیف ایک دم بھول گئیں۔

"خوف مجھے نہیں...... اسے نہیں آیا۔ آپ کو

اس حالت میں چھوڑ کر وہ ماں کے گھر چلی گئی تھی۔" روحیل غصے سے بڑبڑایا۔

"کون سی قیامت آگئی، تم نے اتنی معمولی سی بات پر اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا۔" ماں جی شدید پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"اتنی سی بات، آپ کی ٹانگ میں دوبارہ چوٹ آگئی ہے اور وہ کچن میں کھانے میں مصروف تھی۔"

"میں مر تو نہیں گئی تھی۔ تم نے اس معصوم بچی کے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" ماں جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مجھے صرف آپ کی فکر ہے۔ میں فضیلت ممانی کو فون کرتا ہوں اور ہم آپ کو لے کر ابھی اسپتال چلتے ہیں۔" روحیل غصے سے بولتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"روحیل یہ تم نے کیا کر دیا؟" ماں جی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

☆☆☆

فہام انتہائی غصے کے عالم میں گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک سفید گاڑی نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ گاڑی بار بار اسے خطرناک انداز میں اوورٹیک کر رہی تھی۔ فہام نے پہلے تو کوئی نوٹس نہیں لیا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی میں بیٹھے لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں۔ فہام نے جلدی سے اپنا موبائل نکال کر حیدر کا نمبر ملایا۔

"بولو فہام، کیا بات ہے؟" حیدر نے جلدی سے پوچھا۔

"حیدر ایک گاڑی مسلسل میرا پیچھا کر رہی ہے۔"

"اس وقت تم کس علاقے میں ہو؟" حیدر نے جلدی سے پوچھا تو فہام اسے بتانے لگا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں اس علاقے کی پولیس کو الرٹ کر دیتا ہوں۔" حیدر نے اسے اطمینان دلایا۔

کچھ فاصلے پر جا کر اس کی گاڑی پر فائرنگ ہونے لگی۔ فہام گھبرا گیا اور اپنی ریوالور نکال کر وہ بھی جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک دم گاڑی تیزی سے اس کے قریب آئی اس میں چار نقاب پوش آدمی بیٹھے تھے۔ فہام کی گاڑی جب اُن کے پاس سے گزرنے لگی تو اُن سب نے اس پر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی فہام کے سینے میں لگی اور ایک اس کے سر پر۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے سر اور سینے سے خون انتہائی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ فہام کا موبائل بجتے بجتے خاموش ہو گیا تھا۔ پولیس کی گاڑی ایک جانب سے نمودار ہوئی اور اس گاڑی کا پیچھا کرنے لگی جس سے فہام پر فائرنگ ہوئی تھی پھر باقاعدہ پولیس مقابلہ ہوا اور وہ لوگ مارے گئے۔

''سر فرحان نامی مفرور بھی اپنے گینگ کے ساتھ اس مقابلے میں مارا گیا ہے اور...... اور فہام صاحب بھی......'' پولیس اہلکار نے وائرلیس پر حیدر کو اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔

''اوہ...... تو......'' حیدر نے شاک کے عالم میں کہا اور ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنے آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

فہام کے گھر سے جانے کے بعد شمیلہ کو ساس اور نند پر چڑھائی کرنے کا بھرپور موقع مل گیا۔

''اگر میرے فہام کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' شمیلہ نے ردا کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔

''کیا فہام صرف تمہارا شوہر ہے، ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ خبردار جو فضول باتیں کیں۔'' خدیجہ بیگم نے خفگی سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو ردا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''حاتم کو فون کرو، اس سے کہو جلدی سے روحیل کی طرف جائے اور فہام کو جھگڑنے سے روکے۔'' خدیجہ بیگم نے گھبرا کر کہا تو ردا کانپتے ہاتھوں سے بھائی کا نمبر ملانے لگی۔ کافی زیادہ بیلز کے باوجود بھی حاتم نے فون نہیں اٹھایا۔

''مما، حاتم بھائی فون نہیں اٹھا رہے۔'' ردا نے پریشانی سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یا خدایا! میرے بچوں پر رحم فرما، میں کیا کروں؟'' خدیجہ بیگم دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے فہام کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا فون بھی بند جا رہا تھا۔

☆☆☆

حیدر علی نے حاتم کو فون کر کے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ حاتم آج ایک شپمنٹ کے سلسلے میں صبح ہی آفس چلا گیا تھا۔ اب حیدر علی، فہام کی ڈیڈ باڈی اسپتال سے کلیئر کروا کر گھر لا رہا تھا۔

ایک دم پورچ میں ایمبولینس اور پولیس جیپ کے سائرن سنائی دیے تو وہ سب قدرے گھبرائی ہوئی سائرن کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی پورچ میں لپکیں۔ حاتم کی گاڑی آگے تھی۔ اس کے پیچھے ایمبولینس اور پھر پولیس جیپ جس میں حیدر اپنے پولیس اہلکاروں سمیت بیٹھا تھا۔ گاڑیوں کے رکتے ہی حاتم اور حیدر باہر نکلے اور حاتم، حیدر کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''حاتم، پولیس یہاں کیوں آئی ہے اور فہام کہاں ہے؟'' خدیجہ بیگم نے گھبرا کر پوچھا تو حیدر نے حاتم کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''بتاؤ...... تم لوگ خاموش کیوں ہو؟'' وہ عجب انداز سے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''حاتم، فہام کہاں ہیں؟'' شمیلہ نے حاتم کا بازو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپ بتائیں، میرا فہام کہاں ہے؟'' شمیلہ نے حیدر سے پوچھا۔

''آئی ایم سوری۔'' حیدر نے ایک گہری سانس لے کر شمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے ایمبولینس سے فہام کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی۔

''یہ...... یہ...... کس کی......؟'' خدیجہ بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔

''فہام کی...... اس کا قتل ہو گیا ہے۔'' حیدر نے سر جھکا کر کہا تو شمیلہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی فہام کے قریب گئی۔

''یہ...... یہ...... میرا فہام نہیں۔'' شمیلہ نے فہام کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھتے ہوئے کہا تو خدیجہ بیگم کو ہر چیز گھومتی دکھائی دینے لگی۔

''نہیں...... نہیں میرا فہام نہیں مر سکتا۔'' وہ بری طرح چیخنے لگیں۔ ردا بھی دہاڑیں مار مار کر روتی ہوئی فہام کی ڈیڈ باڈی کے پاس گئی اور اس کے اوپر گر گئی۔

''میرے فہام بھائی مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

''ڈائن، چڑیل تو ہی میرے فہام کو کھا گئی۔ نہ تو آتی نہ فہام گھر سے باہر جاتے۔'' شمیلہ نے غصے سے ردا کا بازو پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''شمیلہ بھابی، ہوش کریں۔'' حاتم نے غصے سے چلا کر کہا۔

''فہام کو فرحان نے قتل کیا ہے۔'' حیدر نے انہیں بتایا۔

''ک...... کون...... فرحان؟'' حاتم نے چونک کر پوچھا۔

''وہی جو موبائل پر ردا کے لیے میسج کرتا تھا۔ میں نے اسے اریسٹ کر لیا تھا مگر وہ جیل سے بھاگ نکلا اور اسی نے فہام کو......'' حیدر نے بتایا تو ردا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نئے انکشاف پر اس کا سر چکرانے لگا اور وہ ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' حاتم نے جذباتی انداز میں کہا۔

عید کا دن

☆ مومن کے لیے ہر وہ دن عید ہے جس دن وہ گناہ نہ کرے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ جب تم دوسروں کے عیب کا ذکر نہ کرنا چاہو تو اپنے عیب یاد کرو۔

(حضرت ابن عباسؓ)

مرسلہ: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

''وہ بھی پولیس مقابلے میں مر چکا ہے۔'' حیدر نے مزید بتایا۔

''تو ہی میرے فہام کی قاتلہ ہے۔ وہ تیری وجہ سے ہی قتل ہوا ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' شمیلہ نے غصے سے ردا کو جھنجوڑتے ہوئے اس کا گلا دبانے کی کوشش کی۔

''شمیلہ بھابی اندر چلیں۔'' حاتم نے شمیلہ کا بازو پکڑ کر ردا کو چھڑا لیا۔

''چھوڑو مجھے، میں کسی کو نہیں چھوڑوں گی۔'' اس پر وحشت طاری تھی۔ خدیجہ بیگم حاتم کے اوپر چکرا کر گر گئیں۔

☆☆☆

روحیل کو فہام کے قتل کی اطلاع کسی دوست کے ذریعے مل چکی تھی مگر اس نے ماں جی کو نہیں بتایا اور چپکے سے گھر کا فون اور ماں جی کا موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

فہام کی میت کفن اور پھولوں میں لپٹی لاؤنج میں رکھی تھی۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ فہام جیسا اچھا اور نیک انسان کیسے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ سب کے لیے یہ سانحہ انتہائی ناقابلِ برداشت تھا۔ شمیلہ کے دماغ پر بہت گہرا اثر ہوا تھا اور اسے مسکن دوائیں دے کر سلا دیا گیا تھا۔

شمیلہ کو جیسے ہی ہوش آیا اور اسے فہام کو دفنانے

کی خبر ملی تو اس نے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ وہ بھاگ بھاگ کر ردا کی طرف جاتی اور اس کا گلا دبانے کی کوشش کرتی۔ کبھی اسے منحوس کہتی اور کبھی فہام کی قاتلہ، کبھی اسے بددعائیں دینے لگتی تو کبھی اسے جی بھر کر لعن طعن کرتی۔

فہام کے قتل اور چالیسویں تک لوگوں کا آنا جانا لگا رہا۔ روحیل بھی ماں جی کو لے کر آیا تھا مگر ردا سے کوئی بات نہیں ہوئی، وہ ابھی بھائی کے صدمے سے دوچار تھی۔ گھر میں عجیب سی فضا پیدا ہوگئی تھی جس میں دکھ بھی تھا اور انتقام بھی، صدمہ بھی تھا اور حسد و نفرت کے جذبات بھی...... ردا کے گرد زندگی کا دائرہ روز بروز تنگ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ماں جی روحیل سے بہت ناراض تھیں اور کئی روز سے اس سے بات بھی نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے اس شرط پر معاف کیا تھا کہ وہ ان کے ہمراہ ردا کے گھر اسے لینے جائے گا۔ روحیل بہت مشکل سے وہاں جانے پر رضامند ہوا تھا مگر اس کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبہ تھا۔

چالیسویں کے بعد جب وہ اور ماں جی ردا کے گھر گئے تو ردا پر اسے دیکھ کر جنون طاری ہوگیا۔

''یہی ہے میرے بھائی کا قاتل۔ اسی نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو لوٹا ہے۔ اس کو پولیس کے حوالے کردیں۔'' ردا اس کا گریبان پکڑ کر چلاتے ہوئے بولی۔

''چھوڑو مجھے، کیا بکواس کر رہی ہو؟'' روحیل نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''ردا...... ردا...... ہوش کرو۔'' خدیجہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

''مما اگر یہ شخص مجھے اس دن مار کر گھر سے نہ نکالتا تو فہام بھائی کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے اور نہ ہی مارے جاتے۔'' ردا پھر اس پر جھپٹتے ہوئے بولی۔

''شٹ اپ۔'' روحیل نے ردا کو تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے حاتم اور عاصم ان کی آواز سن کر اپنے کمروں سے انتہائی غصے کے عالم میں نکلے۔

''تمہاری یہ جرأت کہ ہماری بہن پر ہاتھ اٹھاؤ۔ ذلیل، گھٹیا انسان۔'' حاتم نے بھی روحیل کو زور سے تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

''ماں جی، میں اسی لیے یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہ گھٹیا عورت اور اس کی فیملی اس قابل ہی نہیں کہ میں یہاں آتا۔'' روحیل چہرے پر ہاتھ رکھ کر ماں جی کی طرف دیکھ کر غصے سے بولا۔

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ ہم یہاں اپنی بہو کے لیے آئے ہیں جھگڑنے نہیں۔'' ماں جی نے آرام سے کہا۔

''آپ مجھے کہہ رہی ہیں۔ اس گھٹیا عورت کو نہیں جو فساد کی جڑ ہے۔ جس نے میری زندگی بھی برباد کی ہے اور اس گھر کو بھی ماتم کدہ بنایا ہے۔'' روحیل اس کی طرف دیکھ کر چلاتے ہوئے بولا۔

''روحیل...... ردا تمہاری بیوی ہے۔'' ماں جی نے آہ بھر کر کہا۔

''نفرت ہے مجھے اس بدچلن، بدکردار اور گھٹیا عورت سے۔'' روحیل غصے سے بولا۔

''یہ...... یہ...... جھوٹ ہے، میں بدکردار ہرگز نہیں۔'' ردا گھبرا کر بولی۔

''خبردار، تم نے جو ہماری پاک دامن بہن پر کوئی الزام لگایا۔'' حاتم بھی غصے سے غرایا۔

''ابھی تمہیں ثبوت دیتا ہوں تمہاری بہن کی پاک دامنی کا۔'' روحیل یہ کہہ کر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالنے لگا۔

''یہ ہے تمہاری بہن کی بدچلنی کا تحریری ثبوت۔'' روحیل نے خط اُن کے سامنے لہرایا۔ ردا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ روحیل قدرے بلند آواز سے خط پڑھنے لگا۔

''ڈیئر ردا! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں لیکن آج میں اپنے دل کی ساری باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہنسی، تمہاری مسکراہٹ، تمہارا وجود اور تمہاری اِک، اِک ادا نے مجھے تمہارا ایسا اسیر بنا رکھا ہے کہ اب اس سے فرار ممکن نہیں۔ تم میری زندگی ہو اور میری زندگی کی آخری سانسوں تک اگر کوئی میرے دل میں بسے گا تو وہ تم ہی ہوگی، آئی لو یو ٹو مچ۔

تمہارا توقیر!''

خط پڑھ کر روحیل نے سب کی طرف غصے سے دیکھا۔ عاصم، حاتم، خدیجہ بیگم اور ردا سمیت سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''ت...... ت...... توقیر۔'' ردا زیرِ لب بڑبڑائی۔

''یہ ہے تمہاری بہن کی بدکرداری کا تحریری ثبوت۔ محبت کسی اور سے اور شادی مجھ سے۔ نہ جانے اس کے کون سے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تم نے اس کی شادی مجھ سے کردی۔'' روحیل نے غصے سے حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ جھوٹ ہے۔'' ردا بے بسی سے چلائی۔

''اس تحریری ثبوت کے بعد بھی تم اسے جھٹلا رہ ہو۔ جھوٹی، دھوکے باز۔'' روحیل زور سے بولا۔

''اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ میں بھی اس سے محبت کرتی تھی؟'' ردا رک رک کر اپنے دفاع میں بولی۔

''وہ تم سے محبت کرتا تھا تو اس نے یہ خط لکھا ناں!'' روحیل نے اسے جتایا۔

''ہاں، وہ مجھ سے محبت کرتا تھا مگر میں نہیں۔'' ردا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم اس سے محبت نہیں کرتی تھیں؟'' روحیل نے کہا تو ردا ایک دم خاموش ہوگئی۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ردا کا تمام جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

''اب خاموش کیوں ہو، جواب دو اپنی پارسائی اور پاک دامنی کا ثبوت دو۔ بلاؤ اس شخص کو اور سب کے سامنے پوچھو کہ کون کس سے محبت کرتا تھا؟'' روحیل نے کہا تو ردا نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''وہ یہاں نہیں آسٹریلیا میں ہے اور میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔'' ردا نے سسکی لے کر آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اوہ...... رابطہ نہیں مگر سب معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔'' روحیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم نے اپنی بکواس مکمل کرلی ہے تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' حاتم نے روحیل کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

''جا رہا ہوں مگر تم لوگوں سے اپنا ہر تعلق توڑ کر جاؤں گا۔ میں سب کے سامنے ردا کو طلاق دیتا ہوں۔'' روحیل نے چلاتے ہوئے کہا۔

''خبردار، تم نے اس کے آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔'' ماں جی غصے سے چلائیں اور پھر بے حال ہو کر صوفے پر گر گئیں۔

''ط...... طل...... طلاق......'' ردا آہستہ آہستہ زیرلب بڑبڑاتی رہی۔ ہر طرف اِک شور سا مچ گیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ردا بے ہوش ہو کر گر گئی۔ خدیجہ بیگم کا برا حال تھا۔ شمیلہ کے دل کو یک گونا سکون ملا تھا۔ دونوں بھائیوں کے دلوں میں ایک دم ردا کے لیے نفرت سی بھر گئی تھی۔ روحیل یہ ڈراما کر کے واپس جا چکا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ ردا اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے نیند کا انجکشن دے کر سلایا گیا تھا۔ خدیجہ بیگم کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ عاصم اور حاتم ان کے پاس ہی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہائے...... میری ردا کہاں ہے؟ وہ کس حال

میں ہے؟'' وہ آہ بھر کر حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''رہنے دیں اسے جہاں وہ ہے۔ آج اس نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔'' حاتم غصے سے بولا۔

''حاتم کیا تمہیں اپنی بہن پر یقین نہیں رہا۔'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''مما، اتنا بڑا ثبوت ملنے کے باوجود بھی آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔'' عاصم نے خفگی سے کہا۔

''اس لیے کہ وہ بے قصور ہے۔ میرا دل کہتا ہے وہ بے گناہ ہے۔''

''بے قصور ہوتی تو اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت دیتی۔ نہ جانے کب سے اس کا توقیر کے ساتھ افیئر تھا۔ اس نے تو ہمارے سر شرم سے جھکا دیے۔ آپ کو معلوم ہے جب تک لڑکی کسی لڑکے کو لفٹ نہیں کروائے لڑکا اسے گفٹس، خطوط بھیجنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔'' عاصم بھی غصے سے بولا۔

''اور وہ فرحان جو اس کے لیے عجیب، عجیب میسجز بھیجتا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے ساتھ بھی اس کا کوئی چکر تھا۔ فہام بھائی ناحق مارے گئے۔'' دونوں بھائی اپنے خدشات بتا رہے تھے۔

''بس کرو، تم اپنی بہن کے بارے میں اتنے بدگمان ہو گئے ہو۔'' مما نے غصے سے کہا۔

''ہمیں تو اب اسے بہن کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''کیا...... تم لوگوں کی محبتیں اتنی کمزور تھیں جو ایک دم بدل گئیں۔ کاش فہام زندہ ہوتا۔'' خدیجہ بیگم سسکنے لگیں۔

☆☆☆

ماں جی مسلسل روحیل کو لعن طعن کر رہی تھیں۔

''تو نے مجھے بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ تو نے میری معصوم ردا کو طلاق......'' ماں جی ہونٹ بھینچ کر سسکنے لگیں۔

''روحیل کیا کروں؟ آپا نہ دوا کھا رہی ہیں اور نہ ہی چپ ہو رہی ہیں مسلسل روئے جا رہی ہیں۔'' فضیلت نے روحیل کی طرف دیکھ کر بے بسی سے کہا۔

''مما...... پلیز......'' روحیل نے ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا۔

''مر گئی تمہاری ماں۔ کیا تم نے اس وقت ایک بار بھی سوچا کہ تمہاری ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ ردا سے کتنی محبت کرتی ہے اور ردا کو سرِعام رسوا کر کے تم نے اپنی ماں کو بے عزت کیا ہے۔ میں نے تم جیسے بیٹے کو کیوں جنم دیا جو نہ ماں کی عزت کرسکا نہ بیوی کی۔'' ماں جی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری ماں جی، مجھے اس وقت بہت غصہ آگیا تھا۔'' روحیل نے شرمندگی سے کہا۔

''تم اس قدر کمزور انسان ہو جسے اپنے جذبات پر ذرا سا بھی قابو نہ رہا۔'' عبید ماموں نے بھی خفگی سے کہا۔

''ہاں...... ہاں میں ہی برا ہوں۔'' روحیل ایک دم غصے سے چلانے لگا۔

☆☆☆

دو دن سے ردا نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ بس بیڈ پر لیٹی چھت کو گھورتی رہتی اور اس کی کھلی آنکھوں سے آنسو گر گر کر تکیے میں جذب ہوتے رہتے۔ زرینہ ناشتے کی ٹرے رکھے اس سے التجا کرتی کہ وہ تھوڑا سا کچھ کھالے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ یوں جیسے اس کی کوئی بات ہی نہ سنی ہو وہ اسے کہہ، کہہ کر کمرے سے چلی جاتی۔ زرینہ نے خدیجہ بیگم کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔

''اٹھو بیٹا، کچھ کھالو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' خدیجہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

ردا نے ماں کی طرف دیکھا تو ایک دم اٹھ بیٹھی

اور والہانہ انداز میں ان کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔

''مما...... میں بے گناہ ہوں۔ میں نے توقیر سے کبھی محبت نہیں کی۔ پلیز آپ میرا یقین کریں۔'' ردا نے سسکی بھر کر کہا۔

''بات میرے یقین کی نہیں۔ خاندان بھر میں تمہاری رسوائی ہوئی ہے۔ لوگ کیا، کیا باتیں بنا رہے ہیں۔'' خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر کہا۔

''مما...... لوگوں کو میں اور میرا کردار دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے نہیں معلوم توقیر نے کب وہ خط کتاب میں رکھا تھا اور روحیل کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ میں نے تو اس پرچے کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔'' ردا نے روتے ہوئے وضاحت پیش کی۔

تبھی خدیجہ بیگم کو یاد آیا کہ وہ فون کرنے کمرے سے نکل رہی تھیں اور روحیل شیلف کی طرف بڑھا تھا۔

''کس کس کو سمجھاؤں۔ تم نے سب کے سامنے توقیر کی محبت کا اقرار کر کے اپنے بھائیوں کو بھی اپنے خلاف کر لیا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے افسردگی سے کہا۔

''مگر...... مما، وہی حقیقت تھی۔ وہ فون پر کہتا تھا مگر میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔'' ردا نے معصومیت سے جواب دیا۔

''آج کل تو دنیا سچ کو دیکھ کر سچ نہیں مانتی۔ تمہارے اتنے کڑوے سچ کو کیسے برداشت کرے گی اور عورت کے کردار پر ذرا سا شک بھی گزر جائے تو ساری دنیا اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتی ہے۔'' خدیجہ بیگم نے عمر بھر کا تجربہ بیان کیا۔

''مما...... میں ایسا کیا کروں کہ سب مجھ پر یقین کرنے لگیں۔'' ردا نے نم آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر بے بسی سے پوچھا۔

''خدا سے دعا کرو کہ وہ سب کے دلوں کو تمہاری طرف پھیر دے۔ دلوں میں محبت اور نفرت تو وہی پیدا کر سکتا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے سسکی بھر کر اس

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''خدا تم پر رحم کرے۔'' انہوں نے محبت سے اسے سہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شمیلہ نے بھی گھر میں خوب ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ وہ بھی کچھ نہ کھاتی پیتی تھی۔ سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہتی تھی باہر نکلتی تو کبھی ردا کو مارنے کو لپکتی کبھی خدیجہ بیگم کے ساتھ جھگڑا کرتی اور کبھی ملازموں کے ساتھ الجھتی۔ اس کی صحت بھی چند دنوں میں بہت خراب ہوگئی تھی۔ اس کی ماں ریحانہ اس کے پاس بیٹھی اسے محبت سے سمجھا رہی تھیں اور اس اس آزمائش پر صبر کرنے کو کہہ رہی تھیں اور وہ حیرت سے صبر، صبر بڑبڑائی مسلسل بول رہی تھی۔

''صبر..... صبر کیا ہوتا ہے؟''

''بیٹا تم بتاؤ، تم عدت کہاں کرنا چاہتی ہو؟ یہاں یا پھر میکے میں؟'' ریحانہ نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے پوچھا۔

''کیوں..... میں کیوں عدت کروں؟'' شمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ اب فہام اس دنیا میں نہیں رہا اور ہر بیوی شوہر کی وفات کے بعد عدت کرتی ہے۔'' ریحانہ نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں عدت نہیں کروں گی اور کون کہتا ہے میرا فہام مرگیا ہے۔'' وہ غصے سے چلانے لگی۔

ریحانہ اسے اپنے ساتھ لگا کر چپ کروانے لگیں۔ ان کے رونے کی آواز سن کر خدیجہ بیگم اُن کے کمرے میں آگئیں اور دونوں کو روتا دیکھ کر انہوں نے شمیلہ کو اپنے ساتھ لگایا۔

''بیٹا، ہمت کرو۔ آزمائشیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں۔''

''نہیں ہے مجھ میں ہمت۔ آپ لوگ میرے دشمن ہیں، میرے فہام کو کھا گئے ہیں۔'' انہیں دھکا دے کر غصے سے بولی۔

''ریحانہ تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ۔ یہ ہمیشہ ہی اپنا دشمن سمجھتی ہے۔'' خدیجہ بیگم نے بہن کی دیکھ کر بے بسی سے کہا۔

''ہاں، تو آپ لوگوں نے اس کے ساتھ سا اچھا سلوک کیا ہے۔ نہ فہام کی زندگی میں سکون لینے دیا اور اب جانے کیا کریں گی۔ اس میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ یہ میکے میں ہی کرے گی۔'' ریحانہ بیگم تیوری چڑ بہن سے مخاطب تھیں۔

''لیکن عدت تو اسی گھر میں کی جاتی ہے شوہر کی وفات کی خبر ملے۔''

''چاہے اس گھر میں اس کی جان کو خطرہ کیوں نہ ہو؟''

''ریحانہ تم ہمیں اتنا ظالم سمجھتی ہو؟''

''صرف سمجھتی نہیں ..... مجھے پورا یقین ہے۔'' ریحانہ نے غصے سے کہا اور تیزی سے شمیلہ کا سامان اکٹھا کرنے لگیں۔

''نہیں..... میں کہیں نہیں جاؤں گی، یہ میرے کمرا ہے۔'' شمیلہ نے اپنا سامان پھینکنا شروع کردیا۔

''رہو، مرو یہاں..... پھر مجھ سے کوئی شکا نہ کرنا۔'' ریحانہ نے اسے غصے سے ڈانٹتے ہو اور وہاں سے چلی گئیں۔

☆☆☆

آزر کبھی کبھی فون پر ماں سے بات کر اِدھر کئی دنوں سے اس کا رابطہ نہیں ہوا پھر گاؤں اس کے چچا کی کال آگئی کہ اس کی ماں اب د نہیں..... وہ دکاندار شاہد سے منتیں کر کے چھ لے کر گاؤں روانہ ہوگیا، وہ پہنچا تو ماں کی ہوچکی تھی۔ وہ دادا اور چچا سے مل کر خوب رویا

لوگوں نے اسے کتنی باتیں سنائیں، کتنا طنز کیا اسے..... کیسی کیسی ذلت اٹھانی پڑی تھی، خدا کی پناہ..... وہ بہت مشکل سے وہاں ایک ہفتہ رہ سکا لیکن یہ دن بھی انتہائی اذیت میں کٹے..... اس کے لیے تو زندگی کا ہر ہر لمحہ اذیت سے پُر تھا اس کی ہر سانس میں آہیں اور سسکیاں تھیں۔ یہ کیسی اذیت تھی جس سے صرف وہی آشنا تھا..... یہ کیسا الاؤ تھا جس میں صرف وہی جل رہا تھا..... شہر جانے کو تیار ہوا تو دادا نے کچھ رقم اسے تھمادی جسے چپ چاپ لے کر وہ شہر واپس آگیا۔ چچا نے کچھ کپڑوں کا بھی بندوبست کردیا تھا۔ وہ سیدھا رانا صاحب کی فیکٹری میں چلا گیا۔ اس نے ان کے منیجر سے ملاقات کی تو اس نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں..... رانا صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تو تھا..... مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ ہی ہیں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' آزر نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... آپ..... آپ اپنی کوالیفکیشن اور انٹرسٹ بتائیے کہ آپ کیسی جاب کرسکتے ہیں۔'' منیجر نے جلدی سے بات گول کی مگر اس کا لب ولہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہا تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا..... آزر کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی..... اور اس نے کئی بار یہ محسوس کیا تھا کہ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے عجیب طرح کا تاثر دینے لگے تھے جیسے کراہیت یا اضطراب کا تاثر..... حالانکہ وہ بہت خوب صورت تھا، گندے حلیے اور برے حالات میں بھی وہ شکل صورت سے اچھا لگتا تھا مگر نہ جانے کیوں لوگ اس سے بہت بیزاری سے بات کرتے۔ شہر سے گاؤں اور گاؤں سے شہر تک کے سفر کے دوران اس نے اس بات کا بہت اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا کہ لوگ اس کے ساتھ بہت برے انداز میں بات کرنے لگے تھے اور یہ بات اسے بہت تکلیف دیتی تھی..... وہ تو ہمیشہ اپنے آپ کو لوگوں سے منفرد اور معتبر خیال کرتا تھا..... شاہانہ ٹھاٹ باٹ نے اس کا دماغ مزید خراب کردیا تھا اپنے آپ کو کبھی کسی عام اور معمولی انسان کے برابر خیال نہیں کیا تھا اور اب اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی عزت ایک عام اور معمولی انسان سے بھی کم ہو۔ اپنی ذلت کی، ہتک اور تحقیر پر اس کا دل بہت کٹتا تھا..... یہ باتیں شاید دوسروں کے لیے بہت معمولی ہوں مگر اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔

''آپ بتائیے..... آپ کیسی جاب کرسکتے ہیں؟'' منیجر نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

''جیسی بھی ہو.....'' آزر بہ مشکل بولا۔

''ٹھیک ہے..... آپ باہر بیٹھیے..... میں ابھی آپ کو کال کرتا ہوں۔'' منیجر نے قدرے روکھے لہجے میں کہا تو آزر خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور پھر ایک بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا جبھی رانا صاحب ایک خوب صورت، نوجوان لڑکی کے ہمراہ اس کے پاس سے گزرے۔ آزر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے ان کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا، وہ تو اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ رانا صاحب چند قدم آگے چلے اور پھر اس کے پاس واپس آئے۔ لڑکی انہیں کوئی بات سنا رہی تھی۔ رانا صاحب کے رکتے ہی وہ لڑکی خاموش ہوگئی۔

''آپ..... یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں..... وہ.....'' آزر ایک دم کھڑا ہوا اور رانا صاحب کی طرف دیکھ کر گھبرا گیا۔ لڑکی نے بھی بغور اس کی جانب دیکھا اور پھر وہ ایک دم حیرت سے چلائی۔ وہ کومل رانا تھی۔

''آ..... آزر..... تم.....؟'' کومل رانا انتہائی حیرت سے چلاتے ہوئے بولی اور اس کے چہرے پر

خوشی و حیرت کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"ک...... ک...... کومل...... تم؟" آزر نے بھی حیرت سے پوچھا۔

"تم اور یہاں...... آئی ڈونٹ بلیو اٹ!" کومل نے بے یقینی سے کہا۔

"کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" رانا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... نانا ابا...... ہم دونوں کلاس فیلوز رہ چکے ہیں۔ جب ڈیڈی کی پوسٹنگ یہاں ہوئی تھی اور جس کالج میں، میں نے ایڈمیشن لیا تھا آزر اسی کالج میں تھا۔ ہم سب بہت اچھے فرینڈز تھے۔ باقی سب لوگ کہاں ہیں...... حمنہ، یمنیٰ، جواد؟" کومل نے مسکرا کر پوچھا تو آزر گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا مطلب ہے اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

"بھئی تم لوگ یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرو گے، چلو میرے آفس میں......" رانا صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، ہاں، چلو...... آج خوب ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں، آئی ایم سو ایکسائٹڈ ٹو سی یو میئر...... او گاڈ...... آزر مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا...... کہ میں تم سے ملاقات کروں گی اور وہ بھی اتنی اچانک......" وہ مسکرا کر بولی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور خاموشی سے کومل رانا کے ساتھ چلنے لگا۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو گئی تھی...... شمیلہ صوفے پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے فہام، فہام پکارنے لگی۔ فہام اسے مسکراتا ہوا دکھائی دیا تو وہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کمرے کے چکر لگانے لگی پھر ایک دم فہام غائب ہو گیا تو وہ اسے اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے پکارنے لگی۔

"میرا فہام کہاں گم ہو گیا ہے...... فہام...... میرا فہام......" وہ صوفے پر بیٹھ کر سسکنے لگی۔ اس کے اندر ایک ابال سا اٹھا اور وہ بھاگتے ہوئے کچن میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس نے ایک تیز دھار پکڑی اور اسے بغور دیکھتے ہوئے وہ کچن سے با

ردا اپنے کمرے میں نیند کی دوا کھا کر تھی۔ شمیلہ چھری پکڑ کر ردا کے کمرے میں ہوئی اور اسے مزے سے سوتا دیکھ کر اس کے پر انتہائی غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگ کی آنکھیں غصے سے شعلے برسا رہی تھیں۔

"آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی، تم میرے فہام کو مجھ سے چھینا ہے...... میں تم سے زندگی...... تمہارا سب کچھ چھین لوں گی......" بڑاتے ہوئے آگے بڑھی ہی تھی کہ اسی لمحے کسی کے ہاتھ کو پیچھے سے مضبوطی سے پکڑا۔ شمیلہ نے کر دیکھا تو زرینہ تھی جو ابھی ابھی واش روم سے نک

"ردا...... بی بی...... جلدی اٹھیں۔" زور سے چلائی تو ردا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور شمی ہاتھ میں چھری دیکھ کر وہ گھبرا کر کانپنے لگی۔

"مجھے چھوڑ دو...... میں اسے زندہ نہیں چھ گی۔ اس نے مجھ سے میرا فہام چھینا ہے۔" شم اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"حاتم بھائی، بیگم صاحبہ...... جلدی اندر آ" زرینہ چیخ چیخ کر سب کو آوازیں دینے لگی وہ بالکل نہیں تھی وہ پوری طاقت سے شمیلہ کا ہاتھ پکڑ کمرے سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" خدیجہ اندر آ کر گھبرا کر پوچھا۔

"یہ...... ردا باجی کی گردن پر چھری چلا تھیں۔" اس نے شمیلہ کے مڑے ہوئے سے چھری چھین کر خدیجہ بیگم کو دیتے ہوئے بتا

"کیا......؟" چھری پکڑ کر ان کی حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

(باقی

وقت کی چال

غزالہ عزیز



متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ساجدہ بیگم کے دو ہی بچے تھے۔ بڑی بیٹی عائزہ اور اس سے چھوٹا عامر۔ یہی ساجدہ بیگم کی کل کائنات تھے جنہیں انہوں نے بیوگی کے باوجود بڑی محبت و لگن سے پال پوس کر اچھی تربیت کے ساتھ پروان چڑھایا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اب اپنی بہو لائبہ کی تربیت بھی کرنی پڑ رہی تھی۔ خدانخواستہ ایسا نہیں تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور میکے سے تربیت یافتہ نہیں تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر گھرانے کے اپنے کچھ طور طریقے اور رواج ہوتے ہیں جنہیں نئی آنے والی کو سمجھنے اور سیکھنے ضروری ہوتے ہیں چونکہ لائبہ بھی آج کل کی لڑکیوں اور خواتین کی طرح فیشن، کپڑے، جوتے، بیگز اور میک اپ کی شوقین تھی۔ شادی کے بعد بھی اس کے یہی شوق برقرار رہے۔ ایسا نہیں تھا کہ ساجدہ بیگم شادی کے بعد لڑکیوں کے فیشن یا میک اپ کے خلاف تھیں بلکہ اُن کا خیال تھا کہ ہر چیز میں اعتدال اور توازن ضروری ہے لہٰذا اگر عورت زندگی میں صبر و برداشت کے ساتھ یہ دونوں اصول بھی اپنی سرشت

میں شامل کرلے تو صرف خود ہی کامیاب عورت نہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی کامیاب انسان بنا سکتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آج کل کے بھیڑ چال والے ماحول میں مارننگ شوز اور ڈراموں کی دلدادہ خواتین فیشن اور میک اپ کے ساتھ لائف اسٹائل میں بھی مارننگ شوز کی ہوسٹ اور ڈراموں کی ہیروئن کی تقلید میں مگن ہیں اور چونکہ لائبہ بھی اس دوڑ میں شامل تھی لہٰذا ساجدہ بیگم دن رات اُسے سلیقہ شعاری اور بچت کی اہمیت پر لیکچر دیا کرتیں مگر لائبہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔ جس کی وجہ سے گھر کا بجٹ بھی متاثر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

لائبہ کے تین بچے تھے دو بیٹے عاشر اور عاطف اور بیٹی اریشہ۔ اس کا شوہر جو ساجدہ بیگم کا اکلوتا بیٹا تھا کسی میڈیسن کمپنی میں کوالٹی کنٹرول انسپکٹر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں تین بچوں کی اسکولنگ کے اخراجات، یوٹیلیٹی بلز اور کچن کے ماہانہ اخراجات کے بعد اگر کچھ بچت ہو بھی جاتی تو وہ لائبہ کے آئے دن نت نئے جوڑوں ہر ہفتے کسی نہ کسی فیشل مساج کی مد میں خرچ ہو جاتی۔ ساجدہ بیگم اس سب کے سخت خلاف تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ اگر ہر ماہ اسی بچت کو محفوظ کرلیا جائے تو خدانخواستہ برا وقت پڑنے پر یہ پیسہ کام آسکتا ہے۔ ان کے خیال میں سب ٹی وی کے مارننگ شوز پر دکھائے جانے والے نت نئے فیشن کے کپڑوں اور میک اوور کے نام پر گھر بیٹھی غریب اور متوسط طبقے کی خواتین کی خواہشات نفسانی کو ابھارا جارہا تھا۔ اس سب نمائش سے صرف چینلز کا فائدہ ہوتا ہے تاکہ ان گھریلو خواتین کو جو یہ سب کچھ دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی ہیں یا پھر اپنے، اپنے شوہروں کو قرض اور رشوت جیسی لعنتوں کی ترغیب دیتی ہیں۔ لائبہ کو بگاڑنے میں محلے کی شاہدہ بیوٹیشن کا بڑا ہاتھ تھا جو اپنے بیوٹی پارلر کی آمدنی بڑھا[نے] کے لیے آئے دن الٹے سیدھے فیشل، ماسک [...] مساجز کے نام پر سادہ لوح لائبہ کی نفسیات کو کمز[ور] بنا کر اس کی جیب کاٹ رہی تھی۔

اس نے لائبہ کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھ[ی] کہ دن بھر گھر اور بچوں کے ساتھ مصروف خواتی[ن] جب خود پر توجہ دینا چھوڑ دیتی ہیں تو دن بھر کا تھکا ہا[را] شوہر بیوی کی ابتر حالت سے اکتا کر گھر سے باہر د[...] لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسر[ی] شادی جیسا انتہائی قدم اٹھانے سے بھی ہچکچاتا نہیں۔ لائبہ تو شاہدہ کی باتیں سن کر ہی ڈر گئی تھی۔ واقع[ی] بھی تو تین بچوں کے ساتھ گھر داری اور شوہر کی برداری میں دیگر متوسط طبقے کی خواتین کی طرح چکر بنتی جا رہی تھی۔

سو اس دن سے لائبہ نے شاہدہ بیوٹی پارلر وا[لی] کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کردیا تھا۔ ہر مہینے نئے جوڑے جدید تراش خراش کی سلائی کے سا[تھ] اور مہینے میں دو بار فیشل اور چہرے کی گرومنگ بر[...] ہونے شروع ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا بج[ٹ] بھی متاثر ہونے لگا تھا۔ ساجدہ بیگم لاکھ سمجھاتیں اگر وہ اندھا دھند شاہدہ کی تقلید کرنے کے بجا[ئے] سمجھداری سے کام لیتے ہوئے خود سلائی سیکھ کر ا[...] کپڑے گھر پر خود ڈیزائن کرے تو ٹیلر کو دی جانے [والی] اچھی خاصی رقم کی بچت ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی بیوٹی کے حوالے سے چند موٹی موٹی مہارتیں کسی ا[...] ٹیوٹ سے سیکھ لے تو ہر ماہ بیوٹی پارلر کے چکروں [...] ہزاروں روپے خرچ ہونے سے بچ جائیں۔ ویسے آج کل تو اخبار، رسائل اور ٹی وی چینلز پر تراکیب کی بھرمار ہے لیکن شاہدہ کی کی گئی بر[...] واشنگ نے لائبہ کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا [...] تو صرف ایک ہی بات سے خوف زدہ ہو چکی تھی کہ بچوں کے بعد کہیں عامر بھی اس سے بیزار ہو کر دو[سری] شادی نہ کرلیں اور وہ ٹی وی ڈراموں میں ہیرو[ئن کو] سوکنوں کا عذاب جھیلتے دیکھ کر خود بھی کسی ڈرامے کی کہانی کا کردار بن جائے۔ ساجدہ بیگم کی ساری نصیحتیں بیکار جاتیں۔

☆☆☆

آج بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ لائبہ بچوں کے اسکول جانے کے بعد کچن سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ ابھی لنچ کی تیاری بھی کرنی تھی۔ اس لیے کچن سے سبزی کی ٹوکری اٹھا کر صحن میں رکھے تخت پر بیٹھی اماں کے حوالے کر کے خود چائے کا مگ اور ٹرے میں میاں اور بچوں کا بچا ہوا ناشتا لے کر لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھ چکی تھی کیونکہ اس کے پسندیدہ چینل پر مارننگ شو شروع ہو چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ جلدی جلدی کچن کا کام نبٹانا چاہتی تھی۔ اب تو سالوں سے اس کا یہی معمول تھا۔

اس کی اکلوتی نند عائزہ دوسرے شہر میں بیاہی گئی تھی لہٰذا سسرال میں سسرالیوں کے نام پر ایک بے ضرر سی ساس کی موجودگی میں لائبہ کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

البتہ ساجدہ بیگم پرانے خیالات کی وضع دار اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شوہر کی سرکاری نوکری میں دونوں بچوں کو پڑھایا لکھایا بھی تھا اور گھریلو اخراجات سے بچت کر کے کمیٹیاں ڈال ڈال کر اپنا گھر بھی بنوالیا تھا۔ جس کے باعث آج وہ اپنے گھر کی مالکن تھیں لہٰذا وہ بہو کو بھی سلیقہ شعاری سے چلنے اور بے جا فضول خرچیوں سے بچنے کی تلقین کیا کرتیں۔

اس وقت بھی وہ مارننگ شو دیکھنے میں مگن تھی اور ساجدہ بیگم سبزی بنانے میں تب ہی دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔

''لائبہ...... ارے لائبہ، دیکھو دروازے پر کون ہے۔'' ساجدہ بیگم نے وہیں تخت پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی مگر اسے ٹی وی کی آواز اور شور شرابے میں ساس کی پکار کب سنائی دیتی تھی۔ ویسے بھی اس ہفتے چینل کے مارننگ شو میں شادی ویک چل رہا تھا۔ اس لیے بے ہنگم ڈھول تاشے، بھنگڑا، ڈانس سب کچھ چل رہا تھا اور وہ ارد گرد سے بیگانہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔ ناچار ساجدہ بیگم کو ہی گھٹنوں کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے اٹھنا پڑا۔

''مجال ہے... جو میری کسی نصیحت اور سمجھانے کا اثر ہو جائے اس پر۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے تک پہنچیں۔

''ارے بھئی آرہی ہوں، کیا دروازہ توڑ دینے کا ارادہ ہے۔'' سامنے شاہدہ بیوٹی پارلر والی تک سک سے تیار کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''آگ لگے موئے اس فیشن کو......'' ساجدہ بیگم اس کے حلیے بلکہ قابلِ اعتراض حلیے پر منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

''سلام علیکم خالہ، لائبہ تو گھر پر ہے ناں؟'' ان کے ماتھے پر تو شاہدہ کو سامنے دیکھ کر ہی سلوٹیں پڑ گئی تھیں اوپر سے اس کے سلام کرنے کے غلط انداز نے اور تپا دیا۔ وہ پہلے ہی سارے فساد کی جڑ شاہدہ کو سمجھتی تھیں۔

''ارے بی بی، فیشن میں تو لگتا ہے تم نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے مگر کچھ مذہب سے بھی لگاؤ رکھنا چاہیے، خیر سے مسلمان ہو۔'' وہ کھسیا کر اپنی اونچی شرٹ کے دامن کو پکڑ کے ٹھیک کرنے لگی تھی۔

''خالہ...... میں نے ایسی کون سی غیر مذہبی بات کردی ہے۔ لائبہ کا ہی تو پوچھا ہے، کیا گھر پر نہیں ہے وہ؟''

''بی بی کسی پر سلامتی بھیجنی ہو تو اسے السلام علیکم کہتے ہیں نہ کہ الٹا مرنے کی دعا......''

''خدا نہ کرے خالہ، میں کیوں آپ کو بددعا دینے لگی۔'' شاہدہ نے بات کو نہ سمجھتے ہوئے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ فیشن اور میک اپ کے علاوہ اپنے دین و مذہب کی شُدبُد بھی رکھو تو خلقِ خدا کی بھلائی ہوگی۔'' ان کے طنزیہ انداز میں لپٹی ملامت شاہدہ کے پلے نہ پڑی مگر پھر بھی وہ

معذرت کرنے لگی۔
"معاف کرنا خالہ بچپن سے لوگوں سے یہی سنا ہے تو زبان پر بھی یہی چڑھ گیا کبھی کسی نے ٹوکا ہی نہیں۔ آپ کا شکریہ آپ نے میری اصلاح کردی۔ اب میں جاؤں لائبہ کے پاس؟" ساجدہ بیگم جیسے دروازے پر اس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔
"تو میں نے کب روکا ہے۔ ضرور جاؤ مگر اپنے بزرگوں کے پاس بھی کچھ وقت گزار لو تو اصلاحِ احوال کا کام چلتا رہے۔"
"جی خالہ۔" وہ تیزی سے جواب دے کر گھر میں داخل ہوتے ہی آگے بڑھتی چلی گئی کہ کہیں ساجدہ بیگم کا اصلاحی لیکچر طول نہ پکڑ لے۔ ساجدہ بیگم کی نصیحتوں میں ابھی کچھ اور ہنر باقی تھے مگر شاہدہ نے زیادہ پھرتی دکھائی تھی اس لیے وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس آکر تخت پر براجمان ہو چکی تھیں تاکہ بقیہ سبزی بنا کر بہو کے حوالے کرسکیں حالانکہ جانتی تھیں کہ لائبہ نے مارننگ شو ختم ہونے پر ہی ہانڈی چڑھانی تھی کیونکہ ایک بجے دوپہر سے پھر ڈراموں کی ری پیٹ ٹیلی کاسٹ ٹرانسمیشن شروع ہو جاتی تھی اور لوڈشیڈنگ کی ستائی خواتین جو روزانہ باقاعدگی سے دن میں چار اور آٹھ گھنٹوں کی لوڈشیڈنگ سے عاجز تھیں پرائم ٹائم والے ڈرامے لوڈشیڈنگ کی وجہ سے دیکھنے سے محروم ہو جاتی تھیں تو وہ اگلے دن کی ری پیٹ ٹرانسمیشن میں وہ دیکھ لیتیں۔ لائبہ بھی یہی کرتی تھی۔ جس تیزی سے ساجدہ بیگم کا دماغ سوچوں میں الجھا ہوا تھا اس سے زیادہ تیزی سے وہ سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

"ہائے لائبہ، تم سارا دن اپنی ساس کے ساتھ کیسا گزارہ کرلیتی ہو۔ میری تو پانچ منٹ میں دماغ کی دہی بنادی انہوں نے۔" شاہدہ صوفے پر بیٹھ کر لائبہ کے سامنے اس کی ساس کا شکایت نامہ کھول کر بیٹھ گئی۔
"ارے تم اماں کی باتوں کا برا مت منایا کرو وہ دل کی بری نہیں ہیں بس نصیحتیں کرنے کی عادت ہے انہیں۔ کیا کریں، وہ بھی اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ بوڑھے لوگوں کے پاس کرنے کو جو کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ لائبہ نے ساس کی برائی میں حصہ لینے کے بجائے صاف وضاحت کی تھی اور شاید یہی لائبہ کی اچھی عادت بھی تھی۔ اس کی باتیں دوسری عورتوں کی طرح ساس، نند کی برائیوں کے بجائے روز کے ڈراموں اور مارننگ شوز کی فیشن پریڈ کرتی میزبان کے ڈیزائنر کپڑوں جوتوں اور ہیر اسٹائل اور سیٹ کی سجاوٹ کے تبصروں سے شروع ہو کر فیشن اور میک اپ پر ختم ہوتیں۔
"قسم سے یار میں نے تو سلام کیا تھا۔ وہ کہنے لگیں کہ سلام علیکم نہیں کہتے السلام علیکم کہتے ہیں یعنی تم پر سلامتی ہو۔"
"ہاں تو ٹھیک تو کہا ہے اماں نے۔۔ ورنہ تم روزانہ نہ جانے کتنے بے چارے لوگوں کو دن میں مرنے کی بددعا دیتی پھرتی ہو کیونکہ غلط سلام کرنے سے اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔" لائبہ نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔
"ہائے میری توبہ اللہ، میں لوگوں کو مرنے کی بددعائیں دیتی رہی ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اب بس کرو اب تم بھی اپنی ساس کی طرح شروع مت ہو جانا۔ صبح صبح سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ ایک کڑک سی چائے کی پیالی تو پلادو پھر تمہیں زبردست سی خوش خبری سناؤں گی۔" شاہدہ نے اسے لالچ دیا۔
"کیسی خوش خبری تمہاری نند کا رشتہ تو پکا نہیں ہوگیا؟"
"ارے نہیں، اس نے اتنی آسانی سے ہماری جان کہاں چھوڑنی ہے۔ خوش خبری تمہارے حوالے سے ہے لیکن پہلے چائے۔" شاہدہ نے نند کے ذکر پر برا سا منہ بنایا بات بھی بری نکالی تھی۔
"اچھا ٹھیک ہے ابھی لاتی ہوں پانچ منٹ

میں۔" لائبہ لاؤنج سے باہر چلی گئی اور اس کی جگہ ٹی وی ریموٹ تھام کر اب شاہدہ نے صوفے پر پاؤں پسار لیے۔

☆☆☆

لائبہ واقعی جھٹ پٹ چائے بنا لائی تھی جسے شاہدہ نے چسکیاں لے کر پینا شروع کردیا۔
"اب بتاؤ، کس خوش خبری کی بات کررہی تھیں تم؟" لائبہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ خوش خبری یہ ہے کہ بازار میں گرمیوں کے موسم کی مناسبت سے فریش فروٹس فیشل ماسک آئے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی اپنے پارلر میں لاکر رکھے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ شروعات اپنی پیاری سہیلی سے کروں۔ بس تم اس ہفتے کی بکنگ کروالو۔"
"بکنگ یا اپائنٹمنٹ؟" لائبہ نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔
"ہاں، ہاں وہی تمہیں تو پتا ہے میری انگریزی کمزور ہے مگر تمہارے لیے اسپیشل ڈسکاؤنٹ آفر ہے۔ ڈھائی ہزار کا فیشل ٹریٹمنٹ صرف پندرہ سو میں کروں گی۔ قسم سے اپنی عمر سے پانچ سال کم اور چھوٹی نظر آؤ گی اور عامر بھائی بھی مٹھی میں رہیں گے۔ جب گھر میں فریش اور اسمارٹ بیوی موجود ہوگی تو باہر کیوں دلچسپی لیں گے۔" شاہدہ نے لائبہ کی ساس کے ڈر سے دھیمی آواز میں رازدارانہ انداز میں کہا تھا حالانکہ آواز پھر بھی اونچی تھی۔
"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو شاہدہ مگر ابھی پچھلے ہفتے تو میں نے ہربل فیشل کروایا تھا۔ اتنی جلدی عامر اتنی بڑی رقم نہیں دیں گے۔ تم تو جانتی ہو مہینے کا لگا بندھا خرچ دیتے ہیں وہ۔" لائبہ نے بے چارگی سے عذر پیش کیا۔ جس کے باعث شاہدہ کا چہکتا لہجہ اور مسکراتا چہرہ ماند پڑ گیا مگر اس نے ایک کوشش اور کی۔
"ارے واہ یار، عامر بھائی کو منانا کون سا مشکل ہوگا تمہارے لیے۔ ارے بیویوں کے پاس تو سو ہتھیار ہوتے ہیں شوہر کو زیر کرنے اور بات منوانے کے۔" شاہدہ نے مسکا لگایا شرارتی لہجہ اپنا کے۔ وہ محلے کے گھر گھر جا کر اسی طرح اپنے کسٹمرز گھیرتی تھی اور لائبہ جیسی گھریلو سیدھی سادی عورتوں کو الٹی سیدھی لچھے دار باتوں میں الجھا کر اپنا پارلر چمکا رہی تھی۔
"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی عامر سے بات کرنے کی۔ اس مہینے نہ سہی تو اگلے مہینے ضرور اپنی پاکٹ منی سے نیا فیشل کرواؤں گی۔"
"بھئی تم میری اچھی دوست ہو اس لیے تمہاری ہمدردی میں چلی آئی تھی۔ سارا دن کچن کی گرمی میں اکیلی خوار ہوتی ہو تم، تمہاری اسکن زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اس لیے بار بار فیشل کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمجھانا میرا کام تھا اگر یہی فیشل شہر کے کسی مہنگے پارلر سے کرواؤ گی تو پانچ، دس ہزار سے کم خرچ نہیں ہوں گے، سوچ لو؟" شاہدہ اس کے جواب پر مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"اب مجھے ہی دیکھ لو خود کو کتنا مین ٹین رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے تو رفیق کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے چاہے سامنے سے حور پری گزر جائے۔ میں تو کہتی ہوں کہ عورت کو مرد کی فطرت سے آگاہ ہونا چاہیے۔ جب گھر میں بیوی فریش ملے گی تو باہر کی تانکا جھانکی کون کرے گا۔ اچھا...... میں چلتی ہوں۔" شاہدہ نے کوئی رسپانس نہ پاکر اجازت لی۔ اس کے جاتے ہی ساجدہ بیگم نے بہو کی کلاس لی تھی۔
"کیوں آئی تھی یہ موئی بیوٹی پارلر والی۔ اسے اپنے گھر میں سکون نہیں ملتا۔ سارا دن محلے کے گھروں میں لور لور پھرتی ہے پارلر میں کب بیٹھتی ہوگی؟" لائبہ کو اندازہ تھا کہ روز کی طرح ساس کا لیکچر شروع ہونے والا ہے اس لیے تیزی سے آگے بڑھ کر کٹی ہوئی سبزی کی ٹرے اٹھالی۔
"کچھ نہیں اماں، نئی شرٹ کا ڈیزائن سلوانے کے لیے مجھ سے مشورہ کرنے آئی تھی۔ اچھا میں ذرا

سبزی چڑھا دوں۔'' ساجدہ بیگم کی اگلی بات سے پہلے ہی لائبہ جھپاک سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''خدا خیر کرے آج عامر کی جیب گھر میں کٹے گی۔'' ساجدہ بیگم لائبہ کے بہانے پر قیاس آرائی کرتے ہوئے بڑبڑائیں۔ وہ ایسی ہی اول جلول سی مثالیں دیتی تھیں یعنی شاہدہ نے پھر کوئی پٹی پڑھائی ہوگی لائبہ کو اور وہ عامر سے شام میں رقم کا مطالبہ کرے گی۔ ساجدہ بیگم کڑھتے ہوئے اندر کی جانب چلی گئیں۔

☆☆☆

اس وقت ساجدہ بیگم دوسرے کمرے میں عشا کی نماز پڑھ رہی تھیں اور لاؤنج میں عامر ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھنے میں مگن تھا۔ لائبہ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ساس صاحبہ ساتھ والے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں۔ ورنہ وہ کبھی عامر کے سامنے رقم کی فرمائش نہ کرتی۔ شاہدہ نے نئے فیشل ماسک کا لالچ ہی اس طرح دیا تھا مگر لائبہ کے منہ سے نکلی فرمائش اور رقم کے مطالبے نے خلافِ معمول عامر کا میٹر گھما دیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم ہر ماہ دو ڈھائی ہزار روپے کہاں خرچ کرتی ہو۔ ابھی پچھلے ہفتے تو بارہ سو روپے لیے تھے تم نے۔ اوپر سے مہینے کا اپنا جیب خرچ الگ سے لیتی ہو۔ مجھے روپیہ کمانے کی مشین سمجھ رکھا ہے کیا؟'' عامر نے جھنجلا کے بلند آواز سے کہا تو جہاں لائبہ کے اوسان خطا ہوئے وہیں ساتھ والے کمرے میں نماز پڑھتی ساجدہ بیگم کے کان کھڑے ہوگئے اور صبح میں شاہدہ کی آمد کا مدعا بھی کھل گیا کسی راز کی طرح۔ انہیں سمجھ آگیا کہ شوہر سے رقم کا مطالبہ لائبہ کس کے کہنے پر کر رہی ہے۔ یقیناً شاہدہ نے سادہ لوح لائبہ کو کسی مہنگے فیشل کا لالچ دے کر اپنی روزی حلال کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ زیرک اور سمجھدار خاتون تھیں۔ اس وقت میاں بیوی کے معاملے میں دخل اندازی کر کے ماحول کو مکدر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فی الوقت چپ رہی تھیں اور بہو کو اکیلے میں سمجھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''وہ رقم میرا جیب خرچ ہوتی ہے اب میری مرضی ہے میں جہاں دل چاہے خرچ کروں۔'' لائبہ نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... پھر اسی میں سے جہاں دل چاہے خرچ کرو۔ میرے پاس تمہاری آئے دن کی فرمائشوں کے لیے فالتو رقم نہیں ہے۔ عجیب عورت ہو تم ساری دنیا کی عورتیں بچت کرتی ہیں تاکہ برے وقت میں کام آسکے۔ ہمارے تو بچے بھی چھوٹے ہیں مگر تم دنیا سے نرالی عورت ہو۔'' عامر ٹی وی آف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لائبہ حواس باختہ ہونے لگی۔

''دو گھڑی سکون کی سانس میسر نہیں ہے اس گھر میں۔'' عامر گولہ باری کر کے لاؤنج سے باہر جا چکا تھا۔ وہ ہق دق بیٹھی رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ تھوڑی سی کوشش سے ہمیشہ کی طرح عامر نے مان جانا ہے مگر یہاں تو معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ شاید عامر کی بھی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی اور شوہر کی ناراضی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری شادی، سوکن کا خوف اور مرد کے بہک جانے کے خوف کی تلوار شاہدہ نے اس کے سر پر جو لٹکا رکھی تھی۔

وہ الٹے قدموں بیڈروم کی جانب عامر کو منانے بھاگی تھی اور اگلا دن صحیح معنوں میں لائبہ کی اصلاح اور ہوش کے ناخن لینے کا تھا۔ وقت کی چال نے اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

اگلی صبح چند گھنٹوں میں ہی پورے محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شاہدہ بیوٹی پارلر والی کے میاں رفیق وڑائچ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ پچھلی رات شاہدہ اور اس کے شوہر کا زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ جسے پاس پڑوس کی عورتوں نے کان لگا کر سنا تھا اور صبح ہوتے ہی شاہدہ کے گھر کی بات بریکنگ نیوز کی طرح پورے محلے میں نشر ہو چکی تھی۔ لائبہ تو شاک میں تھی۔ پچھلی رات اس نے عامر کو منا لیا تھا اور پچھلی رات شاہدہ

نے اپنے میاں کو ہمیشہ کے لیے خود سے دور کر دیا تھا۔ وہی شاہدہ جو چوبیس گھنٹے نک سک سے تیار خود کو مین ٹین اور اسمارٹ، فریش رکھتی تھی جس کے بقول اس طرح اس کا شوہر دوسری عورتوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اسی شاہدہ کے گھر میں دوسری عورت نے نقب لگا دی تھی، وہ بھی بہت خاموشی سے۔

وہ شاہدہ جو محلے کی عورتوں کو اپنے شوہروں کو اپنے کھونٹے سے باندھ کر رکھنے کا مشورہ دیتی تھی، ان مشوروں کی آڑ میں اپنے پارلر کی دکانداری چمکا رہی تھی۔ آج خود یعنی آپ اپنے دام میں صیاد آگیا تھا۔ رفیق وڑائچ نے اچھی خاصی اسمارٹ اور زمانے کے چلن کے مطابق خود کو مین ٹین رکھنے والی بیوی سے بیزار ہو کر کسی طلاق یافتہ عورت سے دوسری شادی کر کے ثابت کر دیا کہ مرد کے لیے دوسرا راستہ بدلنے کے لیے کسی وجہ یا بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ آزاد پنچھی ہوتا ہے، ہرجائی پن اس کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ وہ نئی نئی دریافتوں کا پرندہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ پڑاؤ کم ہی اس کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔

لائبہ تو ساس کی زبانی ساری حقیقت جان کر گنگ بیٹھی تھی۔

''میں تمہیں بہت دنوں سے سمجھانا چاہتی تھی مگر شاید قدرت نے یہ مناسب موقع خود ہی دے دیا۔ میں خود بھی اس بات کے خلاف ہوں کہ عورت گھرداری اور بچوں کے ذمے داریوں میں الجھ کر خود پر توجہ دینا چھوڑ دے۔ سجی بنی سنوری، صاف ستھری اور مسکراتی بیوی ہر شوہر کو اچھی لگتی ہے لیکن شاہدہ نے اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے تم جیسی سادہ لوح عورتوں کی کمزوری کو ڈھال بنا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر مرد کو سجی بنی، جوان اور خوب صورت بیوی نہیں چاہیے ہوتی بلکہ گھر کا سکون چاہیے ہوتا ہے۔ بیوی کی توجہ اور پُرخلوص محبت کی طلب ہوتی ہے اسے۔ شاہدہ نے دن بھر محلے میں گھوم گھوم کر گھر اور شوہر سے توجہ ہٹالی تھی۔ اس لیے اس کے شوہر نے دوسرا راستہ اپنا لیا مگر میں چاہتی ہوں ہے کہ تم یہ غلطی مت کرو۔ سلیقہ شعار اور گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھنے والی عورت ہر مرد کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ ایسی عورت سکھ اور دکھ دونوں کی ساتھی ہوتی ہے۔''

ساجدہ بیگم کو لگا ان کی بات خاصی طویل...... مگر اثر کر چکی تھی۔ شاہدہ کے دکھ پر روتی لائبہ کو انہوں نے آگے بڑھ کر گلے سے لگا کر تھپکی دیتے ہوئے اسے حقیقت سمجھائی۔ وہ جانتی تھیں کہ لائبہ کی آنکھ سے گرنے والے آنسو صرف شاہدہ کے دکھ اور نقصان پر دکھی ہونے کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس تشکر کے بھی ہیں جو ساجدہ بیگم نے ساس بن کر نہیں ماں بن کر لائبہ کی اصلاحِ حوال کی کوشش کی تھی۔

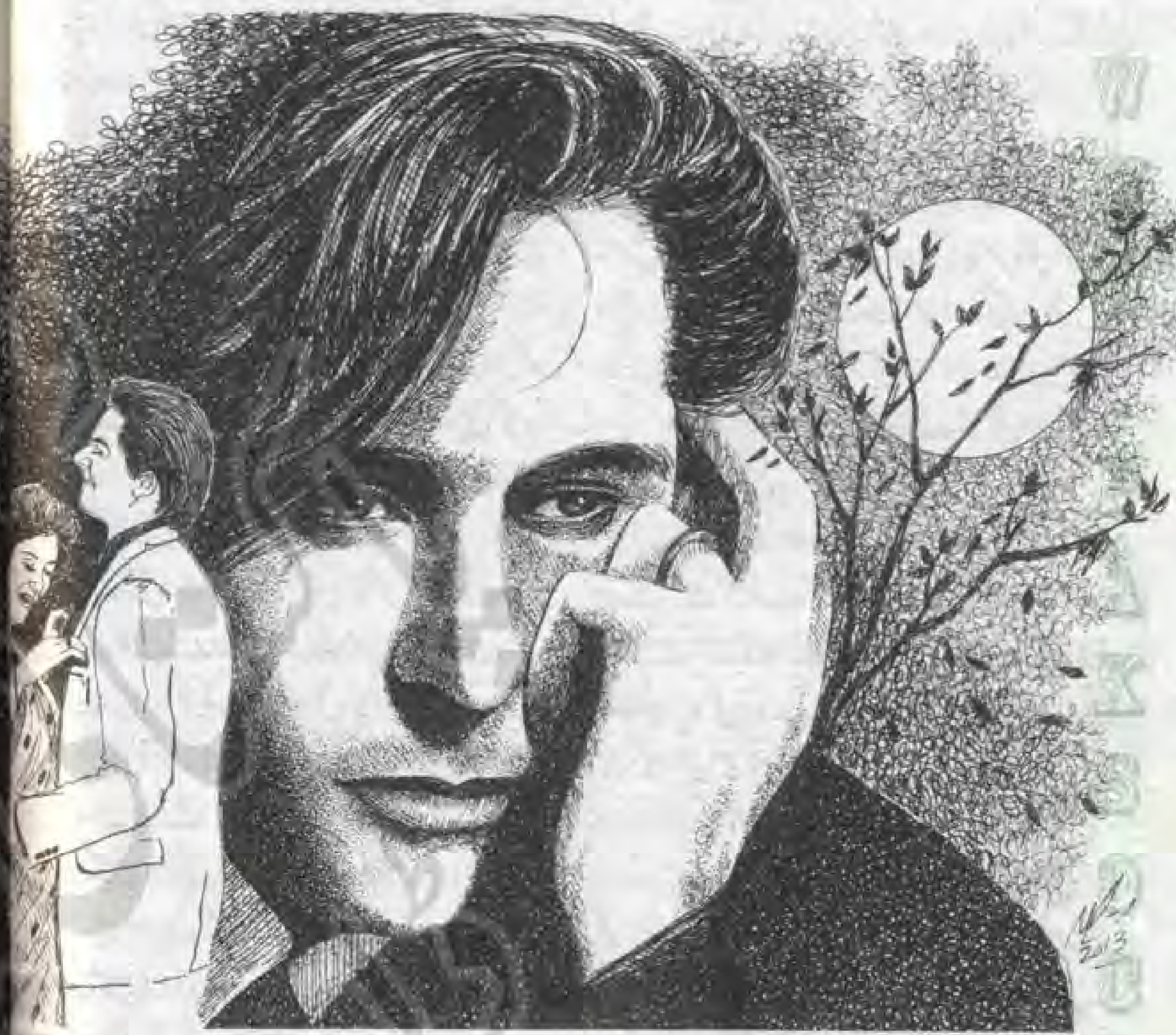
''اماں مجھے معاف کر دیں۔ میں نے کبھی آپ کی باتوں کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں آپ کی شکر گزار نہیں بلکہ احسان مند ہوں کہ آپ کی بروقت اور مسلسل اصلاح نے مجھے کھائی میں گرنے سے بچا لیا۔'' ساجدہ بیگم اس کے منہ سے اتنی سنجیدہ باتیں سن کر مسکرانے لگیں۔

''ماء شاء اللہ تمہاری ان باتوں سے تو لگتا ہے کہ تم کبھی بے وقوف یا احمق نہیں تھیں بس اپنی سادہ لوحی میں ماری گئیں لیکن مجھے شاہدہ کے لیے واقعی بڑا افسوس ہوا ہے۔''

''میں ذرا کچن کی خبر لوں بہت دنوں سے تفصیلی صفائی نہیں ہوئی۔''

''اور تمہارا مارننگ شو؟'' ساجدہ بیگم نے بے ساختہ یاد دلایا تو وہ جھینپ کر مسکراتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی اور وہ اپنی کوششوں میں کامیابی پر مسکرانے لگیں۔





شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

قسط 5

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی او ربدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری آپا اتنی جلدی کیوں واپس جانے پر مصر ہو گئیں۔" اگلے روز ٹی بریک میں زوئی نے نادر سے پوچھا تھا۔

"ہوں......" نادر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ قدرے پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کیا، انہیں میں اچھی نہیں لگی؟" زوئی نے سوال کیا۔ "یقیناً میں انہیں اچھی نہیں لگی ہوں گی، بے شک الحمدللہ میں مسلمان ہوں مگر دو ملکوں کے لوگوں کے درمیان کلچر اور روایات کا کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے، شاید وہ اس فرق کی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کر رہی تھیں۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" نادر نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" زوئی کے لہجے میں بے چینی تھی۔ "ابھی تو میں اس خوشی کو ہی ہضم نہیں کر پائی تھی کہ میرے گھر مجھ سے کوئی یوں ملنے آیا ہے کہ وہ چلی بھی گئیں۔"

"مجھے افسوس ہے زوئی، میں تم سے شرمندہ ہوں۔" نادر اسے یوں پریشان دیکھ کر بولا۔ "آپا کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا مگر شاید اس میں بھی میرا ہی قصور تھا، مجھے انہیں تمہارے ہاں لے کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"کیا تم انہیں زبردستی لائے تھے نادر؟" زوئی کو حیرت محسوس ہوئی۔

"نہیں یار، زبردستی تو نہیں لایا تھا اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے کریں گی مگر تمہارے گھر آنے کا آئیڈیا تو میرا ہی تھا، اس لیے یہ میرا ہی قصور ہوا ناں، میں بہت شرمندہ ہوں تم سے زوئی۔"

"پلیز ایسے مت کہو نادر۔" زوئی کو اس کا بار بار شرمندگی کا اظہار کرنا اچھا نہیں لگا۔ "تمہارا کوئی قصور نہیں اور مجھے برا بھی نہیں لگا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ میرے گھر آئیں تو میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔"

"تم ایک بات بتاؤ زوئی۔" نادر نے اس سے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"اگرچہ میرے گھر والے اس پر خوش ہوں گے نہ ہی رضامند مگر کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" زوئی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "میں یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔" نادر نے اس کے چہرے پر پھیلی حیرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اسی لیے آپا کو لے کر تمہاری طرف آیا تھا، میں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے مگر آپا کا اپنا مزاج ہے، وہ نہ جانے کیا سوچ کر اس بات پر رضامند نہیں ہیں۔"

"انہیں میں اچھی نہیں لگی، سیدھی سی بات ہے اور یہ ایک غیر حقیقی بات ہوگی جس کا ذکر تم کر رہے ہو۔" زوئی نے حقیقت پسندانہ رائے کا اظہار کیا۔

"مگر ضروری نہیں کہ ان کی رضامندی کو شرط بنایا جائے۔ میں اپنے لیے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں اور مجھے اس بات میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ میں خود سے تمہارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لوں۔" نادر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں تمہاری فطری نیک طبیعت سے آگاہ بھی ہوں اور اس کی معترف بھی مگر اس سے فائدہ اٹھانا کوئی دانشمندی کی بات نہیں، میری خواہش تھی کہ میں اس ملک کی شہری بن جاتی مگر ہر خواہش پوری ہونا ضروری نہیں۔ شاید خدا کو یہ منظور ہی نہیں، اس لیے میں خدا کی مرضی پر رضامند ہوں۔ تمہارا بہت شکریہ تم نے میرے لیے اتنا اچھا سوچا مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔" زوئی نے نادر کی بے حد شکر گزار ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں زوئی حسین۔" نادر نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے اس معاملے پر

بہت سوچا اور پھر مجھے خیال آیا کہ شادی تو مجھے کرنی ہی ہے اور کیونکہ میرے ذہن میں کوئی اور لڑکی نہیں ہے اس مقصد کے لیے تو پھر تم جسے میں اتنے عرصے سے جانتا ہوں اور تمہارے کردار کے کھرے پن اور تمہاری معصومیت پر مجھے کوئی شک نہیں تو کیوں نہ تم سے ہی شادی کر لوں۔"

"ارے، یہ کیا بات ہوئی؟" زوئی کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اتر آئی۔

"ارے یہی تو بات ہوئی۔" نادر ہنسا۔ "مجھے خوشی ہوگی جب میری اگلی نسل چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں مگر گندمی رنگت کی حامل ہوگی۔"

"تم ہر بات میں مذاق کرتے ہو نادر۔" زوئی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر تمہارے گھر والے اس پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے، مجھے اس بات کا یقین ہے۔"

"نہ ہوں۔" نادر نے ایک بار پھر بے پروائی سے کہا۔ "آج نہیں ہوں گے، کل ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو میرے ساتھ نکاح کر لو، تمہارا ویزا ایکسپائر ہو رہا ہے۔ تمہیں واپس جانا ہے، تمہاری دوبارہ واپسی کا راستہ ہموار ہو جائے گا اور اس وقت تک میرے گھر والے بھی رضامند ہو جائیں گے۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"کیا یہ ممکن ہے؟" زوئی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل ممکن ہے۔" نادر نے پُریقین انداز میں کہا۔

"میں تمہاری ممنون ہوں۔" زوئی نے کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بہت خدمت کروں گی اور بالکل پاکستانی لڑکیوں کی سی زندگی گزاروں گی۔"

"اوئے خدا سے ڈرو یار، میں اتنا کنزرویٹو ہرگز نہیں ہوں۔" نادر نے ہنستے ہوئے کہا۔ زوئی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی، اسے اس انتہائی ناامیدی کے عالم میں اتنے بڑے معجزے کی توقع ہرگز نہیں تھی، اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس گفتگو کے صرف ایک ہفتے کے بعد زوئی اور نادر کا نکاح مسجد میں ہوا اور اس نکاح کے پانچ دن کے بعد زوئی حسین جواب زوئی نادر تھی اپنے آبائی ملک چین روانہ ہو گئی جہاں سے اسے کچھ ہی عرصے بعد واپس اس ملک میں آنا تھا جو اس کے خوابوں کی سرزمین تھی اور جہاں سے اب اسے واپس جانے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

انتخاب سے صرف دو ہفتے پہلے سردار مہرزاد خان کے متعلق میڈیا میں خبر آئی کہ اس کا لاہور کی ایک کال گرل زرنگار سے گہرا تعلق ہے، اتنا گہرا کہ اس کال گرل کی قربت کے لیے مہرزاد خان لاکھوں لٹانے پر بھی تیار رہتا ہے۔

"لے یہ ہو ٹریٹ آف ریڈ لائٹ ایریا۔" تابندہ نے یہ خبر سن کر... یشل رئیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہاری اگلی تحقیق کا عنوان یہ ہوگا؟"

"ریڈ لائٹ ایریا پر مزید کیا تحقیق کرنی، دنیا کی تحقیق کی تاریخ بھری پڑی ہے اس عنوان سے۔" یشل نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہیں کون یہ محترمہ جن کی زلف کے اسیر یہ لیڈی کلر صاحب ہیں۔" تابندہ نے کہا۔

"پتا نہیں۔" یشل جو صوفے پر لیٹی تھی اٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن یہ کوئی بہت ہی اونچی شے ہوگی کیونکہ

جس مہر زاد خان کو میں جانتی ہوں وہ اسٹینڈرڈ پر کمپرومائز نہیں کرسکتا۔"

"اوہو......" تابندہ بے اختیار ہنسی۔ "اسٹینڈرڈ وہ بھی ایک courtesan (بازاری عورت) خصوصاً کسی امیر کی نور نظر کے لیے۔"

"یقیناً......" یشل اپنی بات پر قائم تھی۔ "اس کا اسٹینڈرڈ ہر معاملے میں مختلف اور اونچا ہے اور وہ اس پر کمپرومائز نہیں کرتا اگرچہ یہ خبر بہت شاکنگ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس لڑکی میں کوئی بہت ہی خاص بات ہوگی جو مہر زاد خان وہاں چلا گیا اس کے پیچھے۔"

"اتنی خوش گمانی!" تابندہ نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، اتنی خوش گمانی۔" یشل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ اس بات میں ضرور کوئی اہم نکتہ ہے، میڈیا اور اس کے مخالفین تو ضرور اس اسکینڈل کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں گے مگر حقیقت کچھ اور ہے۔"

"کیا تم اب بھی اس کے لیے کالم لکھوگی اور صحافیوں کے سوالوں کے جواب دوگی؟" تابندہ کا سوال اہم تھا۔

"میں اسی کام کے تو پیسے کماتی ہوں، ظاہر ہے میں ایسا ہی کروں گی۔" یشل نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "یہاں تو جو انتہائی غلط ہوتا ہے اسے درست اور سچا بنا کر پیش کردیا جاتا ہے۔ یہ تو غلط ہے ہی نہیں، اسے درست ثابت کرنا کون سا مشکل ہوگا۔"

"اتنا اعتماد!" تابندہ نے دوبارہ اسی معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں، اتنا اعتماد۔" یشل نے اسی مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

"مجھے ذاتی زندگی کے بخیے ادھیڑے جانے پر کوئی حیرت نہیں۔" اسی شام جب مہر زاد خان سے یشل کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا ایسا ہوگا بلکہ میں حیران تھا کہ ایسا اب تک ہوا کیوں نہیں۔"

"آپ ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے؟" یشل نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔

"نہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر وہ چیخ رہے ہیں۔" یشل نے اسے یاد دلانا چاہا۔

"انہیں چیخنے دو۔" وہ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم پریشان ہو کیا؟" پھر اس نے ذرا رک کر سوال کیا۔

"نہیں۔" یشل نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "مگر ہمیں اپنی حکمتِ عملی سوچنی ہوگی۔"

"کچھ بھی نہیں سوچنا۔" مہر زاد خان نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "اس کا بندوبست مشکل نہیں، تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ اسے کسی ایکسپوژر سے بچانا ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے؟" یشل کی خاموشی پر اس نے خود ہی سوال کیا۔

"جی بالکل، میں سمجھ گئی ہوں۔"

"اور کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے ایک فیور دوگی؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔ جواب میں یشل نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اگر تم سے درخواست کروں کہ میں اب کچھ عرصے اس تک نہیں جاسکتا اور اگر یہ ممکن ہو کہ تم اس کی تسلی کے لیے......"

"میں سمجھ گئی سر، میں ضرور، آپ یقین رکھیں۔" یشل نے اٹکتے ہوئے ایک ادھورا سا جواب دیا۔

"تمہارا جواب ڈی کوڈ ہوگیا۔" وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ممنون ہوں گا۔"

☆☆☆

"آرٹ ایک محدود میدان ہرگز نہیں ہے۔" دانیال کہہ رہا تھا۔ "نہ ہی زبان کی حدود کا کوئی اندازہ کرسکا ہے اب، یہ دونوں چیزیں یونیورسل ہیں، ہاں ان دونوں کا انداز جدا جدا ہے مختلف خطوں میں۔"

"تم کتنی قسم کے آرٹ کو اور کتنی زبانوں کو جانتے ہو؟" بینش نے سوال کیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیپارٹمنٹ کے ہال میں منعقد ہونے والی تصویری نمائش دیکھ کر باہر نکلے تھے۔

"سب کو جاننے کے لیے کتنی ہی زندگیاں اور لمبی عمریں چاہیے ہوتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"پھر بھی۔" بینش نے دوبارہ پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں سیکھنے کے عمل میں ہوں بینش۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ وہ یونیورسٹی گیٹ سے نکل کر مال روڈ پر نکل آئے تھے۔ "میرے ساتھ لنچ کروگی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"میرے خدا!" بینش کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔" اس کے دماغ نے سوچا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "پھر کبھی سہی، تمہیں یونیورسٹی بس پکڑنی ہے ناں۔"

"مجھے لنچ کرنا ہے۔" بینش نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی آواز اجنبی سی لگ رہی تھی۔

"نہیں...... اگر دل نہیں مانتا تو یہ کوئی ضروری نہیں۔"

"آپ کو کہاں لنچ کرنا ہے؟" بینش نے اس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھے لے کر چلیں گے؟"

"اوہ شیور۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کروایٹرز کیفے جارہا تھا، چلوگی؟ آؤ ان کی آرٹ گیلری بھی دکھاؤں تمہیں۔"

بینش بہت بہادر اور بے جھجک لڑکی نہیں تھی۔ دانیال کے ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور یوں پکڑ لیے جانے کا ڈر تھا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہو۔ مال کی بے حد گنجان ٹریفک کی وجہ سے انہیں کئی جگہ رکنا بھی پڑا تھا اور اپنے اردگرد دوڑتی بھاگتی گاڑیوں میں بیٹھے اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگ خواہ مخواہ ہی اسے آشنا اور جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ اپنے محلے سے اپنے رشتے داروں میں سے کوئی اگر دیکھ لے تو وہ سوچتی رہی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی اور جو سیکھنا چاہتی تھی جیسی ہوجانا چاہتی تھی اس کے لیے اسے اپنی جھجک پر قابو پانا ہوگا۔ وہ ایک نئی دنیا سے متعارف ہوئی تھی اور اس دنیا کی باسی بننا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اسے لوگوں کی نیتوں پر اعتماد کرنا تھا اور کچھ ایسی ممنوعہ روایتوں کو قبول کرنا تھا جو اس نئی دنیا میں بسنے کے لیے اس کی مددگار ثابت ہوسکتی تھیں۔

اس تیز رفتار اور گنجان ٹریفک کے درمیان سے گزر کر وہ کروایٹرز آرٹ گیلری پہنچے تھے، بینش نے یہ گیلری پہلی مرتبہ دیکھی تھی، یہاں کئی لوگ دانیال کے جاننے والے تھے، وہ ان سے بینش کو ایک باہنر طالب علم کے طور پر متعارف کرواتا رہا، وہ سب لوگ آرٹ کی دنیا سے متعلق تھے، وہ دانیال کی اتنے سارے لوگوں سے

واقفیت پر حیران تھی پھر دانیال نے اسے پارسی فوڈ سے متعارف کروایا اور اسے آرٹ سے متعلق مختلف نئی باتیں بتاتا رہا۔ یہ سب بینش کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دانیال کی کمپنی کی متمنی تھی، دانیال نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھنا اور سیکھنا چاہتی تھی اور اسے یہ سب دیکھنے اور سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ دل کی خوشی سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

''آپ اس ڈیپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟'' کھانے کے دوران اس نے دانیال سے پوچھا تھا۔

''خیالی پلاؤ پکاتا تھا ہواؤں میں اڑتا تھا۔'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔ اس روز بینش نے پہلی مرتبہ غور کیا تھا، دانیال کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی جو بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس کے لہجے اور عمل میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا، ایسا اعتماد جس کے سامنے ہر شخص مرعوب ہو جایا کرتا، وہ دن بینش کے لیے بہت اہم ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

علینہ ماسٹرز کی کلاس جوائن کر چکی تھی اور خاصی مصروف ہو چکی تھی۔ اس کی زندگی سے بوریت اور بے مصرف ہونے کا احساس بھی غائب ہونے لگا تھا اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر اعتماد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے دل لگا کر پڑھنے کا عہد کیا تھا اسی لیے اسے پڑھائی میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ وہ کبھی نہیں بھولی تھی کہ اس کے اعتماد کو بڑھانے میں اور سب باتوں کے علاوہ فہد کا بہت ہاتھ تھا اگر فہد سے اس کا رابطہ نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے لیے کچھ بھی نہ سوچ پاتی۔ سارے دن کی مصروفیت کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے فہد سے بات کرنا نہیں بھولتی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اپنے ہر کام میں اسے فہد کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''کیا میں تمہارے بیٹے کو دیکھنے آ سکتی ہوں عافیہ بیٹی ؟'' انہیں یہ آواز مانوس تو لگی تھی لیکن وہ فون کرنے والی کو پھر بھی پہچان نہیں پائی تھیں۔

''مجھے افسوس ہے، میں آپ کو پہچان نہیں پائی۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''میں اس روز صوفی صاحب کے ہاں تم سے ملی تھی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''اوہ......'' عافیہ کو فوراً یاد آ گیا۔ ''کیوں نہیں، آپ ضرور آئیں، میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' انہوں نے کہا اور فون بند کر کے دانیال کی طرف مڑیں۔ وہ اسی طرح مشینوں کے ذریعے سانس لیتا ان کے سامنے تھا۔ اس کے قریب رکھی کرسی پر قیوم بیٹھا تھا، اس کی نظریں بھی دانیال کے چہرے پر جمی تھیں۔

''آپ بھی فخر محسوس کریں گے سر کہ آپ نے ایک ایسے لڑکے کو ٹرین کیا جو ورلڈ بک آف ریکارڈز میں نام ریکارڈ کروانے جا رہا ہے۔'' قیوم کے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔

''میں یہاں آیا تو صرف اِدھر کا جائزہ لینے تھا مگر یہاں آ کر میں نے محسوس کیا کہ میں تو اسی کام سے متعلق ہوں اور یہ مجھے سیکھنا ہے، میں آپ کے پاس سیکھنے آیا ہوں، کیا آپ سکھائیں گے؟''

''لوگ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے، ان دونوں میں ایک تیسری چیز کا بھی اضافہ کر لیں سر، محبت، جنگ اور جنون میں سب کچھ جائز ہے۔ مجھے فلائنگ کا جنون ہو گیا ہے سر اور اس کو سیکھنے کے لیے میرے نزدیک سب کچھ جائز ہے، مجھے اصول وضوابط کے کتابچے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔''

''ابھی تک تو کوئی لڑکی والا معاملہ نہیں، ابھی تو اپنے یہ sesna (سیسنا) ہی حسینائیں نظر آتی ہیں جن کے عشق میں، میں گرفتار ہو گیا ہوں۔''

آوازیں، باتیں، قہقہے، ہنسی، مذاق وہ سب جو کہیں فضاؤں میں گم ہو گیا تھا اور وہ شخص جو بولتا، ہنستا اور مسکراتا تھا ایک زندہ لاش کی صورت ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ سب اتنے بے بس تھے، اتنے بے بس کہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور صرف کسی معجزے کے منتظر تھے۔ عافیہ نے قیوم کو ان خاتون کے بارے میں بتایا جو انہیں صوفی صاحب کے ہاں ملی تھیں۔

''بہت دعا کی ضرورت ہے، بہت دعا کی۔'' قیوم نے کہا۔

''وہ بھی نیک خاتون معلوم ہوتی تھیں، میرا دل اچانک چاہا کہ وہ یہاں آ کر دانیال کے لیے دعا کریں۔'' عافیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''ماما پلیز!'' ان کے دوسرے بیٹے عاصم نے انہیں شانوں سے تھام لیا۔ ''آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اب آپ نہیں روئیں گی، پلیز ماما۔''

''میں رو نہیں رہی ہوں بیٹا، میں امید و یاس کے ایک ایسے چکر میں پھنسی ہوں کہ مجھے ذرا سی روشنی بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور میری آنکھیں جھلملانے لگتی ہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا ماما، پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔'' عاصم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، بس اب میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اسی شام آزاد کشمیر والی خاتون بیگم اکرام اللہ اپنی پوتی کے ساتھ ان کے پاس آئیں۔ یقیناً دانیال کی حالت دیکھ کر انہیں جھٹکا لگا تھا۔ شاید وہ اتنی بری صورتِ حال کی توقع نہیں کر رہی تھیں مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

''اللہ کی مہربانی سے نا امید مت ہونا بیٹی، نا امیدی گناہ ہے۔ امید و بیم کی یہ صورتِ حال تمہاری آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ کیا معلوم آزمائش پر پوری اترو تو خدا تم پر بڑا اکرم کر دے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

''آپ بھی دعا کیجیے، میں بڑی آزمائش میں پڑ گئی ہوں، خدا میرا امتحان ٹال دے۔'' انہوں نے دانیال کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیگم اکرام اللہ جنہیں عافیہ اب خالہ جان کہہ کر پکار رہی تھیں نے اپنی کرسی دانیال کے قریب کر لی۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہی تھیں، اس اثنا میں عافیہ ان کی پوتی سے باتیں کرتی رہیں۔ بیگم اکرام اللہ نے عافیہ کو دانیال کے لیے پڑھنے کی کچھ دعائیں بتائیں اور اس کے بعد اُن کا عافیہ کے پاس آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

''فریڈیز کیفے میں کوئی تمہارا منتظر ہوگا۔ اس سے ملنے کے لیے شام چھ بجے تم ضرور وہاں پہنچ جانا۔'' زرنگار نے مہرزاد خان کا میسج اپنے موبائل پر پڑھا۔

''وہ کون ہو سکتا ہے جو میرا منتظر ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ اس پیغام نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا.... مہرزاد خان کو اِدھر آئے کافی دن گزر چکے تھے اور امراؤ بیگم کا اس پر دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ امراؤ بیگم اب ہر حال میں زرنگار کو اپنی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بنانا چاہتی تھی، زرنگار کے مسلسل انکار نے اب اسے برافروختہ کر

ڈالا تھا۔ اب تک اس نے زرنگار کے ساتھ انتہائی نرم اور مشفقانہ رویہ روا رکھا تھا، وہ جانتی تھی کہ زرنگار پڑھی لکھی تھی اور اس کا دور دور تک اس پیشے سے کوئی تعلق نہ تھا، ایسی لڑکیاں اس ماحول سے مانوس ہونے میں بہت وقت لیتی تھیں اور ان کی تربیت ایک صبر آزما کام تھا، زرنگار خوب صورت تھی اور اسے گفتگو کا ڈھنگ آتا تھا، وہ اس نادر ہیرے سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ اسے اپنی عقل پر غصہ بھی آتا تھا، وہ کیوں مہرزاد خان کے دیے لالچ میں آ گئی تھی۔ مہرزاد خان سے کیے قول سے پھرنا بھی اس کے لیے مشکل تھا، وہ اس پس منظر سے تعلق رکھتا تھا جہاں گولی کی موت ایک معمولی اور عام سی بات سمجھی جاتی تھی۔ امراؤ بیگم کا یہ نیا ٹھکانا مہذب امرا کے رہائشی علاقے میں تھا، یہاں ایسا کوئی جھگڑا فساد اس کے بوریا بستر گول ہو جانے کے مترادف ہوتا۔ وہ اسی لیے زرنگار کو دبے لفظوں میں اکساتی تھی مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ زرنگار کی نگاہیں مہرزاد خان کی شخصیت سے پرے کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ اس کے جال میں الجھ گئی تھی۔ یہ بات خطرے کی علامت تھی، امراؤ بیگم جانتی تھی کہ پیشہ ور عورت صرف ایک کے بستر کی ہو جائے تو اس کی تباہی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ وہ اپنی بیٹیوں اور اپنے پاس موجود دوسری لڑکیوں کو ایسی بے شمار کہانیاں سناتی رہتی تھی جن میں چند روز کے مہمانوں کے جال میں پھنس جانے والیوں کی تباہی کا قصہ ہوتا۔ ”طوائف شریف خاندانوں کی فرد کبھی نہیں بن سکتی، جو ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے منہ کے بل گرتی ہے۔“ اس کی ہر کہانی کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا تھا اس کے پاس موجود لڑکیاں اس سنہری قول کو سمجھ چکی تھیں مگر زرنگار کا معاملہ اور تھا جتنی وہ خوب صورت تھی، اتنا ہی زیادہ اس کا نخرہ تھا، اس کے اور چھور کی امراؤ بیگم کو کم ہی سمجھ آتی تھی مگر یہاں موجود ہونے کے سلسلے میں زرنگار ابتدائی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد مکمل شکست قبول کر چکی تھی اس لیے امراؤ بیگم اس کے یہاں سے فرار ہو جانے کا سوچ کر کبھی پریشان نہیں ہوتی تھی اسی لیے وہ جب بھی اور جہاں بھی جانے کا کہتی تھی امراؤ بیگم اسے گاڑی اور ڈرائیور فوراً مہیا کر دیتی تھی۔

اس شام بھی زرنگار نے امراؤ بیگم سے گاڑی اور ڈرائیور مانگے تھے جو اسے فوراً مل گئے تھے۔ زرنگار مہرزاد خان کے غائب ہو جانے پر پریشان تھی اسی لیے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کی پتلی ہلنے لگی تھی اور دائیں پاؤں کا انگوٹھا بھی حرکت کرنے لگا تھا، اپنے اردگرد گونجنے والی کسی بلند آواز پر اس کا جسم ردِعمل ظاہر کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹرز نے عافیہ اور جہانگیر کو یہ بات انتہائی خوشی کی ساتھ سنائی تھی۔

”یہ بڑی کامیابی ہے، ہم چاہتے تھے کہ وہ ایسے ہی ردِعمل ظاہر کرے، اب آگے قوی امید ہے۔“ ڈاکٹر سرفراز نے انہیں بتایا تھا۔

”اب آگے کیا ہوگا؟“ عافیہ کے لیے چھوٹی سی کامیابی کی یہ خبر بھی بہت اہم اور بڑی تھی۔

”جسم کے حیاتی نظام کا تعلق براہِ راست دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دانیال کے ردِعمل ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا دماغ ویوز کو وصول کر رہا ہے، اب اس میں آگے مزید بہتری پیدا ہوگی انشاء اللہ جس روز وہ ویوز کو وصول کرنے لگ گیا، اسی روز اس کی تیزی سے صحت یابی کی صورت پیدا ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر سرفراز، جہانگیر کو سمجھا رہے تھے۔

”آپ فکر نہیں کریں مسز جہانگیر، ایک روز آئے گا جب دانیال اٹھ کر چلے گا۔ نہ صرف چلے گا بلکہ آرٹ کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔“ اب وہ عافیہ کو تسلی دے رہے تھے۔ عافیہ اب صرف دانیال کی صحت اور زندگی کی خواہش مند تھیں، آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرنے کی خواہش کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتیں، کیا کبھی اپنی زندگی میں وہ دانیال کو صحت مند اور چلتا پھرتا دیکھ سکیں گی۔ اس سوال کے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا اور جہاں سے اس سوال کا جواب آنا تھا وہاں ان کی دستک روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔

بیگم اکرام اللہ واپس آزاد کشمیر جا چکی تھیں مگر ان کا عافیہ سے مسلسل فون پر رابطہ رہتا تھا۔ ان کی شخصیت میں عافیہ کو نہ جانے کیوں ایک پناہ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ان کی باتیں دھیان سے سنتی اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتیں اور انہیں محسوس ہوتا تھا کہ دانیال کے ساتھ ہونے والے حادثے نے انہیں جس شدت کی بے چینی اور بے سکونی میں مبتلا کر دیا تھا، بیگم اکرام اللہ کی کہی باتوں پر عمل کر کے ان کی بے چینی اور بے سکونی کی شدت میں کمی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اب اس بات کو بھی خدائی مدد سمجھنے لگی تھیں کہ ان کی ملاقات بیگم اکرام اللہ سے ہو گئی۔ ان کے اپنے حلقے میں ایسی کوئی شخصیت موجود نہیں تھی جو ان کے دکھ کو اس طرح محسوس کرتی جیسے بیگم اکرام اللہ نے کیا تھا۔

☆☆☆

”تمہیں سیاست میں کوئی دلچسپی ہے؟“ اس روز دانیال نے اچانک بینش سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ بینش نے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا تھا۔ وہ ابھی مشاہدہ کرنے میں مصروف تھی اس لیے مختصر بات کرتی تھی۔

"کیوں؟"

"بس یونہی کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ کو ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں!" وہ مسکرایا۔ "مجھے ہے، میں دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں کے حالات پڑھتا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مختلف کامیاب سیاستدانوں کی شخصیتوں میں کیا چیز، کیا بات مشترک ہے۔"

"پھر آپ کو پتا چلا؟" بینش نے پوچھا۔

"ہاں پتا چلا اور اتفاق سے کچھ باتیں سب میں مشترک ہیں، اسی لیے جب میں کسی نئی سیاسی شخصیت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کامیاب رہے گی یا نہیں۔"

"یہ تو بہت اہم بات ہے۔" بینش نے بے ساختہ کہا۔

"اب اس شخصیت کو دیکھو۔" اس نے صبح کا اخبار کھول کر میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سردار مہر زاد خان ہے، آج کل اس کا نام مستقبل کے ایک بڑے سیاستدان کے طور پر لیا جا رہا ہے۔" بینش نے اخبار اپنے سامنے کھسکایا، یہ چہرہ اس نے ایک دو بار ٹی وی کے ٹاک شوز میں دیکھا تھا۔

"کیا خیال ہے یہ کامیاب رہے گا یا نہیں؟" بینش نے پوچھا۔

"بہت کامیاب رہے گا۔" دانیال نے یقین کے ساتھ کہا۔

"مگر یہاں تو اس کے کسی اسکینڈل کا ذکر ہے، کیا اسکینڈلائز شخص ہی کامیاب سیاستدان بن سکتا ہے؟" بینش نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

"کچھ اسکینڈلز شخصیات کو اہم بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔" دانیال نے کہا۔ "اور آج کل تو اسکینڈل بنائے ہی اوور پروجیکشن کے لیے جاتے ہیں۔"

"مگر یہ تو کسی کال گرل......" بینش کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں یہ بات اہم ہے، اب دیکھنا یہ پڑے گا کہ یہ خاتون کون ہیں؟" دانیال نے اخبار پر دوبارہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کیسے دیکھیں گے جبکہ یہاں اس کا کوئی نام نہیں، مشکل نہیں ہے؟"

"دیکھ لیں گے، دیکھ لیں گے، یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں، اس کا پتا بھی چل ہی جائے گا۔" اس نے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کال گرلز کے متعلق کیسے پتا چلتا ہے اور کہاں سے پتا چلتا ہے؟" بینش پوچھنا چاہتی تھی مگر ایسا کوئی سوال کرتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوئی اور اس نے اس سوال کو دل ہی میں رہنے دیا لیکن یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا۔ دانیال اس لڑکی کے متعلق کہاں سے اور کیسے پتا کرے گا۔ وہ اتنے عرصے میں اپنے محلے سے باہر کی دنیا کے بارے میں کافی کچھ جان گئی تھی اور اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے روز بروز بڑھتے اعتماد میں دانیال کی دوستی کا بڑا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

نادر نے خود سے کئی مرتبہ یہ سوال کیا تھا کہ اس نے زوئی سے نکاح کیوں کیا۔ کیا وہ زوئی کی بے بسی سے متاثر ہو گیا تھا؟ یا نیکی کمانا چاہتا تھا یا اس کے دل نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ زوئی جیسی بے ضرر لڑکی سے نکاح کرے۔ اسے خود سے کوئی حتمی جواب کبھی نہیں ملا تھا مگر یہ بات طے تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی یہ نہیں سوچا

تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام خصوصاً شادی جیسا اہم کام کرے گا مگر اب وہ ایسا کر چکا تھا۔

زوئی کے گھر سے واپسی پر اس کی آپا نے اسے سخت سست سنائی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اسے زوئی جیسی معمولی شکل اور دوسری تہذیب سے تعلق رکھنے والی لڑکی سے شادی کرنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ اس بات کو سوچ کر بھی برافروختہ ہوتی رہتی تھیں کہ زوئی سے شادی کے نتیجے میں وہ ایک مخلوط نسل کو دنیا میں لانے کا باعث بنے گا جو اُن کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ آپا نے واپس آ کر امی کو بھی اس سلسلے میں بھڑکا دیا تھا اور بات بالکل ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ نادر کے والد کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا تھا، وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور بہنوں کا بہت لاڈلا بھی۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلے میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد فارمیسی کی تھی اور اب اسی دوا ساز ادارے سے منسلک تھا جہاں زوئی کام کرتی تھی۔ گھر میں وہ اپنی امی کے ساتھ رہتا تھا، اتفاق سے اس کی پانچوں بہنیں لاہور میں ہی رہتی تھیں اور اکثر و بیشتر اپنی والدہ کے پاس ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ حقیقت میں گھر کا سارا انتظام بہنوں کے مشوروں پر ہی چلتا تھا، ایسے میں نادر کا اپنی بات پر اصرار کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ زوئی سے شادی کے خیال کو دل سے نکال نہیں پایا۔ شاید اسی لیے اس نے زوئی کی واپسی کے پیشِ نظر عجلت میں وہ فیصلہ کر لیا تھا جس پر بعد میں وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا مگر اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بہت دن سوچتے رہنے اور پریشان رہنے کے بعد اس نے یہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ اپنے گھر میں اس نے پھر کبھی زوئی کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ خود زوئی سے اس کا نیٹ پر رابطہ رہتا تھا۔ وہ بار بار اپنے شکر گزار ہونے کا اظہار کرتی اور اسے جلد از جلد کاغذات مکمل کروانے کی تاکید کرتی، وہ یقیناً فوری طور پر واپس آنا چاہتی تھی۔ نادر اس سلسلے میں اپنے کسی قریبی دوست کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھا کہ کس دوست سے بات کرے اس کی امی کی طبیعت بگڑ گئی، وہ سردی لگ جانے کے باعث نمونیے کا شکار ہو گئی تھیں، نادر اُن کی تیمارداری میں مصروف رہا، اسی وجہ سے کئی دن نکل گئے۔

اس روز اس کا مکمل ارادہ تھا کہ وہ آفس جا کر اپنے قریبی دوست طاہر سے اس سلسلے میں بات کرے گا مگر وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا ہی تھا کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اسے بیرونی دروازے پر پہنچا دیا۔ اس کے سامنے تین نامانوس چہرے تھے۔

"ہم میر ال صلاح الدین کیس کے سلسلے میں آپ تک پہنچے ہیں۔" ان میں سے ایک نے اپنا کارڈ نادر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کون میر ال صلاح الدین؟" نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ نہ جانتے ہوں مگر آپ کی منکوحہ زوئی حسین ضرور جانتی ہیں۔" دوسرا شخص بولا۔

نادر کے عقب میں کھڑی بڑی آپا کے ہاتھ سے چھری چھوٹ کر نیچے جا پڑی۔

"ہمیں امید ہے آپ ہم سے تعاون کریں گے۔" پہلے شخص نے کہا۔

نادر کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ نادانستگی میں کچھ غلط کر بیٹھا تھا، بہت ہی غلط......

☆☆☆

اس اسٹیٹ آف دی آرٹ کچن میں وہ اپنی مرضی چلانے پر مختار تھا۔ اس کوکنگ چینل کے لیے ایک کوکنگ شو کرنے کا معاوضہ مہینے بھر کا خرچہ عیاشی سے چلانے کے لیے کافی تھا اور وہ مہینے میں چار شو کیا کرتا تھا۔ شروع

میں اسے ان چار شوز کے لیے اتنی مغز ماری کرنی پڑتی تھی کہ کئی بار اس کا دل اس معاہدے سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا جو اس نے اس چینل سے کر رکھا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ وہ ان تمام اجزائے ترکیبی سے واقف ہو گیا جو مہینے کے چاروں شوز کو کامیاب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور اب تو یہ عالم تھا کہ وہ مختلف چینلز کے لیے ایک پُرکشش ذریعۂ آمدن کا نشان بن چکا تھا۔ ایک چینل سے معاہدے کی مدت پوری کرنے کے دوران اسے کئی چینلز سے پُرکشش ادائیگی کی دعوت مل چکی تھی مگر اسے ابھی ٹھیک طرح سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی کی ترجیحات کیا ہیں اور انہیں درجہ بدرجہ کس ترتیب سے رکھنا ہے۔

وہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک کشادہ، خوب صورت، نفاست اور جدید خطوط پر سجے اپارٹمنٹ کا مالک تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی کمپنی کی بہترین کار کا جدید ترین ماڈل موجود تھا، وہ ڈیزائنرز کلاتھ پہنتا تھا اور برانڈڈ جوتے اس کے پیروں کی زینت بنتے تھے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ یہ سب اسے بہت امیر ماں، باپ کی اولاد ہونے کے نتیجے میں ملا تھا نہ ایک پاکستانی کوکنگ چینل پر کوکنگ شو سے ملنے والے معاوضے کو جمع کر کے اس نے خریدا تھا۔ وہ پاکستان تقریباً گیارہ برس بعد واپس آیا تھا، اس کے والد اس وقت ایبٹ آباد چھوڑ کر تھائی لینڈ گئے تھے جب اس کی عمر صرف چھ برس تھی اس کے بابا تلاشِ روزگار میں تھائی لینڈ گئے اور چند سال وہاں گزارنے کے بعد اٹلی کا رخ کر گئے۔ تیرہ سال کی عمر تک وہ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہا، پہلے تھائی لینڈ اور پھر اٹلی سے آنے والے پیسوں کی بدولت ان کی زندگیاں آسان گزر رہی تھیں۔ پھر ماما کو کہیں سے اڑتی اڑاتی خبر ملی کہ بابا تھائی لینڈ چھوڑنے سے پہلے ایک مقامی تھائی خاتون سے عقدِ ثانی کر چکے تھے۔ ماما کا ردِعمل اچانک اور فہد کو بعد میں آنے والی عقل کے مطابق بچگانہ اور جذباتی تھا۔ ماما نے فی الفور ایبٹ آباد کا گھر چھوڑ دینے اور بابا سے لاتعلقی اختیار کر لینے کا اعلان کیا اور عجلت میں ایبٹ آباد چھوڑ کر نانا، نانی کے پاس کراچی شفٹ ہو گئیں۔ اس وقت فہد کی عمر تیرہ برس تھی۔ ایبٹ آباد اس کا اپنا شہر تھا، جہاں وہ پیدا ہوا اور تیرہ برس تک رہا تھا۔ وہاں اس کے دوست تھے، استاد اور اسکول تھا، وہ ان تینوں سے اتنا مانوس تھا کہ ایبٹ آباد سے چلے جانے کے بعد کئی مہینے مسلسل وہ بسترِ علالت پر ہی رہا تھا۔ اس کا بخار جانے کا نام نہ لیتا تھا اور قوتِ گویائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

''تمہاری ماں پر بڑا کڑا وقت پڑا ہے میری جان!'' نانی اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ ''تم اب بہت چھوٹے بچے نہیں ہو، تم بڑے ہو چکے ہو اور تمہیں اپنی ماں کا ساتھ دینا ہے۔''

''کڑا وقت پڑے تو لوگ اپنا گھر اور اپنا شہر تو نہیں چھوڑتے ناں؟'' وہ بخار سے سرخ پڑتی آنکھیں کھول کر کہتا۔

''چھوڑنا پڑتا ہے میرے بچے کبھی کبھار۔'' وہ اس کی پیشانی پر پڑے سیاہ بال پیچھے ہٹاتے ہوئے کہتیں۔

''تم اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لو کہ اب تم کو اپنی ماں کا اور چھوٹی بہن کا خیال رکھنا ہے۔'' نانی چپکے چپکے اسے یاد کراتیں۔

اس کے ذہن نے بہت آہستہ آہستہ زندگی میں در آنے والی تبدیلیوں کو قبول کیا تھا مگر قبول کر لینے کے اس عرصے کے دوران اس کے دل میں کئی بار بہت سے باغیانہ خیال بھی ابھرے تھے۔ گھر سے بھاگ کر واپس ایبٹ آباد چلے جانے کا خیال، اٹلی جا کر بابا کے پیٹ میں چھرا گھونپ دینے کا خیال، نانا کے ساتھ کبھی کبھار تفریح کے لیے ساحلِ سمندر پر جانے کے دوران سمندر میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر دینے کا خیال، کئی

سال بعد وہ اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو یاد کر کے تنہا بیٹھا ہنستا رہتا۔

کراچی آنے کے بعد ماما نے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی، وہ خود اور اس کی چھوٹی بہن نانا کے گھر کے قریب ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھنے لگے، اولیول کا خواب ادھورا رہ گیا۔ نانا نے اسے میٹریکولیشن کلاسز میں داخل کرا دیا۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ جو رقم بابا اب بھی بھجوایا کرتے، اسے قبول کیوں کیا جاتا تھا اور اگر قبول کر لیا جاتا تو پھر وہ اولیول جاری کیوں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرتے تھے مگر پھر ماما کی اچانک سے گرتی صحت نے اسے سوال کرنے، باغی خیالات کا شکار بننے اور ہر نئی صورتِ حال پر غصیلے ردِعمل ظاہر کرنے سے روک دیا۔ ماما کی کمزور صحت اور آئے دن بستر پر پڑ جانے کے معمول نے اسے دنوں میں احساس دلا دیا کہ وہ بڑا ہو چکا تھا اور اب ماما اور تحریم اس کی ذمے داری تھیں۔ نانا، نانی میں جب تک ہمت رہی، ان تینوں کا ساتھ دیتے رہے۔ نانی کی وفات کے بعد نانا بیمار اور چڑچڑے ہو گئے تو منجھلے ماموں ناروے سے آ کر انہیں اپنے ساتھ لے گئے، نانا کے ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر پر بڑے اور منجھلے ماموں نے کبھی اپنا حق نہیں جتایا، چھوٹے ماموں جو سری لنکا کی کسی علاقائی کرکٹ ٹیم کے کوچ تھے نے اپنی نوکری سے فارغ ہونے کے بعد ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر پر اپنا حق جتایا۔ اس وقت تک فہد خود ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں تھا اور تحریم میڈیکل کالج کے تھرڈ ائیر میں تھی۔ ماما کو معدے کی تکلیف نے کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، آمدنی کا ذریعہ تھائی بھات اور اطالوی لیرے، بچا کر جمع کیے ہوئے وہ اکاؤنٹس تھے جن سے ماہانہ منافع کی شکل میں پیسے مل جاتے تھے۔ بڑے اور منجھلے ماموں کے سمجھانے کے باوجود چھوٹے ماموں اپنے دعوے سے دست بردار نہ ہوئے تو وہ بیمار ماں اور بہن کو لے کر ایک ایسے بڑے مکان میں شفٹ ہو گیا جہاں کئی فیملیز ایک، ایک کمرے میں کرائے دار کے طور پر رہتی تھیں۔ وہ بھی ایک کمرے میں اپنا مختصر سامان سیٹ کر کے رہنے لگے۔

بابا تک ان حالات کی خبر کس نے پہنچائی وہ نہیں جانتے تھے لیکن ایم بی اے فائنل کے امتحان کے فوراً بعد انہوں نے اسے تھائی لینڈ بلا لیا تھا۔ وہ اٹلی سے واپس تھائی لینڈ آنے کے بعد وہاں اپنا ایک ریسٹورنٹ چلا رہے تھے۔ فہد نے اس وقت پہلی بار اپنے باپ کو ایک بالغ ذہن اور نظر کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اسے ایسے بھی بے نیاز اور لاتعلق انسان نہیں لگے تھے جیسا ماما نے انہیں اتنا عرصہ ثابت کیے رکھا تھا۔ ایک دو بار انہوں نے اسے اپنی کسی مجبوری کی داستان سنانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس نے ان کی مجبوریوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ جو گزر چکا تھا وہ اس کتاب کے صفحے پلٹانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کے پاس اس کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔ اسے آگے بڑھنا تھا، اسے اتنا پیسہ کمانا تھا جس سے ماما کا علاج تواتر سے جاری رہ سکے اور تحریم کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ ایک مقصد زندگی میں آ جانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بابا کے ریسٹورنٹ کو چلانے کا تجربہ اپنی جگہ، ریسٹورنٹ کے شیف سے دوستی نے اس کا دھیان کھانا بنانے اور کھانا بنانے میں ورائٹی لانے کی طرف لگا دیا۔ وہ فنانس اور بزنس بھول کر اس نئے میدان کا کھلاڑی بن گیا۔ تھائی لینڈ سے بنکاک، بنکاک سے اٹلی، اٹلی سے آسٹریلیا، چین اور پھر دبئی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے میں صرف دو سے ڈھائی سال لگائے۔ تحریم ڈاکٹر بن گئی اور اس کی کامیابی کو اس کے ساتھ مل کر منانے کے لیے جب وہ پاکستان آیا تو اس کے پاس مختلف درجوں کے کوکنگ کورسز کے اتنے بے شمار سرٹیفکیٹس تھے کہ اس نے خود کو شہر کے ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ سرکل میں ایک سرٹیفائڈ کک کے طور پر جلد ہی متعارف کروا لیا۔ انہی دنوں اسے دو مختلف جگہوں سے دو پُرکشش جابز کی پیشکش ہوئی۔ ایک پرائیویٹ بینک کے ٹریژری مینیج پر کام کرنا اس کی

دیرینہ خواہش تھی، اس وقت بھی یہ خواہش اس کے دل میں ابھرتی تھی جب وہ آئی بی اے سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ دوسری پیشکش ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہفت واری براہِ راست کوکنگ شو میں باقاعدہ تنخواہ پر حصہ لینے کی تھی۔ یہ دو ایسی آفرز تھیں جنہیں بیک وقت قبول کر لینے اور نبھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے بابا کے پاس واپسی کا ارادہ موخر کرتے ہوئے یہ دونوں آفرز قبول کر لیں۔ اس کے پاس گھاٹ گھاٹ سے جمع کیا ہوا پیسہ بھی تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کو اے کلاس لیونگ دینے کے قابل تھا۔ مختلف خاندانوں کے ساتھ ایک مشترکہ گھر کا ایک کمرا شیئر کرنے کے اسٹیٹس سے اٹھ کر وہ اس لگژری اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جو اس نے سی وی میں کرائے پر لیا تھا۔ وہ دونوں جابز جنہیں اس نے اپنے گزشتہ تجربوں کی روشنی میں بخوبی نبھانا شروع کیا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس کا حجم بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ تحریم اور ماما، اس کو جب شیف نائف سیٹ کی مختلف چھریوں سے سبزیوں کی کٹائی اور گوشت کے باریک نفیس پارچے کاٹتے دیکھتیں تو انگشت بدنداں رہ جاتیں۔ تحریم اسے ایک بڑے فنکار کا ٹائٹل دیتی تھی جبکہ ماما کو اس کا یہ ہنر پسند نہیں آیا تھا۔

”تم وہ کام اتنے فخر سے کرتے ہو جن کے لیے شرفا اور امرا خانساماں تنخواہ پر رکھا کرتے تھے۔“ وہ ناراض لہجے میں کہتیں۔

”آپ غور کریں تو دنیا کا ہر جدید پیشہ، کسی ایسے ہی قدیم پیشے کی ترقی یافتہ شکل نظر آئے گا جس کے لیے شرفا اور امرا موتیوں کی مالائیں اور اشرفیوں کی پوٹلیاں دان کیا کرتے تھے۔“ اس نے ایک بار مسکرا کر ماما کو جواب دیا تھا۔ ماما اس کے جواب سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ اگر اس کے اس شوق کے ساتھ ساتھ اس کی بینک جاب نہ چل رہی ہوتی تو یقیناً ان کے دل میں اس کی کمائی کے حوالے سے ایک دکھ کا احساس زیادہ شدید ہوتا لیکن اس کے شوق اور ہنر پر ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے ماما زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں۔

پاکستان واپسی کے چھ ماہ بعد معدے کا کینسر جس سے وہ کئی سالوں سے لڑ رہی تھیں۔ بالآخر ان کی زندگی کو شکست دے گیا۔ وہ بابا سے علیحدگی اختیار کرنے پر، ایبٹ آباد والا گھر چھوڑ آنے پر اور ماما کے خود کو عام سے اسکول میں داخل کرا دینے پر کتنا ہی ناراض کیوں نہ تھا، وقت گزر جانے کے ساتھ ساتھ اسے انسانوں کے ان ایسے عملوں اور ردِعمل کی وجوہات سمجھ آنے لگی تھیں جن کو وہ اس ناپختہ عمر میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اگرچہ وہ اب بھی سمجھتا تھا کہ ماما، بابا کی دوسری شادی کو ایک حقیقت جان کر قبول کر لینے کے بعد بابا ہی کی کمائی پر بہت بہتر زندگی بھی گزار سکتی تھیں مگر وہ ماما کے دل ٹوٹ جانے کی کیفیت کو کسی پیمانے کے ذریعے جان نہ سکنے کو اپنی ناکامی گردان کر انہیں بھی اتنے ہی نمبر دینے لگا تھا جتنے دوسری صورتِ حال کو دیتا تھا۔

ماما کے انتقال کے چھ ماہ بعد تحریم نے اپنے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ تحریم کے شوہر کا ایک بھائی امریکا میں رہتا تھا۔ اس نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے پاس بلوا لیا۔ یوں پاکستان آنے کے صرف ایک ڈیڑھ سال کے اندر وہ اس شہر میں تنہا رہ گیا جس کی طرف ہجرت کے لیے آج بھی اس کے دل میں اتنی ہی کڑواہٹ تھی جتنی پہلی بار یہاں آنے کے وقت تھی لیکن اس نے اب تک خود کو ملکوں اور شہروں کے مزاجوں میں بسا لینے کا ہنر بھی جان لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں قدم جمانے کی جدوجہد کے سارے تجربے کو ایک جملے میں سمو کر کہا کرتا تھا۔

"when there is an aim, there is a heart"

(جہاں زندگی میں کوئی مقصد شامل ہو جاتا ہے، وہاں اس مقصد کو پا لینے کے لیے دل بھی حوصلہ پکڑ لیتا ہے)

تحریم کے چلے جانے کے بعد اس نے خود کو مزید مصروف کر لیا، جس چینل پر وہ اب تک ہفتہ وار کوکنگ

کر رہا تھا اس کی طرف سے بھی اسے انہی دنوں آفر آئی تھی، جن دنوں وہ آسٹریلیا میں تھا، ایک بار اس نے ایک چینل پر ہونے والے ماسٹر شیف مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اسے ان پروگرامز کی شوٹنگ کے دوران بہت مزہ آتا تھا، وہ مقابلہ تو خیر وہ نہیں جیت سکا تھا مگر اس پروگرام کی شوٹنگ کے دوران ہونے والے تجربات اس کی زندگی کے دلچسپ ترین تجربات میں شامل تھے۔ اسی لیے اس نے اس چینل کی آفر بھی قبول کر لی۔ اس اسٹیٹ ٹو آرٹ قسم کے کچن میں کوکنگ کرنا، ناظرین کی کالز سننا اور ان کا جواب دینا بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا اور اسی تجربے کے دوران اتفاق سے اس کا ناتا ایبٹ آباد سے پھر جڑ گیا تھا۔ اس کی بچپن کی کلاس میٹ علینہ سے اس کا رابطہ قائم ہوا اور علینہ سے ایبٹ آباد اور اس شہر کی یادیں ذہن میں دوبارہ زندہ ہونے لگی تھیں، انہی خوب صورت یادوں میں ایک یاد میرال کی بھی تھی۔ میرال جسے اپنے ایبٹ آباد کے زمانہ طالب علمی میں وہ اس کی ذہانت اور خود اعتمادی کی وجہ سے آئیڈیلائز کیا کرتا تھا۔

☆☆☆

مہر زاد کے کہنے پر اس کے بتائے ہوئے ریستوران میں پہنچنے تک اس کے ذہن میں سوال تھے اور وہ انتشار کا شکار بھی تھا۔

”میرا منتظر، مہر زاد کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“ خدشے بھی تھے اور اعتماد بھی تھا۔ ”مہر زاد کسی غلط انسان کو مجھ سے ملاقات کے لیے نہیں بھیج سکتا۔“ فریڈیز کیفے کے انٹرنس پر کھڑے ہو کر اس نے آخری بات سوچی تھی اور ذہن سے تمام سوال اور خدشات جھٹک کر اس ٹیبل کی طرف بڑھ گئی جس کے بارے میں اسے ریسیپشن پر بتایا گیا تھا اس کے لیے ریزروڈ تھی۔ اس ٹیبل پر ایک لڑکی اس سے پہلے بیٹھی اپنے موبائل پر مصروف تھی۔ ذہن ایک بار پھر کنفیوژن کا شکار ہوا لیکن اب وہ اِدھر آ چکی تھی اس لیے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں زرنگار ہوں۔“ اس نے دھوپ کا چشمہ میز پر رکھتے ہوئے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔

”اوہ!“ لڑکی کا دھیان موبائل فون کی اسکرین سے ہٹا۔ ”آئی ایم سوری مجھے خبر نہیں ہوئی آپ آ چکی ہیں۔“

”جی میں دیکھ چکی تھی کہ آپ اپنے کام میں محو تھیں۔“ اس نے کہا۔

”میں بس آپ کے انتظار میں تھی اور اسی انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے دھیان اِدھر لگا لیا۔“ اس نے خجل ہوتے ہوئے فون بند کیا اور سر اٹھا کر زرنگار کو دیکھنے لگی۔

”کیا میں آپ سے تعارف حاصل کر سکتی ہوں اور کیا آپ وہی ہیں جنہیں سردار مہر زاد نے یہاں مجھ سے ملاقات کے لیے بھیجا ہے۔“ زرنگار نے اس کی محویت توڑتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں ضرور!“ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اپنے موبائل فون پر کچھ الفاظ ٹائپ کیے اور زرنگار کی نظروں کے سامنے فون رکھ دیا۔

”میرا نام ییشل رئیس ہے اور میں سردار مہر زاد کی پرسنل سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی ہوں۔“ زرنگار نے وہ ٹائپ شدہ الفاظ پڑھے اور ہلکا سا مسکرائی۔

”اوہ...... اس کا مطلب آپ سردار مہر زاد کا دفاع کرنے پر مامور ہیں۔“

”آپ کے بارے میں جتنا سنا تھا آپ اس سے زیادہ ذہین معلوم ہوتی ہیں۔“ ییشل نے لمحے بھر کے لیے ٹھٹکنے کے بعد کہا۔

"اچھا......" اس نے حیران ہونے کا اظہار چہرے کے تاثرات کے ذریعے کیا۔ "آپ نے میرے بارے میں کچھ سنا۔"

"کچھ نہیں، بہت کچھ۔" یشل نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

"ہوں......" اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر یشل کی طرف دیکھا۔ "پھر تو آپ مجھے خوب جانتی ہوں گی۔"

"آپ کی آواز اتنی پست کیوں ہوگئی اور لہجہ کمزور۔" یشل مسکرائی۔ "سردار مہرزاد جس بھی شخصیت کو اسپیشل قرار دے دیں، ان کی آواز اتنی نیچی اور لہجہ ایسا کمزور تو نہیں ہونا چاہیے۔"

"طنز کر رہی ہیں؟" زرنگار نے میز پر رکھے کلچ کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"حیران ہو رہی ہوں، طنز نہیں کر رہی۔" یشل نے تصحیح کی۔

"میرا خیال ہے ہمیں سیدھی بات کرنی چاہیے، مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" زرنگار نے توقف کرتے ہوئے لمحے بھر کے لیے اسے غور سے دیکھا اور آنکھیں جھپکانے کے بعد دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ضرور......" یشل نے سر ہلاتے ہوئے اس کی پہلی بات کا جواب دیا اور بازو موڑ کر میز پر رکھتے ہوئے زرنگار کی طرف جھکی۔ "آپ جانتی ہیں کہ سردار مہرزاد آپ کے کتنے قریب ہیں، پھر آپ کو یہ کیسے نہیں پتا کہ آپ کو یہاں کیوں بلوایا گیا ہے۔"

"شاید انہیں پہیلیاں بجھوانے کا شوق ہو۔" زرنگار نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس لیے مجھے واقعی نہیں پتا۔"

"ایک پہیلی تو آپ خود ہیں زرنگار، جس کو سردار صاحب کسی سے نہیں بجھوا رہے، خود بوجھنے کی کوشش میں ہیں۔" یشل نے برجستہ کہا۔

زرنگار نے اپنی خوب صورت آنکھوں کے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھا یشل نے دیکھا ایسا کرنے سے اس کی گردن بالکل سیدھی ہوگئی تھی۔

"کتنی لمبی اور خوب صورت گردن ہے اس کی۔" اس نے سوچا۔ "یہ لڑکی واقعی ایک ایسے حسن کا شاہکار ہے جو بناؤ سنگار کا محتاج نہیں ہوتا۔"

"ایک بات بتاؤں یشل!" پھر وہ یشل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "انسان پہیلیاں ہوتے نہیں، انسان پہیلیاں بنا دیے جاتے ہیں۔"

یشل نے اس کی بات سن کر یوں سر ہلایا جیسے اس کی بات سمجھ رہی ہو۔

"انسان تو سب کے سب ایک ہی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، کم یا زیادہ ایک جیسے اعضا کے ساتھ۔" پھر وہ شاید اپنی بات کی وضاحت کرنے لگی۔ "خوبیاں اور خامیاں جو عادات و مزاج کا حصہ بنتی ہیں وہ انسان پیدائشی طور پر ساتھ نہیں لاتا۔ اپنے ماحول سے، اپنی تربیت سے، اپنے حالات سے اڈاپٹ کرتا ہے، خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایک سا ظاہر باطن، صاف شفاف شخصیت، قسم کھا کے نام لیے جانے والا کردار رکھتے ہیں اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اور بدقسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو پہیلی بن جاتے ہیں۔" الفاظ یشل کے منہ سے بلا ارادہ پھسل گئے، وہ زرنگار کی بات مکمل کرنے کا کوئی ارادہ کیے بغیر اس کی بات مکمل کر گئی۔

"شاید تمہیں سردار مہرزاد سے میرے سلسلے میں اختلاف ہے۔" زرنگار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"so wise you are" جواب یشل کے ذہن میں کلبلایا لیکن اس نے اس جواب کو

زبان پر آنے سے روک دیا۔ "میں آپ کو ہرٹ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اس نے الفاظ کا لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ سردار مہرزاد کے اب تک کے فیصلے دیکھ سن کر ہی میں نے ان کی جاب آفر قبول کی تھی۔"

"پھر اختلاف کہاں ہے؟" زرنگار نے پُراعتماد انداز میں یوں سوال کیا جیسے اسے یقین تھا کہ یشل کو اس کے وجود سے کچھ اختلاف ضرور تھا۔

"میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور میری ڈیوٹی کے کچھ اصول و ضوابط ہیں، جن کو پڑھنے اور ان پر تفصیل سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے اس کاغذ پر دستخط کیے تھے جس کو اپائنٹمنٹ لیٹر کہتے ہیں۔" یشل نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے پھر جب کبھی ڈیوٹی سے آف ہو پھر بتانا اختلاف کیا ہے۔" زرنگار نے کہا۔ "یہ میرا نمبر......" اس نے اپنا نمبر یشل کو دینا چاہا۔

"ایک منٹ پلیز......" یشل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "یہی بات آپ کو بتانے کے لیے آج مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"کون سی بات......؟" اس نے بھاری پپوٹے اٹھائے۔

"آپ ہر کسی کو اپنا نمبر دینے میں جلدی نہ کیا کریں، یہ بے احتیاطی ہوتی ہے۔"

"میں ہر کسی سے ملتی کہاں ہوں جو نمبر دینے لگوں۔" اس نے برا مناتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تو ہر کسی ہو سکتی ہوں۔" یشل نے جتایا۔

"تمہیں تو سردار مہرزاد نے بھیجا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے نہ بھیجا ہو۔" اس نے مزید جتایا۔ "ہو سکتا ہے جسے اس نے بھیجا ہو اسے اغوا کر لینے کے بعد مجھے یہاں بھیج دیا گیا ہو، ہو سکتا ہے میں سردار مہرزاد کے مخالفین میں سے ہوں۔" اس نے کہتے کہتے غور سے زرنگار کو دیکھا جو نارمل انداز میں اس کی بات سن رہی تھی۔ "ہو سکتا ہے میرے ذریعے آپ کا نمبر اُن لوگوں تک پہنچ جائے جو سردار مہرزاد کو تباہ کر دینا چاہتے ہوں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ممکنات کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے میم...... خصوصاً سردار، مہرزاد کے سلسلے میں...... اور آپ تو خود بھی کتنے ہی ایسے مراحل سے گزر چکی ہیں جن سے گزرنے کے بعد آپ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے جیسے جملے کی سمجھ آچکی ہوگی۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"مرحلے...... گزر چکی۔" زرنگار نے اس مرتبہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"او معذرت خواہ ہوں۔" اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ "ڈیوٹی پر ہوں مگر آف ڈیوٹی بات کر گئی۔"

"خیر!" پھر اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا اور اپنے بیگ سے ایک قیمتی فون کا ڈبا نکال کر زرنگار کی طرف کھسکایا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔" اس نے اسے دیکھا۔ "اس میں موجود "سم" اتنی خصوصی ہے کہ آپ سے التجا ہے اسے کسی بھی نا آشنا کو مت دیجیے گا، اس نمبر پر جو مجھے بھی معلوم نہیں صرف سردار صاحب ہی آپ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔"

زرنگار نے ایک نظر اس ڈبے پر ڈالی اور دوسری یشل پر۔ "اور کچھ......" اس نے پوچھا۔

"اور یہ......" یشل نے بیگ سے گاڑی کی ایک چابی نکال کر میز پر رکھی۔ "آپ کو کہیں آنے جانے کے لیے امراؤ بیگم سے گاڑی لینے کے لیے بہانے نہیں بنانا پڑنے چاہئیں، یہ آپ کی ذاتی گاڑی کی چابی ہے جو کل صبح تک آپ کے پاس پہنچ جائے گی، امراؤ بیگم تک یہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ہوتا۔" زرنگار نے ہاتھ کے جھٹکے سے چابی واپس یشل کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"سردار مہرزاد کو تو آپ کو بلانا ہوتا ہے ناں۔" یشل کا لہجہ سپاٹ مگر نظریں کچھ جتانا چاہ رہی تھیں۔

"میرا مطلب ہے، آپ کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ سردار صاحب الیکشن کی مصروفیات کے سبب شاید اب خود آپ کے پاس نہ آسکیں تو ظاہری بات ہے انہیں آپ کو وہاں بلانا ہوگا جہاں وہ ہوں گے۔" زرنگار کی نظروں میں الجھن دیکھ کر اس نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"امراؤ بیگم تک یہ پیغام بھی پہنچا دیا گیا ہے۔" یشل کی آخری بات سننے کے بعد زرنگار نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا اور فون کا پیک اور چابی ہاتھ بڑھا کر اٹھالی۔

"آپ ذہین ہیں۔" یشل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ آپ میری باتوں کا بین السطور سمجھ گئی ہوں گی۔"

زرنگار نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیے بغیر اپنا کلچ اور دھوپ کا چشمہ اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

"آپ سے ملاقات ایک اچھا تجربہ رہا۔" یشل نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اس تجربے سے میں نے بہت کچھ جان لیا۔" وہ مسکرائی۔

"کیا جانا آپ نے؟" زرنگار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔"

"کیچڑ میں کھلے اور خاردار جھاڑیوں میں اگے پھول تک رسائی کی خواہش دل میں کیوں جنم لیتی ہے۔"

"خاموشی کی زبان سمجھ لینا کیا ہوتا ہے۔"

"انسانیت کیا چیز ہے۔"

یشل نے لفظوں کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔

"صحافیوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کو ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کریں۔" زرنگار نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

یشل اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"اُف......" زرنگار کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ گرنے کے سے انداز میں اپنی چیئر پر بیٹھ گئی۔ "کیا ٹیپکل میٹنگ تھی، ایک کورٹی ژاں (بازاری عورت) اور ایک سردار کے تعلق کو آگے بڑھانے والی پریس سیکرٹری۔" اسے اپنی سوچ پر خود بھی ہنسی آگئی۔

"یہاں ہوتے میاں سڈنی شیلڈن تو ایک نیا معرکتہ الآرا ناول اس کہانی پر پائپ لائن میں آجاتا۔" وہ مسکرائی اور اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر باہر جانے کے راستے کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

"بی اماں نے تمہیں مردم بیزار بنا دیا ہے دراصل......" مہرین اس روز بھی حمزہ کو آڑے ہاتھوں لینے کے موڈ میں تھیں۔ "نہ تو تمہارا کوئی سوشل سرکل ہے نہ کوئی قریبی دوست، کیا تمہاری عمر کے لوگ ایسے ہوتے ہیں؟"

"میں خود کو امپروو کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ممی......" اس نے نیچی آواز میں کہا۔ "آپ مجھے تھوڑا وقت دیں، مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں ویسا بن جاؤں جیسا آپ چاہتی ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا ایسا ممکن ہے۔" مہرین نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "بی اماں جس سانچے میں تمہیں ڈھال چکی ہیں، اس سے نکلنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔"

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا ممی۔" وہ جیسے خود کلامی میں مصروف تھا۔ "لیکن آپ......" پھر اس نے سر اٹھا کر مہرین کی طرف دیکھا۔ "پلیز آپ اس میں بی اماں کو قصوروار مت ٹھہرایا کریں، میرا مزاج ہی ایسا ہے، ورنہ بی اماں جتنی سوشل تھیں وہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

"سوشل تھیں....!" مہرین سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔ "محلے داریوں اور دور دراز کی رشتے داریوں کو نبھانے کی حد تک سوشل، تیرے میرے بچوں کو قرآن پڑھا دیا۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کے علاج کے لیے لوگوں کو ٹوٹکے تجویز کر دیے، گھر میں رکھی سبزی، پھل اور سالن کی کٹوریاں ان پھوہڑ ہمسائیوں کو دے دیں جو کسی قسم کا تردد کرنے سے بھاگتی ہیں۔ دوپہر بھر کھٹکتے دروازے کے جواب میں فریزر سے برف کے کٹورے نکال، نکال کر بانٹ دیے، نہ اپنا اسٹیٹس دیکھا نہ اگلے کا، ہر کسی کی شادی، موت پر جا پہنچے۔ غرارے والے، گوٹے والے، پان والے، حقے والے، شربت والے، پنساری، موچی، ترکھان، مستری سب ہی کی خوشیوں میں جھوما جا رہا ہے، سب ہی کے دکھوں پر رویا جا رہا ہے، یہی سوشل ایکٹوٹیز تھیں بی اماں کی۔" اسے ممی کا لہجہ اور اس میں چھپی حقارت ..... ناقابلِ برداشت لگی لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ممی......" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ "مگر آپ کو یاد ہوگا آپ خود بھی تو... بی اماں اور ان کی سوشل ایکٹوٹیز سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔" اسے لگا ممی کے سامنے بی اماں کی اس سے زیادہ حمایت وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"رکھتی تھی نہیں، ان کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بچپن سے لے کر شادی ہونے تک اپنی آنکھوں سے یہ سوشل ایکٹوٹیز دیکھتی رہی تھی لیکن کیا ضروری ہے۔" وہ اپنے شانے اچکاتے ہوئے بولیں۔ "کہ اگر اللہ نے بندے کا سماجی مرتبہ خود پہلے سے بہتر کر دیا ہو تو پھر بھی وہ اس سے نچلے درجے سے متعلق رہنے میں خوشی محسوس کرے۔ اب میرا، میری باقی بہنوں اور بھائیوں کا اسٹیٹس الحمدللہ بہت بہتر ہے تو کیا مصیبت آئی ہے ہمیں کہ ہم واپس انہی لوگوں کے حلقوں میں جا گھسیں جو ہائی اسٹینڈرڈ لیونگ میں ہمارے ہم پلہ ہو سکتے ہیں نہ ہی اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔" انہوں نے اپنی بات کے ردِعمل میں حمزہ کے تاثرات جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا مگر اس نے چہرہ نیچے جھکایا ہوا تھا، انہیں اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی بات اسے کیسی لگی تھی۔

"آپ کی یہ بات بھی شاید ٹھیک ہے ممی، وقت کے ساتھ انسان کی سوچ کو بھی ترقی کے عمل میں شامل ہونا چاہیے۔ سوچ ہی کو نہیں، احساسات اور جذبات کو بھی......" اس نے چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا وہ اپنے دل میں ٹھان چکا تھا کہ اپنی ماں کو خود سے مایوس نہیں ہونے دے گا، اسی لیے ان کی کسی بھی بات سے اختلاف نہ کرنے کے قوی فیصلے پر عمل کی یہ بھی ایک کڑی تھی۔

"تم سلمان بھائی کی بیٹی رانیہ سے تو ملے ہی ہو۔" اس کی اس درجہ سعادت مندی کو محسوس کر کے وہ بھی تھوڑا کھلنے لگیں۔

"سلمان بھائی؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا، اسے فوری طور پر واقعی اس نام سے کوئی شخصیت یاد نہیں آئی تھی۔

"افوہ، مریم کے چچا سلمان جو اس رات ڈنر پر ہماری طرف آئے ہوئے تھے جس دن اتفاق سے تم بھی گھر پر تھے۔"

"اوہ ہاں، یاد آگیا۔" ایک ادھورا سا خاکہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرایا۔

"انہی کی بیٹی رانیہ، وہ بھی تو ساتھ تھی ان کے۔" مہرین کو خوشی ہوئی کہ اسے سلمان نامی شخص یاد تھا۔ "تم

سے ہی تو اس کا خصوصی تعارف کروا رہے تھے وہ۔"

"جی...... جی۔" اس نے سر ہلایا جبکہ اس کا ذہن اس لڑکی کا چہرہ یاد کرنے میں مصروف تھا جس سے بے دھیانی میں اس نے ہیلو ہائے کی تھی۔

"تم ایک آدھ بار ان کے گھر جا کر اس لڑکی سے ملو، اس کو جانچو۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا......" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "لیکن کیوں، کس سلسلے میں؟"

"میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارا اور رانیہ کا رشتہ ہو جائے، اچھے لوگ ہیں، ویل سیٹلڈ، ویل آف۔" انہوں نے اصل بات بتائی۔

"اوہ......" لیکن ممی میرا تو فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے اس بار سعادت مندی کے نقاب سے باہر آ کر کہا۔

"کیوں...... کیا بوڑھے ہو کر شادی کرو گے؟" وہ تنک کر بولیں۔ "یہ ہی تو عمر ہے شادی کی...... تم پڑھ لکھ چکے ہو، جاب کر رہے ہو ماشاء اللہ ذمے داریاں نبھانے کے قابل ہو چکے ہو، اب شادی نہ کرنے کا ارادہ نہ ہونے کی کیا تک ہے بھئی۔"

"تک کو چھوڑیں ممی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن آئی ایم سوری فی الحال میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے میرے مزاج اور معیار کے دُہرے پن اور پیچیدگیوں سے باہر نکل لینے دیں پلیز...... میرے مزاج اور شخصیت ایک اکائی پر کھڑے ہوں گے جب ہی میں زندگی کے معاملات بہتر طریقے سے کسی کے ساتھ شیئر کر سکوں گا، یوں تو کبھی آپ کے معین کردہ معیار اور کبھی بی اماں کی تربیت کے بھوت مجھے ڈبل مائنڈڈ کرتے رہیں گے اور جو بھی لڑکی میرے ساتھ زندگی گزارنے آئے گی اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"

"یہ کوئی مضبوط اور قابلِ قبول وجہ نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

"شاید آپ کو نہ لگے لیکن میرے لیے یہ بہت اہم بات ہے۔" اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ "باقی کسی دوسرے معاملے میں آپ حکم کریں، میں حاضر ہوں۔" واپس سعادت مندی کے چولے میں گھستے ہوئے آخری بات اس نے دانستہ کہی تھی اور شاید اسی بات کی وجہ سے وہ مزید بحث نہیں کر سکی تھیں۔

☆☆☆

"تم نے اس چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں والی لڑکی سے نکاح کر لیا نادر......؟" اچانک آنے والے بندوں سے ابتدائی بات چیت کرنے کے بعد جب وہ کوئی کاغذ لینے کے لیے اندر آیا تو ڈائننگ چیئر پر سر پکڑ کر بیٹھی آپا نے سرسراتی آواز میں اس سے پوچھا۔ یہ وقت نادر کی زندگی کا شاید سب سے کڑا وقت تھا، اسے چاروں اطراف سے آنے والے سوالات کا سامنا کرنا تھا، اسے اپنے مخاطبین کی نظریں، نظریں نہیں اسکن مشینز محسوس ہو رہی تھیں جو اس کے جسم کے اندر شریانوں میں دوڑتے خون کی رفتار کو جانچ رہی تھیں اور انہی لمحات میں اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے اور نتائج و عواقب کی پروا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"جب انسان چاروں طرف سے گھر جاتا ہے اور جائے فرار بظاہر کوئی نظر نہیں آتی تو دل و دماغ کو فوری طور پر ایسا ہی فیصلہ کر لینا چاہیے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا تھا۔

"آپ کو اعتراض نکاح پر ہے یا اس کی چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں پر۔" اس نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر سائڈ بورڈ کی نچلی دراز کھولتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟" آپا اس کے انداز پر حق دق رہ گئی تھیں۔ یہ وہ نادر تھا جسے ابھی تک وہ گود میں اٹھائے بچے کی طرح لاڈ پیار سے پال رہی تھیں۔

"مذاق ہے تو خاصا سنگین ہے۔" اس نے ایک فائل میں لگے کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "ہے ناں آپا؟" پھر وہ ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"واہ نادر پہلا قدم تم نے اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ اٹھایا اور وہی الٹا پڑ گیا۔" آپا جوش میں آ کر طنزیہ گفتگو کرنے لگیں۔ "وہ نہ صرف چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں والی ہے بلکہ پکی کرمنل بھی ہے، جب ہی تو یہ ایجنسیوں والے اس کی بُو سونگھتے تم تک آن پہنچے ہیں۔"

"ایجنسیوں والے، تم تک......" الفاظ نے نادر کے جسم میں چیونٹیاں سی دوڑا دیں۔ "گھروں سے اٹھائے جانے والے بے قصور لوگ، لاپتا افراد، گمشدہ نوجوان، ان کے گھر والے، احتجاجی کیمپ، بھوک ہڑتالیں، پوسٹر، بینرز، اعلیٰ سطحی ملاقاتیں۔" ان گنت بار ٹی وی کی اسکرین پر دیکھے گئے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ خون اس کی رگوں میں سمندر میں آئے طوفان کی طرح تلاطم خیز ہوا۔

"میں نہیں مانتا کہ ایک نیک جذبہ، اتنے برے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا، کچھ دیر نیچے بیٹھے رہنے سے اس کے پاؤں جیسے سونے لگے تھے، اٹھ کھڑے ہونے پر ایڑیوں اور پنجوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔

"نیکی، نیک جذبہ، خیر سگالی۔" آپا بلند آواز میں بڑبڑائیں۔ "دیکھ لینا ابھی اس کے مزید کیا نتائج نکلتے ہیں۔"

"کاش لوگ مشکل وقت میں خیر کے کلمے پڑھنے کے عادی ہو سکتے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو انتہائی اضطراب کے عالم میں بار بار ٹانگ سے ٹکراتے ہوئے کہا اور واپس اس کمرے میں چلا گیا جہاں اچانک آنے والے بیٹھے تھے۔

"ہم آپ کے پچھلے پورے ریکارڈ سے پہلے سے واقف ہیں مسٹر نادر......" اس کی پکڑائی فائل پر نظر ڈالتے ہوئے آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"آپ کے صاف ستھرے ریکارڈ پر صرف ایک ہی چڑھاؤ یا اتار موجود ہے اور وہ ہے آپ کا زوئی حسین سے نکاح......" بولنے والا بول رہا تھا اور وہ سن رہا تھا۔ "آپ کو ایک ایسی غیر ملکی لڑکی سے نکاح کی ضرورت کیوں پیش آئی جس کے اس ملک میں قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی اور یہ نکاح بھی اس طریقے سے ہوا کہ تا حال آپ کے گھر والے، دوست، عزیز، رشتے دار، سب اس سے ناواقف تھے، یہ خفیہ اور ایمرجنسی میں ہوا نکاح اپنے پیچھے کیا مقاصد لیے ہوئے تھا، یہ ایک بڑا سوال ہے۔"

"دیکھیں سر آپ یقین کریں کہ میں نے اس نکاح کے محرک سے آپ کو پوری طرح آگاہ کر دیا ہے اور مکمل ایمانداری کے ساتھ کیا ہے۔" نادر نے سن ہوتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"زیادہ عرصہ نہیں گزرا مسٹر نادر کہ ہمارے محکمے کے ایک آفیسر نے زوئی حسین سے ان کے فلیٹ پر ملاقات کر کے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے ان کے پاکستان میں قیام کے دوران کی مصروفیات کا ریکارڈ چھان رہے تھے، ملک کے شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر میں آنے والے اس ریکارڈ زلزلے کے دوران ریسکیو ٹیمز اور والنٹیر گروپس اور زلزلے سے متاثرہ لوگوں کے متعلق اگر میں چند ہی کہانیاں آپ کے گوش گزار کر دوں تو شاید آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ ایسے ہی ایک کیس پر ہم آج کل کام کر رہے ہیں، میرال صلاح الدین

...... نامی لڑکی اسی زلزلے کے متاثرین میں سے ایک تھی، ریسکیو آپریشنز کے دوران ہی وہ ایک غیر ملکی تنظ
کے امدادی کیمپ سے غائب ہوئی تا حال اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ہماری اب تک کی تشویش کے مطابق ا
کے جن چند لوگوں کے ساتھ موجود ہونے کے ثبوت ہمیں ملے ہیں ان میں سے ایک مس زوئی حسین جواب
زوئی نادر ہیں بھی ہیں۔"

"مگر میری معلومات کے مطابق زوئی حسین زلزلے کے ریسکیو آپریشنز کے دوران کسی بھی امدادی
کے ساتھ متاثرہ علاقوں میں نہیں گئی تھی۔" نادر نے ایک نکتہ اٹھانے کی کوشش کی۔

"ہم کب کہہ رہے ہیں کہ وہ گئی تھیں۔" اس شخص نے پیشہ ورانہ طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہ

"ہماری تفتیش کے مطابق امدادی کیمپ سے غائب ہونے کے بعد میرال صلاح الدین کو زوئی حسین کے سا
میدانی علاقوں کے ایک گاؤں میں ایک مقامی بینک کے منیجر کے گھر میں دیکھے جانے کے ثبوت موجود ہیں۔"

"میں اس سلسلے میں فی الحال آپ کو کچھ بتا نہیں سکتا کیونکہ میں ایسی کسی ایکٹویٹی سے واقف ہی نہ
ہوں۔" نادر نے سر ہلایا۔

"غیر ملکی لڑکیوں سے شادیوں کے شوق کبھی کبھار مہنگے پڑ جاتے ہیں مسٹر نادر...... آپ شاید خود کو انٹرنیشن
چائنا مارکیٹ کا ایک بڑا ایکسپورٹر دیکھ رہے تھے تصور میں۔" وہ شخص مزید تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ایسا کچھ نہیں تھا۔" نادر نے بے بسی سے سر ہلایا۔ "میں نے یہ نکاح کیوں کیا، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"آپ نے مجھے تو بتا دیا مگر یہ ثابت کیسے کریں گے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ ایک غیر ملکی لڑ
پاکستانی نیشنلٹی حاصل کرنے کے لیے اتنی بے چین کیوں ہے، آپ اسے صرف پاکستان سے محبت جان کرا
یہ نیشنلٹی دینے کے لیے اس سے نکاح کر لیتے ہیں...... آپ کتنے معصوم ہیں مسٹر نادر۔"

"ظاہری بات ہے میں اپنی سوچ کا کوئی ثبوت آپ کو نہیں دے سکتا اس لیے آپ کے پاس اختیار
آپ جو سلوک مجھ سے کرنا چاہیں کریں، میں یہیں موجود ہوں۔" نادر کو لگا وہ صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے
اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔

"فی الحال کسی عمومی یا خصوصی سلوک کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔" اب کے دوسرے شخص نے کہ

"آپ کا اب تک کا ریکارڈ سادہ اور سیدھا ہے، ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ اپنی منکوحہ سے راب
میں رہتے ہوئے ہمارے لیے مزید معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنیں گے اور زوئی حسین کو اس کے طے
پروگرام کے مطابق پاکستان واپسی سے نہیں روکیں گے۔ یہ دو چیزیں ہی مسٹر نادر آپ کی آزادی اور سلامتی
ضمانت بن سکتی ہیں۔"

"یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔" نادر نے سر ہلایا۔ "کیونکہ مجھے بھی پیچیدگیوں میں پڑنے اور اپنی جا
جوکھوں میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں بلکہ یہ واقعہ میرے لیے آئندہ زندگی میں اگر زندگی ہے ایک بہت بڑا
بننے والا ہے۔"

"گڈ......" دوسرے شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر نادر کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں آپ
مکمل تعاون کی امید ہے۔" مشکل ترین وقت کو فی الحال ٹلتے دیکھ کر نادر نے جسم میں آہستہ آہستہ واپس
زندگی کے ساتھ سر ہلا دیا۔ آنے والوں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ان میں سے ایک نے اسے بتایا
زوئی حسین کے واپس آنے تک وہ آنڈر آبزرویشن رہنے والا تھا اور اس کا نام ای سی ایل میں ڈالا جا چکا تھا۔

☆☆☆

"میں نے رات ایک بہت اچھا خواب دیکھا۔" ایک صبح عافیہ نے بیگم اکرام اللہ کو فون پر کہتے سنا، عافیہ اس رات بہت دنوں بعد گھر آئی تھیں۔ ان کے شوہر اور بڑے بیٹے نے زبردستی انہیں گھر آنے اور رات بھر نیند لے لینے پر آمادہ کیا تھا۔ ہائی پوٹینسی ٹرینکولائزر کی دو گولیاں عرصے بعد ان کو پوری نیند سلانے میں کامیاب رہی تھیں لیکن صبح فجر کی اذان کے وقت ان کی آنکھ بغیر کسی کے جگانے اور الارم کی آواز کے کھل گئی تھی۔ فجر کی نماز انہوں نے توجہ اور دھیان سے پڑھی تھی اور نماز کے بعد سجدے میں گر کر گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی عرض پیش کی تھی، انہیں اپنے اور اپنے ان دیکھے خدا کے درمیان ایک عجیب سا تعلق بنتا محسوس ہونے لگا تھا۔ جہاں کہنے والی زبان تو عام سی تھی مگر سننے والی طاقت بہت بڑی، غیر معمولی اور ہر چیز پر قادر تھی۔ نماز کے بعد صوفی صاحب کے بتائے وظائف اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران بھی وہ اس ان دیکھی طاقت سے ہی ہم کلام رہی تھیں ایسی طاقت جس سے تمام امیدیں وابستہ تھیں، جو ہر غم کا مداوا تھی۔

بہت دنوں بعد وہ علی الصباح اپنے گھر کے لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھیں، ان کی نظروں کے سامنے موجود لاؤنج کی گلاس وال کے پردے پیچھے ہٹے ہوئے تھے اور شیشے کے اس پار موجود فرنٹ لان کے سرسبز پودے، پیڑ، درخت اور پھول، مشرق سے ابھرتے سورج کی اولین اور کمزور کرنوں کی روشنی میں واقع ہو رہے تھے۔ اس منظر اور چند لمحے پہلے اس طاقت کی یاد میں مگن رہنے کے اثر نے ان کے دل میں ایک عجیب سی سرشاری بھری تھی، وہ بے یقینی اور مایوسی کے حصار سے چند لمحوں کے لیے ہی سہی باہر نکلی تھیں۔ اسی دم بیگم اکرام اللہ کی کال نے ان پر خوش امیدی اور یقین کا ایک نیا در وا کیا تھا۔

"میں نے رات ایک بہت اچھا خواب دیکھا۔" بیگم اکرام اللہ نے کہا تھا۔ "میں نے دانیال بیٹے کو تمام زندہ حسیات کے ساتھ اپنے پاؤں پر چلتے پھرتے دیکھا یوں جیسے وہ کبھی کسی حادثے سے دوچار ہوا ہی نہیں تھا اگرچہ خواب دیکھنے کے دوران میرے لاشعور میں یہ تصور موجود رہا کہ دانیال ایک بڑے حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"اوہ، یہ تو بہت اچھا خواب ہے۔" عافیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ان کا دل ایک انجانی مسرت کے زیرِ اثر تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ "پھر کیا ہوا؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر میں نے دیکھا صوفی صاحب دانیال بیٹے کو یوں چلتے پھرتے دیکھ کر مسکراتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں۔ "دیکھا ماں کی دعا کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے مگر یاد رکھیے گا معجزے اللہ کی طرف سے وقوع پذیر ہوتے ہیں، انسان ان پر ہرگز قادر نہیں۔"

"اوہ...... میرے خدا!" عافیہ نے اچھلتے دل کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا ہوا۔"

"پھر یہ ہوا کہ صوفی صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا عافیہ بیٹی کو میری جانب سے بھی مبارک باد دیجیے گا اور اس سے کہیے گا میں خود اس کو مبارک باد نہ پیش کر سکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔" بیگم اکرام اللہ نے کہا۔

"صوفی صاحب کہاں جا رہے تھے؟" عافیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"یہ تو انہوں نے نہیں بتایا، بہر حال خواب کون سا بہت طویل ہوتے ہیں جو ایسے سوال و جواب کیے جا سکیں، اتنا ہی خواب دیکھا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی، فجر کی اذان ہو رہی تھی۔" بیگم اکرام اللہ نے نرمی سے کہا۔

''صبح کے وقت دیکھے جانے والے خواب تو سچے ہوتے ہیں سنا ہے۔'' عافیہ نے کہا۔
''ہاں سنا تو ہے۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا۔
''میں آج اسپتال جانے سے پہلے صوفی صاحب کی طرف جاؤں گی، ان سے بات کرتے ہوئے بہت سکون ملتا ہے۔'' عافیہ نے فوراً ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں ضرور جانا۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا اور دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں مزید کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔
اسپتال جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے ڈرائیور سے راستہ بدل کر صوفی صاحب کے گھر کی طرف گاڑی موڑنے کو کہا۔ وہ بہت دن بعد صبح کے وقت گھر سے باہر نکلی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک معمول سے زیادہ تھا۔ دفتروں کی طرف جانے والوں کی گاڑیاں، اسکولوں کی بسیں اور ویگنیں، کالج اور یونیورسٹی کی گاڑیاں، سگنلز پر رکنے والی گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ جاتیں۔
''اُفوہ...... مجھے اسپتال چلے جانا چاہیے تھا سیدھے......'' ان کا دل گھبرانے لگا'' دانیال کو دیکھے کتنے گھنٹے گزر چکے نہ جانے وہ سویا ہوا ہوگا یا اس کی حسیات جاگ رہی ہوں گی۔'' ایک ہی سوال ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔
''یوٹرن سے گاڑی واپس موڑلو۔'' انہوں نے اسی گھبراہٹ میں ڈرائیور سے کہا۔
''بس اگلی ہی لین میں تو صوفی صاحب کا گھر ہے بیگم صاحبہ۔'' ڈرائیور نے کہا اور ان کے جواب کا منتظر رہا۔
''اچھا......'' انہوں نے سامنے سڑک پر نظر دوڑائی۔ ''چلو پھر زیادہ دیر نہیں رکنا، بس ان سے دعا کر کے نکل آئیں گے۔''
''اُفوہ...... بیگم صاحبہ صوفی صاحب کی لین میں بھی آج بڑا رش ہے، یہ مین روڈ تو نہیں ہے لیکن پھر بھی گاڑیوں، بسوں اور آٹو رکشاؤں کی لمبی قطاریں ہیں۔'' ڈرائیور نے اگلی لین میں گاڑی موڑنے کے بعد کہا۔
''اوہ...... کہیں آج اِدھر کوئی خصوصی اجتماع تو نہیں ہو رہا۔'' انہوں نے بھی سامنے نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''نہیں بیگم صاحبہ، پچھلی بار جب ہم اِدھر آئے تھے تو باہر بیٹھے ہوئے ایک معتقد نے مجھے بتایا تھا کہ صوفی صاحب اجتماع وغیرہ نہیں کرتے، وہ زیادہ ہجوم پسند نہیں فرماتے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور شیشہ نیچے کر کے قریب سے گزرتے ایک شخص سے اس رش کی وجہ پوچھنے لگا۔ عافیہ کے فون پر عاصم کی کال آ گئی، وہ ان سے پوچھ رہا تھا، وہ اب تک اسپتال کیوں نہیں پہنچی تھیں۔ عاصم سے بات کر کے فون بند کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کی سائڈ کا شیشہ آہستہ آہستہ اوپر ہو رہا تھا۔
''بیگم صاحبہ، صوفی صاحب کا آج اذانِ فجر سے کچھ دیر قبل وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' ڈرائیور نے چہرہ پیچھے موڑتے ہوئے...... انہیں بتایا عافیہ پر جیسے سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔
''میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔'' اذانِ فجر سے کچھ دیر پہلے ہی صوفی صاحب نے بیگم اکرام اللہ کو خواب میں بتایا تھا۔

☆☆☆

بینش نے ساری رات لگا کر کچھ ایسے ڈیزائن بنائے تھے جو اس کے اسائنمنٹ میں شامل تھے۔
''ایک تو ہمارے گھر میں اخبار آنے کا بھی رواج نہیں ہے۔'' ڈیزائنز کو محفوظ کرنے کے لیے اسے انہیں کسی کور میں لپیٹنا تھا مگر اپنے گھر میں اسے ایسا کوئی بڑا کاغذ نہیں مل رہا تھا جس میں وہ انہیں لپیٹ کر محفوظ کر سکے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرا کمرا پھر رہی تھی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر اخبار کے کسی بھولے بھٹکے ٹکڑے کو

کر رہی تھی جو غلطی سے ہی کسی وجہ سے ان کے گھر آ گیا ہو۔

''ہم نے اخبار کیا کرنا ہے۔'' باورچی خانے میں چولھے کے آگے بیٹھی پراٹھوں کے انبار پکاتی اماں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اخبار سے تن ڈھکتا ہے نہ پیٹ بھرتا ہے اور اس میں چھپی خبریں پڑھنی مجھے آتی ہیں نہ حمید، شفیق کو اتنی فرصت ہے کہ وہ بیٹھ کر اخبار پڑھیں، خواہ مخواہ کا خرچہ ڈھائی تین سو کا شو مارنے کے لیے باندھ لیں کیا۔''

''افوہ...... اماں، آپ کوئی ایسا ہی جواب دینا جس سے پتا لگے ہم کتنے جاہل ہیں۔'' وہ چیں بہ جبیں ہوتی باورچی خانے میں آ گئی۔

''ہاں تو کتنے تو ہم پڑھے لکھے ہیں۔'' اماں نے بل دار جناتی پراٹھا چنگیر میں رکھ کر اس پر آلو، پالک کی بھجیا ڈوئی بھر کر ڈالی اور گرم بھجیا پر مکھن کا ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ مکھن کا ٹکڑا گرم بھجیا پر رکھے جاتے ہی پگھل کر سبز اور زرد ملغوبے پر اِدھر اُدھر بہنے لگا۔

''لے دھیان سے ناشتا کر لے...... اخبار کا سیاپا چھوڑ دے اب......'' پھر وہ چمکارتے ہوئے بولیں اور اس کی طرف دیکھتے دیکھتے رک گئیں۔ ''رات کو جو تیل تیرے بالوں میں ڈالا تھا، وہ نکال دیا ناں شیمپو مل کر۔'' انہوں نے اس کے روکھے سنہری مائل بھورے بالوں کو دیکھا جن کی لٹیں کیچر سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ ''سڑ کے سواہ ہو گئے ہیں بال روز دھل دھل کر تیل کے بغیر۔'' اماں کو غصہ آنے لگا۔ ''اور یہ گلابی قمیص کے ساتھ چٹی شلوار کیوں پہن لی کیمرک کی، میں نے تو گلابی ریشم کی شلوار خریدی تھی اس کے ساتھ۔ اتنا خجل خوار ہو کر ملی تھی۔ ڈبی بازار سے رنگ ہی میچ نہیں ہوتا تھا۔ بہن شریفاں تو مجھے کہہ رہی تھی چٹا ریشم لے لے اور منیرے...... رنگریز سے رنگوا لے پر میں نے بھی رنگ ملا کے ہی چھوڑا۔'' اماں کو بات کی تفصیل سنانے کا شوق تھا۔ ''ناں پر تو نے چٹی کیمرک کیوں پہن لی اس کے ساتھ۔'' پھر انہیں یاد آ گیا کہ بینش نے ان کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔

''مجھے نہیں پسند ریشمی کپڑے۔'' بینش نے ناک سکیڑ کر کہا۔

''اور میں تو گلابی چپل بھی لائی تھی نگوں والی تیرے لیے، تو نے کپڑے کی پمپی کیوں پہن لی؟'' پھر اماں کی نظر اس کے کینوس شوز پر جا پڑی۔

''افوہ...... اماں مجھے نگوں والی چپل پہن کر یونیورسٹی جا کر تماشا نہیں بننا۔'' بینش جھنجلا گئی۔ ''اور خدا کے واسطے بار بار گلابی، گلابی کہہ کر اس رنگ کا بیڑا غرق تو نہ کریں، یہ ٹی پنک کلر ہے ٹی پنک۔'' اس نے کہا اور چائے کا مگ میز پر سے اٹھا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

''ہا ہائے...... پراٹھا تو کھا ساتھ میں نے آلو ساگ صبح ہی بھونا ہے، تازہ رات کا پڑا ہوا نہیں ہے۔'' اماں سب بھول کر چنگیر اس کی طرف بڑھانے لگیں۔

''ہائے اماں صاف کولیسٹرول ہے یہ پراٹھا، مجھے نہیں کھانا۔'' وہ منہ بنا کر بولی اور چائے کا مگ ہاتھ میں پکڑے پکڑے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔

''کا کے او کا کے!'' ساتھ والی چھت پر ہمسائیوں کے چھوٹے بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا جو پتنگ کی ڈور سلجھاتا آسمان پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ بینش کے پکارنے پر وہ دونوں چھتوں کے درمیان کھڑی منڈیر کے قریب آیا۔ ''جا بھاگ کے مجھے سلیم نائی کی دکان سے دو چار پرانے اخبار تو لا دے۔ جا شاباش میرا بھائی، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے کا کے سے درخواست کرتے ہوئے اسے پچکارا۔ کا کا جیسے بینش کے اشارے کا منتظر تھا فوراً بھاگتا سیڑھیاں اترا اور ٹھیک دس منٹ بعد ہاتھ میں چند اخبار پکڑے دوبارہ آن حاضر ہوا۔

"شاباش کاکے!" بینش نے اخبار لیتے ہوئے پیار سے کاکے کے گال کو چھوا۔ "تم بہت اچھے ہو کاکے۔" مسکرائی اور کسی مشہور نغمے کی دھن پر گنگناتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے ایک اخبار نیچے بچھا کر ڈیزائنز والے کاغذ اوپر رکھے اور دوسرا اخبار ان پر رکھ کر باریک ڈوری سے انہیں باندھنے لگی۔

"قاتل حسینہ زرنگار!" اوپر والا اخبار کسی مقامی اخبار کا شام کا ایڈیشن تھا۔ جس کے صفحہ نمبر دو کے درمیان ایک خوب صورت چہرہ جگمگا رہا تھا۔ "معروف ذرائع کے مطابق زرنگار کے ابھرتے ہوئے سیاست دان سردار مہرزاد خان کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں۔ سردار مہرزاد خان جو اپنے آبائی حلقے سے اپنے شہید والد کے قتل کے بعد قومی اسمبلی میں خالی ہو جانے والی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور اس حلقے سے اس انتخاب میں مضبوط ترین امیدوار خیال کیے جاتے ہیں کے بارے میں انتخاب سے صرف دو ہفتے قبل اس خبر کا سامنے آنا معنی خیز ہے۔" بینش نے تیزی سے اس خبر پر نظر دوڑائی۔ یہ وہی سیاست دان تھا جس کی بات اس روز دانیال کر رہا تھا اور یقیناً وہ پری چہرہ حسینہ وہی کال گرل تھی جس کا پتا چلانے کی بات دانیال نے کی تھی۔

"اوہ گڈ......" اس نے اخبار کے کاغذ کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس پر پڑی شکنیں دور کیں۔ "آج دانیال کو دکھانے کے لیے میرے پاس یہ خصوصی خبر اتفاق ہی سے آگئی۔" اس نے سوچا۔ "مزہ آئے گا۔" سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

"کیا چل رہا ہے آج کل......؟" فہد نے علینہ سے پوچھا۔ وہ ویک اینڈ کی رات تھی اور پورے ہفتے کے بعد پہلی بار اسے تسلی سے کسی کو کال کرنے کا وقت ملا تھا۔

"جو بھی چل رہا ہے، اچھا چل رہا ہے۔" علینہ کے لہجے میں بشاشت تھی۔ "زندگی میں پہلی بار مجھے پڑھائی میں مصروف ہونے میں مزہ آرہا ہے۔"

"اچھا ہے اسٹڈیز سے دور رہ کر تمہیں اس کی قدر آگئی۔" وہ مسکرایا۔

"میں چیزوں کو اپنی کلاس فیلوز کی نسبت جلدی سمجھ لیتی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں فزیکل اور مینٹلی دونوں ہی قسم کی عمروں میں ان سے بڑی ہوں۔" علینہ نے کہا۔

"یہ تو ظاہری بات ہے ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن تم کبھی بھی اتنی ڈمب نہیں رہی ہو جتنا ظاہر کرتی رہی ہو خود کو۔" فہد نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے میں تمہاری ماما کو شاید کبھی سمجھ نہ پاؤں۔ مجھے یاد ہے وہ ہمیشہ unexpected حرکتیں کرتی رہی ہیں۔"

"حرکتیں......؟" علینہ نے اس کے جملے کا ایک لفظ یوں دہرایا جیسے اس کی وضاحت طلب کر رہی ہو۔

"معاف کرنا شاید میں غلط لفظ بول گیا۔ مجھے زیادہ واضح لفظ بولنا چاہیے جو کہ افسوس ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔" فہد نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کوئی مناسب لفظ یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"خیر چھوڑو!" پھر اس نے یاد کرنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ اچانک سے کوئی ایسا فیصلہ کر لینے کی عادی معلوم ہوتی ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔"

"مثلاً......؟" علینہ نے کہا۔

"مثلاً تمہیں مزید پڑھنے کی اجازت دینے کا فیصلہ......" فہد نے فوراً کہا۔ "کیا تمہیں توقع تھی کہ وہ تمہیں اس کی اجازت دیں گی۔"

"ہرگز نہیں۔"

"اسی طرح ایک بار یاد ہے انہوں نے تمہیں میرال کے ساتھ کالج اسپورٹس گالا میں جانے کی اجازت دے دی تھی جس کی تمہیں ہرگز امید نہیں تھی۔ اس سال میرال نے انٹر کالجز چیمپئن شپ جیتی تھی لان ٹینس اور بیڈمنٹن میں یاد ہے ناں تمہیں۔"

"ہاں، شاید!" علینہ کا لہجہ یک دم سست ہو گیا۔ "تمہیں تو بہت پرانی باتیں بھی یاد ہیں۔"

"ہاں، مجھے بہت پرانی باتیں بھی یاد ہیں، خصوصاً وہ باتیں جو میرال سے اور تم سے متعلق ہیں۔" فہد نے ناسٹلجک ہوتے ہوئے کہا۔

"اس ہفتے کے شو میں تم نے جو ٹائی پہنی ہوئی تھی، وہ کہاں سے لی۔" علینہ نے گفتگو کا موضوع یکسر بدلتے ہوئے کہا۔ "اس کا ڈیزائن اور رنگ شاندار تھا۔"

"یہ پرانی باتوں کے دوران ٹائی کہاں سے آگئی؟" فہد کو اچانک سے موضوع بدلا جانا ناگوار گزرا تھا۔

"میں ماضی سے زیادہ حال میں رہنا پسند کرتی ہوں ناں اس لیے......" علینہ اس کے لہجے کو محسوس کر کے گڑبڑا کر بولی۔

"لیکن مجھے تم سے صرف ماضی کی باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے، وہ دن جب ہم ساتھ تھے، وہ لمحے اور لمحاتی خوشیاں جو ہم نے شیئر کیں۔ وہ کھیل تماشے جو ہم نے ایک ساتھ انجوائے کیے، وہ موسم اور پہاڑوں پر اترتے رنگ جو ہم نے ساتھ ساتھ دیکھے۔ پہاڑوں پر بادل اور وادی میں دھوپ، وادی میں بارش اور پہاڑوں پر چھایا سکوت، تم نہیں جانتیں علینہ میں نے دنیا کے کئی ملکوں میں رہتے ہوئے بھی اس شہر اور اس شہر کی خوب صورتی کو کتنا یاد کیا ہے۔"

"تم اب بھی آؤ اس شہر میں......" علینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ساری فیسی نیشنز اور چارم ختم نہ ہو جائے تو کہنا۔"

"مت بتاؤ...... مجھے، مت سناؤ۔" فہد نے سر ہلایا۔ "میں تم سے میرال کے شہر چھوڑ جانے اور اس کی گمشدگی پر پہلے ہی ملول ہوں۔"

"ایک بات تو بتاؤ فہد......" علینہ نے سیدھا سوال کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں میرال بہت پسند تھی؟"

"تھی سے کیا مراد ہے تمہاری......؟" فہد نے تیکھا جواب دیا۔ "میرال کے لیے میرے دل میں اب بھی پسندیدگی کے وہی جذبات ہیں جو پہلے تھے۔ اب بھی اگر مجھے پتا چلے کہ وہ کہاں ہے تو میں فوراً اس سے ملنا چاہوں گا۔"

"اب بھی......" علینہ نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ "اب جب کہ تم دنیا بھر کی لڑکیوں سے مل چکے ہو اور بقول تمہارے بہت سی لڑکیوں سے تمہاری دوستی بھی ہے۔"

"ہاں اب بھی......" فہد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے اس شہر سے متعلق تم دونوں ہی لڑکیاں بہت اہم ہو کیونکہ تم دونوں کے ساتھ میں نے جو وقت گزارا وہ ناقابل فراموش ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، پھر تم ادھر مت آنا کیونکہ تمہاری فیسی نیشنز کو قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم اس شہر کو دوبارہ مت دیکھو۔" علینہ نے دبدبا کر کہا۔ "اب نہ جانے میرال اس لڑکے کو ملی یا نہیں جو اسے اور اس کی بوا کو ڈھونڈتا یہاں آیا تھا۔"

''اس لڑکے کی طرف سے کوئی اطلاع آئے تو مجھے ضرور بتانا۔'' فہد نے کہا اور پھر ماضی کی یادوں سے حال میں آتے ہوئے علینہ کو کوکنگ شو کے دوران ہونے والی چھوٹی بڑی بدحواسیوں، غلطیوں اور دلچسپ تجربات کی باتیں سنانے لگا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، صرف تم ہی ماضی پرست ہو۔'' اس رات علینہ نے اپنے پرانے اسکول بیگ سے ایک ڈبا نکالتے ہوئے سوچا۔ ''اگر تم درمیان میں میرال کے قصیدے نہ پڑھنے لگ جایا کرو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں کہ ماضی سے متعلق اور تم سے وابستہ میں نے کیا کچھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' اس نے ڈبے سے ڈاک ٹکٹ کے پرانے البم کچھ آڈیو کیسٹس اور تتلیوں کے پروں سے سجے البمز نکالتے ہوئے سوچا۔ یہ سب چیزیں فہد ایبٹ آباد سے جاتے ہوئے اسے دے گیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے اسی دن شک ہو گیا تھا تم پر جس دن تم مجھے اس چپٹی پھینی چڑیل کے گھر لے گئے تھے۔'' آنے والے مہمانوں کی کراس کوئیچنگ سے نکلنے کے بعد نادر اپنی اماں اور بہنوں کی عدالت میں بیٹھا تھا۔ آپا نے کھٹا کھٹ باقی بہنوں کے فون نمبر گھما کر انہیں بھی اماں کے پاس بلا لیا تھا اور اب خوب ہی نادر کے لتے ہو رہے تھے۔

''توبہ، توبہ چپکے چپکے نکاح کر لیا...... '' ایک بہن نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔''

''اور وہ بھی چوہے اور مینڈک کھانے والی لڑکی سے۔'' چھوٹی بہن اپنا گود کا بچہ تھپکتے ہوئے بولی۔

''ناک کٹوا دی نادر تم نے، اب ہمارے...... '' بڑی آپا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب کے'' انہوں نے باقی بہنوں اور خود کی طرف اشارہ کیا۔ ''سسرال والے کیسے کیسے طعنے نہ ماریں گے ہمیں۔'' ان کی آنکھوں میں نہ جانے کدھر سے آنسو بھی امڈ آئے۔ ''کیوں امی جی، آپ کیوں نہیں بول رہیں۔'' خاموش کیوں ہیں؟'' انہوں نے لحاف میں سکڑ سمٹ کر بیٹھی امی کی طرف دیکھا۔

''امی تو لگتا ہے صدمے سے گنگ ہو گئیں۔'' چھوٹی بہن نے کہا۔ بڑی دونوں بہنیں لپک کر ماں کے پلنگ پر جا بیٹھیں اور ان کے کندھے اور ٹانگیں دبانے لگیں۔

''نادر، غیر مسلم کو پہلے مسلم بھی کیا تھا کہ یونہی جھوٹا موٹا نکاح کر لیا؟'' امی نے خلا میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اوہو امی جی...... '' آپا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''یہ ہی تو بتایا ہے کہ وہ منحوس اسی بات کا دعویٰ کر کے نادر کو پٹا گئی کہ وہ مسلمان ہے۔''

''ہیں نادر......؟'' امی نے تصدیق کے لیے نادر کی طرف دیکھا۔

''جی......'' نادر نے سر جھکا کر کہا۔

''صرف دعویٰ ہی کرتی تھی کہ سچ میں مسلمان تھی۔'' امی کی آواز تیز ہوئی۔

''بہت پکی مسلمان ہے امی۔'' نادر نے مری ہوئی آواز میں کہا جو کچھ صبح سے وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد کچھ بھی وثوق سے کہنا ناممکن تھا۔

''تیری...... بلکہ تیری کیا میری اگلی نسل چپٹی، پھینی اور چوہی آنکھوں والی پیدا ہو گی۔ ان سے کون بیاہ کرے گا......'' لمحے بھر کے لیے نادر کو امی کے کنسرن پر ہنسی آئی لیکن اس نے ہنسنے کے بجائے سر کو مزید جھکا لیا گویا نسل کی شکل بگاڑنے میں سب قصور اس کا تھا۔

''ہا، ہائے امی، آپ کو اگلی نسل کی پڑ گئی۔'' آپا نے دوپٹا منہ پر رکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ ''یعنی آپ نے پھینی بہو قبول کر لی۔''

''جو الٹ اس نے کر لیا، اسے واپس موڑ کر سیدھا نہیں کیا جا سکتا۔'' امی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں طلاق کا رواج ہے نہ علیحدگی کا جو دستخط ایک بار نکاح نامے پر ہو جاتے ہیں وہ طلاق نامے تک نہیں جاتے، بیویاں بھلے شوہروں کو چھوڑ کر جاتی ہیں تو جاتی پھریں۔''

نادر نے چونک کر امی کی طرف دیکھا، ایک اور غیر متوقع صورتِ حال اس کے سامنے تھی۔ وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ امی اس سارے قصے کو یوں ٹھنڈے پیٹ ہضم کر جائیں گی۔ اس کا خیال تھا امی عملی طور پر اس کے سر پر جوتے برسا کر اس کا سر گنجا کر دیں گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ ساری بہنیں انگشت بدنداں بیٹھی تھیں۔

''اور وہ جو سارے سسرال والے ہیں اور وہ جو برادری ہے، ملنے جلنے والے ہیں، ان کے منہ کون بند کرے گا۔'' منجھلی بہن نے شاک سے نکلتے ہوئے کہا۔

''جس نے یہ کام کیا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہو گا کیسے نمٹنا ہے لوگوں کی باتوں سے۔'' امی سیدھی ہوتی ہوئی لحاف اپنے اوپر کھینچ کر لیٹ گئیں اور چہرہ گرم شال سے ڈھک لیا، یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ مزید اس موضوع پر گفتگو نہیں کریں گی۔

''کوئی ضرورت نہیں کسی سے فی الحال اس ساری بات کا ذکر چھیڑنے کا۔'' بڑی آپا نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے کہا۔ ''واپس آئے گی بیگم صاحبہ اگر کبھی تو دیکھی جائے گی۔'' انہوں نے کن انکھیوں سے نادر کی طرف دیکھا۔

''میں نظروں کے سامنے رہا تو دیکھوں گی ناں تم لوگ۔'' نادر نے دل میں اس ایک طوفان کے ٹل جانے پر شکر ادا کرتے ہوئے سوچا۔ ''یہاں تو زندہ بچ جانے کے بھی چانسز معدوم نظر آتے ہیں، نہ جانے کب کون اٹھانے آ جائے اور میں بھی لاپتا، گمشدہ لوگوں میں شمار ہونے لگوں۔''

☆☆☆

''میں آج آپ کے لیے ایک بہت خاص چیز لائی ہوں۔'' بینش نے کلاس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں دانیال سے مڈبھیڑ ہونے پر مسکرا کر کہا۔

''ارے، واقعی!'' وہ خوش دلی سے بولا۔ ''مجھے امید ہے وہ اندرونِ لاہور کا کوئی خاص اور ثقیل کھانا نہیں ہے کیونکہ میں ایسے کھانے کھانا چاہتے ہوئے بھی کھا نہیں سکتا، میرے ڈاکٹر نے مجھے اس سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔''

''نہیں!'' بینش دانیال کے خیال پر جھینپ کر بولی۔ ''وہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے صرف ایک اتفاقیہ فائنڈنگ ہے۔''

''اوہ...... پھر تو میں دل سے اسے دیکھنا چاہوں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''کلاس کے بعد دکھاؤں گی، آپ اس وقت کہاں ہوں گے؟'' بینش نے کلاس روم کے دروازے کے درمیان کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''قوی امید ہے کہ میں کیفے ٹیریا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔'' وہ مسکرا کر بولا اور سر ہلاتا ہوا آگے چلا

گیا۔ ساٹھ منٹ کی وہ کلاس ہینش کو اب تک کی سب سے طویل کلاس محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

''کیا ضروری ہے کہ میں اپنے گھر کے مسائل پر دماغ کھپانے کے ساتھ ساتھ حمزہ کے مسائل پر بھی ضروری ہی سر کھپاؤں۔'' نگین نے سرف میں بھگوئے دوپٹے ملتے ہوئے سوچا۔ اس کی ساس، نئے سوٹ اور دوپٹے واشنگ مشین میں دھلوانے کی قائل تھیں نہ ہی کپڑے دھونے والی ماسی کے ہاتھ میں دھلائی کے لیے پکڑانے کو پسند کرتی تھیں۔ لہٰذا نئے سوٹ اور دوپٹے نگین کو خود الگ سے دھونے پڑتے تھے۔ اس لیے اس کی جھنجلاہٹ اس روز عروج پر تھی، گزشتہ ایک ہفتے سے وہ لوگ مسلسل ملنے والوں اور رشتے داروں کی شادیوں کے مختلف فنکشنز اٹینڈ کر رہے تھے اور اس روز نتیجتاً نگین کے لیے کپڑوں کا ایک ڈھیر دھونے کو موجود تھا۔

''حمزہ کو بھی تو ایک نئی ہی سوجھی ہے ناں......!'' اس نے سرف میں نئے دوپٹے ڈالتے ہوئے سوچا۔ ''ایک ایسی لڑکی کی تلاش جس کا پتا نشان کوئی ہے نہیں جیسے برسوں سے اس نے دیکھا نہیں اپنے سر پر سوار کر لی ہے۔ اس روز جہاں مجھے لے گیا تھا اچھرے کی تنگ گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا، وہ کوئی جگہ تھی کسی نارمل انسان کے جانے کی......'' اسے یاد آیا۔ ''اور وہاں جا کر بھی نہ وہ لڑکی ملی نہ اس کا کوئی نام و نشان......'' اس نے سر جھٹکا...... ''سچ تو یہ ہے کہ سب میری مروت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جس کا دل چاہتا ہے مجھے انگلی سے لگا کر چل پڑتا ہے اور میں چلی بھی جاتی ہوں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''کاش کبھی اشعر ہی مجھے سمجھائے اور منع کرے ہر کسی کی بات مان لینے سے...... مگر وہ تو سراہتا ہے میری اس عادت کو کہ میں سب کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں اور حمزہ کا تو وہ ویسے بھی بڑا فین ہے۔ اس کے ساتھ مل کر اس فلاحی مقصد کی خاطر خوار ہونے کو بھی وہ تیار کھڑا ہے مگر سوال یہ ہے کہ حمزہ اس لڑکی کو ڈھونڈ کر کرے گا کیا...... اس کی اس تلاش کا مقصد کیا ہے؟'' الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے ڈالتے ہوئے اسے خیال آیا۔

''اگر تو وہ اس خیال میں ہے کہ وہ اس لڑکی کو ڈھونڈ لینے کے بعد نیکی کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اس سے شادی کر لے گا تو پھر یہ تو سوچ ہے اس کی کیونکہ مہرین آنٹی اسے کبھی، کسی صورت میں بھی ایسا نہیں کرنے دیں گی، میں نے سنا ہے کہ وہ فیملی اور فیملی سے باہر ایسی لڑکیوں پر حمزہ کے لیے نظریں لگائے بیٹھی ہیں جن کے پاس جمال بھی ہے اور مال بھی ہے۔'' اسے اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی ٹب میں بچا باقی پانی سامنے اچھالتے ہوئے وہ ہنس دی اور کپڑے دھونے کا تمام سامان سمیٹنے کے بعد کچن کی طرف چل دی۔

☆☆☆

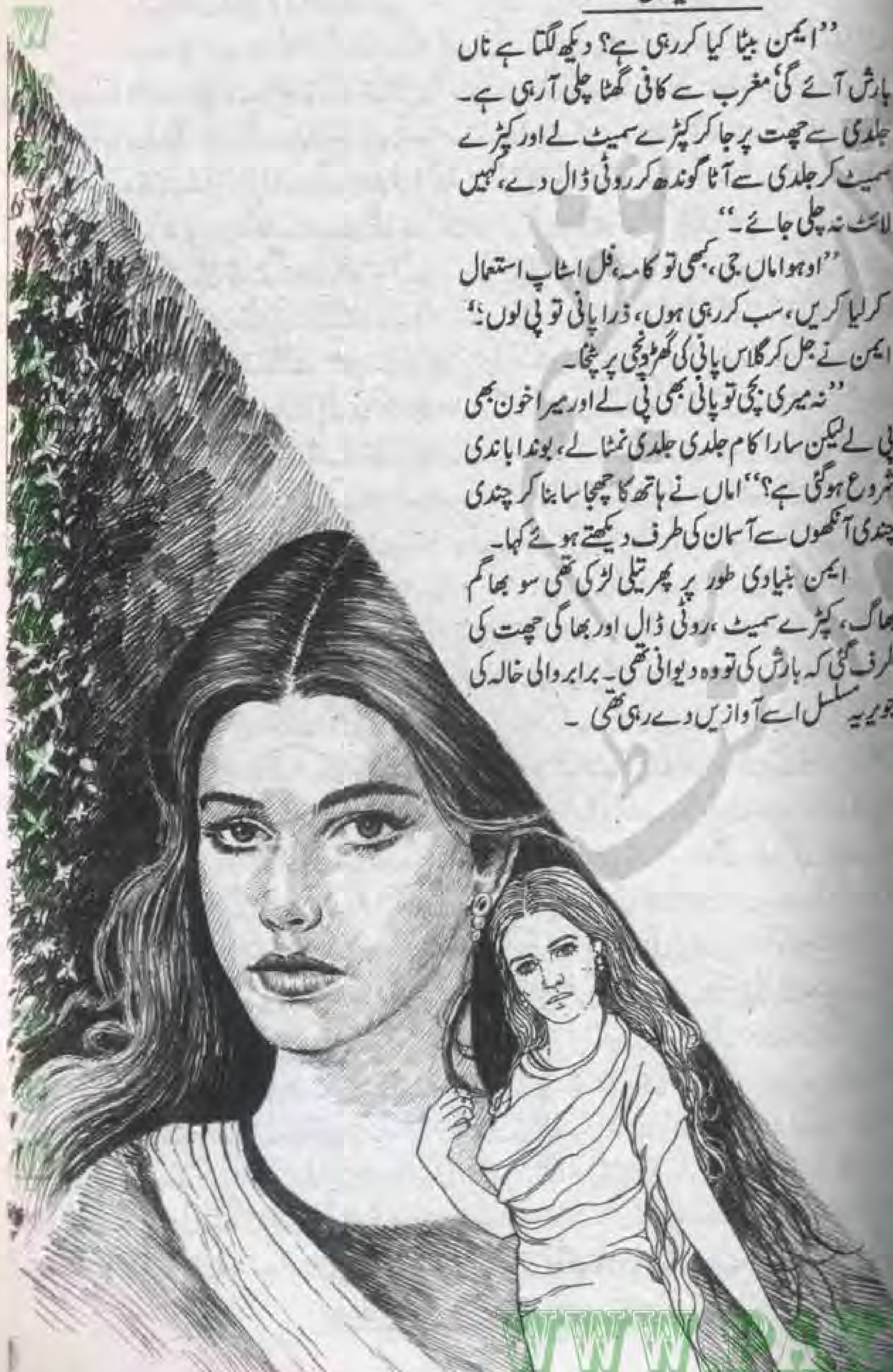
''دانیال نے ابھی کچھ دیر پہلے پوری آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا ممی......'' سکتے، رنج، بے یقینی اور اضطراب کی کیفیت میں اس روز عافیہ جب اسپتال پہنچیں تو ان کے انتظار میں اسپتال کی لابی میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے عاصم نے ان کی طرف دیکھ کر خوشی سے کانپتی آواز میں انہیں بتایا تھا۔

''صوفی صاحب نے کہا تھا عافیہ بیٹی کو میری طرف سے بھی مبارک باد دیجیے گا اور اس سے کہیے گا کہ میں خود اسے مبارک باد نہ دے سکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔'' بیگم اکرام اللہ کے الفاظ ایک بار پھر عافیہ کے اردگرد بازگشت کی صورت گونج تھے۔

(جاری ہے)

ساون تو ہر چھت پر برستا ہے

عقیلہ حق



''ایمن بیٹا کیا کر رہی ہے؟ دیکھ لگتا ہے ناں بارش آئے گی' مغرب سے کافی گھٹا چلی آ رہی ہے۔ جلدی سے چھت پر جا کر کپڑے سمیٹ لے اور کپڑے سمیٹ کر جلدی سے آٹا گوندھ کر روٹی ڈال دے، کہیں لائٹ نہ چلی جائے۔''

''اوہو اماں جی، کبھی تو کامہ، فل اسٹاپ استعمال کر لیا کریں، سب کر رہی ہوں، ذرا پانی تو پی لوں۔'' ایمن نے جل کر گلاس پانی کی گھڑونچی پر پٹخا۔

''نہ میری بچی تو پانی بھی پی لے اور میرا خون بھی پی لے لیکن سارا کام جلدی جلدی نمٹا لے، بوندا باندی شروع ہو گئی ہے؟'' اماں نے ہاتھ کا چھجا سا بنا کر چندی چندی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایمن بنیادی طور پر پھرتیلی لڑکی تھی سو بھاگم بھاگ، کپڑے سمیٹ، روٹی ڈال اور بھاگی چھت کی طرف گئی کہ بارش کی تو وہ دیوانی تھی۔ برابر والی خالہ کی جویریہ مسلسل اسے آوازیں دے رہی تھی۔

’’اری بیٹا کہاں بھاگے جارہی ہے، ذرا سن تو سہی۔‘‘ اماں جی کی آواز نے تیسری سیڑھی پر ہی اس کے قدم روک لیے۔

’’کیا ہے اماں جی؟‘‘ وہ ٹھٹکی۔

’’ارے بیٹا باپ اور بھائی آنے والے ہیں۔ مغرب کا وقت ہو چلا ہے، دیکھ بارش میں تیزی آرہی ہے، چل میری بچی، جلدی سے صحن میں سے پلنگ سمیٹ کر کمرے میں لے آ، بستر ڈال دے، موم بتی ڈھونڈ کر ماچس کے ساتھ مچان پر رکھ دے، دیکھ بجلی نے جھپکی لی ہے، کسی وقت بھی چلی جائے گی اور ساتھ......‘‘

’’بس بس اماں جی بس۔‘‘ ایمن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا۔ ’’مجھے معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے؟ کھانا دھیمی آنچ پر رکھ دوں، پانی کی موٹر چلا دوں، سب سے اہم بات چھت پر پانی میں نہانے نہ جاؤں کہ آس پاس کی چھتوں پر لڑکے ہوں گے جو صرف میرے دیدار کے لیے مر رہے ہوں گے‘ ہے ناں۔‘‘ ایمن کی آنکھیں لبالب شفاف پانی سے بھر گئیں۔

’’اللہ میاں جی، یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ ہم جیسے لوئر مڈل کلاس لوگوں کی زندگی میں تو ویسے بھی کوئی خوشی، کوئی رنگ نہیں ہوتا، اِک بارش اچھی لگتی ہے تو وہ بھی کیا؟ ہر وقت یہی خوف، بجلی نہ چلی جائے، کمرے کی چھت نہ ٹپکنے لگے۔ ابا خیریت سے گھر آجائیں، رات بھر مچھر کاٹتے رہیں، دن بھر صحن میں سے پانی خشک کرتے رہو اور جو بارش ختم ہو جائے تو ہفتوں گلی میں پانی کھڑا رہے اور پانی خشک ہو کر کیچڑ بن جائے اور کیچڑ سڑ کر بدبودار کائی میں بدل جائے تو مارے سڑاند کے گھر میں بیٹھنا مشکل ہو جائے، یہ بھی کوئی زندگی ہے لوگ تو برسات مناتے ہیں، برسات کے گیت گائے جاتے ہیں، پکوان تلے جاتے ہیں، ہلا گلا ہوتا ہے اور ہم لوگ، ہماری کلاس کے لوگ، کیا کرتے ہیں، بہت عیاشی ہوئی تو دال بھری روٹی پک گئی اور ہم خوش لو جی ساون منا لیا، اللہ میاں جی ساون تو بڑے گھروں پر برستا ہے۔‘‘ ایمن صحن میں برستی موسلا دھار بارش میں کڑھ رہی تھی اور اندر اماں جی موم بتی جلا رہی تھیں کہ بارش تیز ہوتے ہی لائٹ چلی گئی تھی۔

☆☆☆

’’یہ میرا گھر، یہ میرا محل نما گھر، جس کو میں نے اور جمال نے بہت محنت سے بنایا تھا، اس گھر کی ایک، ایک اینٹ ہم نے بہت محبت سے رکھی تھی۔ اس کے وسیع کاریڈور کو ہم نے اعلیٰ پائے کی پینٹنگز سے سجایا، گھر کے مشرقی حصے میں فوٹو گیلری بنائی اور اس میں زندگی کے... یادگار لمحوں کو تصویروں میں قید کر کے دیواروں پر سجایا، میرے بچوں کی چھوٹی، چھوٹی شرارتیں بھی جمال نے کیمرے میں قید کر لی تھیں اور پھر ان شرارتوں کو لارج کر کے میں نے فوٹو گیلری میں سجا دیا جو دل کبھی اداس ہوتا ہے تو میں ان تصویروں کے پاس آجاتی ہوں اور پھر ان کی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں علی، شاہ زیب، ہمایوں اور مہر ماہ شرارتیں کرتے ہیں، دوڑتے ہیں‘ ہنستے ہیں کھیلتے ہیں اور جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک سے جاتے ہیں تو میں اس کے ساتھ ہی بنی لائبریری میں آجاتی ہوں جہاں دنیا بھر کے موضوعات پر نایاب کتابیں موجود ہیں ہر کتاب کو کئی بار پڑھ چکی ہوں، جب کسی سے بات کرنا چاہتی ہوں تو کوئی کتاب کھول لیتی ہوں اور پھر چند صفحے پڑھ کر ہی کتاب بند کر دیتی ہوں کہ اس گھر کی خاموشی میری روح میں اترنے لگتی ہے، کبھی بچوں کے بیڈ روم میں بیٹھ جاتی ہوں جو برسوں سے بند پڑے ہیں کہ ہر پرندہ اپنی منزل کی طرف پرواز کر گیا ہے اور میں اس وسیع عریض گھر میں یادوں کو سمیٹتی پھرتی ہوں۔‘‘

’’میڈم...... بارش بہت تیز ہو گئی ہے آپ کی چائے ٹیرس میں لگا دی گئی ہے، آپ اوپر تشریف لے چلیے۔‘‘ میرے باوردی بٹلر نے میری سوچوں میں خلل ڈالا اور میں چونک کر حال میں واپس آگئی۔

ٹیرس میں چائے برسات کے لوازمات کے ساتھ سجی تھی لیکن چائے کے لیے ایک ہی کپ تھا۔ اُف یہ اکیلا

چائے کا کپ کتنا تکلیف دہ لگ رہا ہے۔

ہمارے گھر کا ٹیرس بہت کشادہ ہے کہ جمال کو کشادہ ٹیرس اچھا لگتا تھا، سفید ماربل کے ستون چاروں طرف سے ٹیرس کو سنبھالے ہوئے ہیں، ٹیرس سے نظر آتا وسیع و عریض سرسبز لان آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے، لان کے شمالی حصے میں صرف گلاب کے پودے ہیں، دنیا میں پایا جانے والا ہر قسم کا گلاب میرے گھر میں موجود ہے، گلابوں پر نظر جمائے جمائے مجھے ایسا لگا کہ علی آگے آگے بھاگ رہا ہے اور پیچھے مہر ماہ دوڑ رہی ہے اور ساتھ ساتھ مجھے آوازیں دے رہی ہے کہ دیکھیں امی بھائی نے میری آئس کریم چھین لی اور میرے بجائے جمال کہہ رہے ہیں کہ بیٹے اوپر چلے آؤ بارش بہت تیز ہو رہی ہے، بیمار ہو جاؤ گے اور وہ کچھ نہیں سن رہے کہ بارش کی گھن گرج میں جمال کی آواز اور میری ہنسی جیسے چھپ گئی ہے، وہ بارشیں بھی کیا بارشیں تھیں۔

سب پرندے اپنے، اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھے اور جمال کے انتقال کے بعد ہر بارش کس قدر رُلاتی ہے، یا اللہ تو مجھے کچھ نہ دیتا، چاہے ایک کچا آنگن ہوتا لیکن خوشیاں ہوتیں رنگ ہوتے، بارش ہمارے جیسے ویران گھروں پر کیوں برستی ہے، ساون تو وہاں اچھا لگتا ہوگا جہاں رشتے ہوں، چہل پہل ہو، خوشیاں ہوں، قہقہے ہوں، ایسا ساون تو بھرے پُرے گھرانوں کا نصیب ہوتا ہے میرے مالک......

☆☆☆

’’رحمت بوا ذرا جلدی سے فون میرے قریب لے کر آؤ، میں ذرا اپنی بچیوں کو فون کروں، دیکھو تو ذرا اللہ کی رحمت کس قدر موسلا دھار برس رہی ہے اور یہ دونوں لڑکیاں میرے فون کا انتظار کر رہی ہوں گی، ماشاء اللہ بال بچوں والیاں ہو گئی ہیں لیکن ساون برستے ہی میکے کی یاد میں تڑپتی ہیں میری بچیاں۔‘‘ بیگم شجاع الدین کے لہجے میں ممتا ہی ممتا تھی۔

’’بڑی بیگم صاحبہ پکوان کی ساری تیاریاں ہو گئی ہیں اور کوئی حکم!‘‘ رضیہ جو اس گھر کی پرانی نمک خوار تھی ہاتھ باندھے بوجھ رہی تھی۔

’’ٹھیک ہے جا کر بخشو بابا سے کہو جا کر نواب صاحب سے پوچھو کہ آج کے ساون میں آم کے تحائف کہاں، کہاں بھجوانے ہیں پھر آم کے ٹوکرے اپنی نگرانی میں گاڑی میں رکھوا دو۔ فرح کو بھیجو اس سے کہو، گول کمرے کے اسٹور سے ململ کے دوپٹوں کے تھان نکال کر سوا دو، دو گز دوپٹے کاٹ کر بسنتی رنگ میں رنگ دے، مدیحہ اور ملیحہ آتے ہی اپنے بسنتی دوپٹے مانگیں گی۔‘‘ پوتیوں کے ذکر پر بیگم شجاع الدین کے چہرے پر بکھرا نور دور ہی سے دیکھا جا سکتا تھا کہ ان کی دونوں پوتیاں لاہور کے کنگ ایڈورڈ میں پڑھتی تھیں لیکن برسات کی پہلی جھڑی کے ساتھ ہی وہ سر پر پیر رکھ کر حویلی کی طرف دوڑتی تھیں۔

حویلی میں ہر طرف رونق تھی، چہل پہل تھی، خوشیاں تھیں، باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا، اندر بیگم شجاع الدین اور نواب شجاع الدین بیٹھے اپنے مرحوم بیٹے کے لیے رو رہے تھے جو اپنی بیوی کے ساتھ صرف چند برس پہلے ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔

’’چلیے بیگم، باہر ڈیوڑھی میں بچے ناچ گا رہے ہیں اور ملازمین انتظار کر رہے ہیں کہ آپ کب باہر آئیں اور ان کو بارش کی سوغاتیں عنایت کریں۔‘‘ نواب صاحب نے دردِ دل چھپا کر اپنی بیگم کا دل بہلانا چاہا۔

’’ہاں چلتے ہیں، آپ درست فرما رہے ہیں لیکن کیا کریں کہ ساون کی جھڑی لگتے ہی ہمیں خاور میاں اور دلہن بہت یاد آتے ہیں۔ ان کی یاد ہمیں بہت رُلاتی ہے، دلہن برسات کے موسم میں کس قدر حسین لگتی تھیں، بسنتی رنگ کے جوڑے میں...... بہت تکلیف دیتی ہے بیٹے کی دائمی جدائی اور یہ معذوری۔‘‘ بیگم شجاع الدین نے حسرت سے اپنی مفلوج ٹانگوں اور پھر وہیل چیئر کی طرف دیکھا اور اِک ٹھنڈی سانس سینے سے فارغ کی۔

’’دل چاہتا ہے اپنے بچوں کے لیے، ان کی

ناولٹ

یقین

انجم انصار

کتاب اس کے سینے پر کھلی تھی اور وہ لیٹے لیٹے اس کی سطریں پڑھ رہی تھی۔

''انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر جب دوسروں کی خوشیوں کا سوچتا ہے، اُن کے لیے جیتا ہے تو اس کی بھی اپنی تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔''

''ہونہہ، ہر وقت دوسرے کی خوشی کے بارے میں ہی سوچتے رہو۔'' وہ برا سا منہ بنا کر اٹھ بیٹھی اور لاابالی پن سے کتاب سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے



خوشیوں کے لیے سارے انتظامات ہم، خود اپنی نگرانی میں کروائیں لیکن ہم، ہم تو بغیر سہارے کے ہل بھی نہیں سکتے۔ اب نواب صاحب ہم بچوں کی خاطر اپنے آپ کو خوش ظاہر کر کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو خوش ظاہر کر کے تھک گئے ہیں، کاش ہم صحت مند ہوتے، کاش ہم چل پھر سکتے یہ حویلی جس کو ہم نے بہت محبت سے سجایا ہے اس میں گھوم پھر سکتے، آج ہمارے پاس بہت سارے رشتے ہیں، بہت لوگ ہیں وفادار ملازمین ہیں اس کے باوجود ہم تنہا ہیں۔'' بیگم شجاع الدین نے اِک ٹھنڈی سانس بھر کر ملازمہ کو وھیل چیئر باہر لے کر چلنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''دو دن ہو گئے مسلسل بارش کو برستے ہوئے اور ہم کو سوئے ہوئے، یا اللہ غریبوں کے لیے تیری رحمت زحمت بن جاتی ہے، یہ آٹھ بچے اور بیمار شوہر کو لے کر کہاں جاؤں، پچھلے برآمدے کی چھت مسلسل برس رہی ہے، گٹر بھر گئے، صحن میں گٹر اور برسات دونوں کا پانی جمع ہو رہا ہے فضل دین، اس طوفانی بارش میں اپنا کباڑ کا ٹھیلا بھی نہیں نکال سکتا، دو دن سے روکھی سوکھی کھا رہے ہیں میرے مالک لیکن آج تو روکھی سوکھی کا بھی بندوبست نہیں ہے۔'' خدیجہ آٹے کا خالی کنستر جھاڑتے ہوئے اللہ سے باتیں کر رہی تھی کہ وہی تو اِک غم گسار ہے دنیا میں۔

''اماں چائے پاپا دے دے۔'' چار سالہ پپو بغیر منہ دھوئے کمرے کی چوکھٹ میں کھڑا اس کو آوازیں دے رہا تھا کہ مسلسل برستا پانی اس کو صحن میں آنے نہیں دے رہا تھا اور اگر وہ صحن میں آ کر بھیگ جاتا تو خدیجہ اس کو سوکھے کپڑے کہاں سے لا کر پہناتی۔

''ہاں..... ہاں میرے بچے میں لاتی ہوں، کیا تیرا ابا اور باقی بہن بھائی اٹھ گئے؟'' خدیجہ نے اس کو باتوں میں لگا کر بغیر دودھ کی چائے اور رات کی روٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

''یہ کیا دے رہی ہے اماں، اماں خدا کی قسم یہ مجھ سے نہیں کھایا جاتا، اماں نرم روٹی دے دے، مجھے رات سے بھوک لگی ہے۔''

''آپا، آپا!'' پپو نے سولہ سالہ نسیمہ کو اٹھایا۔ ''آپا تو پکا دے روٹی۔'' پپو ہاتھ میں سوکھی روٹی لیے رونے لگا، اس کی رونے کی آواز سے سارے بچے اور فضل دین بھی اٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' فضل دین نے پوچھا۔ خدیجہ نے تکلیف سے سیلن زدہ دیواروں کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''بیٹا گھر میں کچھ نہیں ہے، دعا کرو، بارش تھمے تو میں ٹھیلا لے کر نکلوں پھر شام کو آٹا لے کر آؤں گا۔'' فضل دین نے سب بچوں کو جیسے دلاسا سا دیا۔

''نسیمہ تو ایسا کر، برابر والی جُجن خالہ سے سو روپیہ مانگ لا، بارش تھمے گی تو واپس کر دیں گے۔'' خدیجہ کو جُجن خالہ کی شکل میں اِک امید نظر آئی تو اس نے بیٹی سے کہا۔

''نہیں اماں، میں نہیں جاؤں گی، کل بھی تم نے جُجن خالہ سے چار آلو اور تھوڑا سا آٹا منگوایا تھا تو انہوں نے دیا بھی نہیں اور مجھے بہت بری طرح ڈانٹا تھا کہنے لگیں کہ بھئی ہم خود غریب ہیں، ہمارے پاس کیا رکھا ہے یہ کوئی ایدھی سینٹر نہیں ہے کہ تم مانگنے چلی آتی ہو اگر کچھ نہ ہوا کرے تو گھر میں چپکی بیٹھا کرو اور اپنی اماں سے کہنا کہ اوقات نہیں تھی تو اتنے بچے پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی، اور بس پتا نہیں کیا، کیا کہہ رہی تھیں۔'' نسیمہ نے بھوک کی وجہ سے پیٹ میں پڑتے بل کو دباتے ہوئے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''یا اللہ، یہ آٹھ بچے، تہی دست شوہر، باہر بارش تیز موسلا دھار بارش، فاقہ مستی، میرے مالک میں کہاں جاؤں؟ آخر ساون غریبوں کی چھت پر کیوں برستا ہے۔

باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور اندر خدیجہ کی آنکھیں.....

مگر کسی تفریق کے بغیر ساون تو ہر چھت پر برستا ہے۔

بڑبڑائی۔

"انسان جب کسی دوسرے کے لیے جیتا ہے تو دوسروں کی خوشیاں اپنی کہاں ہوتی ہیں اور جب اپنے لیے جیتا ہے تو اس کی خوشیاں صرف اس کی ہوتی ہیں کسی دوسرے کی نہیں۔" اپنی بات اسے خود ہی اچھی لگی۔ اب وہ بیڈ سے اتر کر لاؤنج میں آگئی اور ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے بولی۔ جیسے خود کو سمجھا رہی ہو۔

"سن لو نور...... اب تمہیں اپنے لیے جینا ہے صرف اپنے لیے۔ دوسروں کے لیے تو میں بہت جی لی مگر اب میں اپنے لیے جینا چاہتی ہوں، ہاں...... اپنے لیے۔" اپنی بات اسے اتنی اچھی لگی کہ وہ خود ہی ہنس پڑی اور لگی گنگنانے۔

"جییں تو جییں کیسے۔" موبائل کی بپ نے اس کی ہنسی کو بریک دیا مگر اس کی ننھی سی اسکرین پر آنے والے نمبر کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنا کر اسے یوں دیکھا جیسے اس نے مداخلت کی ہو اور موبائل دوسری طرف ڈال دیا۔ گھنٹی بار بار بج رہی تھی اور وہ یوں اس سے پیٹھ موڑے بیٹھی تھی جیسے اس کے کانوں میں کوئی آواز ہی نہ آرہی ہو۔

☆☆☆

دوسری جانب شیریں آنٹی اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی جیولری اپنے آپ سے لگا کر جانچ رہی تھیں اور حیرت سے بڑبڑا بھی رہی تھیں۔

"کیا بات ہے، یہ ماہ نور آج میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔" اپنا گرین نگینوں والا ہار ستائشی نظروں سے دیکھنے کے بعد انہوں نے ماہ نور کو پھر فون ملایا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور لگتا تھا کہ موبائل کی مالکہ اپنے موبائل سے کوسوں دور ہے۔

"حیرت ہے...... ہمہ وقت اپنا موبائل اپنے ساتھ لے کر چلنے والی ماہ نور اپنا موبائل خود سے دور کیے بیٹھی ہے۔" جبکہ حقیقت یہ تھی کہ موبائل ماہ نور کے پاس ہی تھا اور وہ شیریں آنٹی کا نمبر دیکھ کر اگنور کر رہی تھی اور جب شیریں آنٹی کی یہ دستک کسی صورت ختم نہیں ہوئی تو ماہ نور نے برا سا منہ بنا کر موبائل اٹھایا اور قصداً شیریں لہجہ بناتے ہوئے بولی۔

"جی شیریں آنٹی، کیسی ہیں آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم کہاں تھیں؟ کب سے تمہیں فون ملا رہی تھی۔" اُن کے لہجے میں شکوہ رچا ہوا تھا۔

"آنٹی میں ماما کے کمرے میں تھی۔ ابھی اپنے کمرے میں آئی تو موبائل کی بپ سنی۔" ماہ نور بھی باتیں بنانے میں کوئی کم نہیں تھی۔

"یہ بتاؤ، آج رات کے فنکشن میں آرہی ہوناں تم؟" شیریں آنٹی ہمیشہ سے دوٹوک باتیں کرنے کی عادی تھیں۔

"نہیں آنٹی، میں نہیں آسکوں گی حالانکہ میرا دل بہت چاہ رہا ہے مگر کیا کروں چاہتے ہوئے بھی نہیں آسکتی میں۔"

"کیوں بھئی، ایسی کیا افتاد آپڑی ہے؟"

"میرے امتحان ہو رہے ہیں ان دنوں اور آپ تو جانتی... ہی ہیں امتحان کسی بھی بڑی افتاد سے کم تھوڑی ناں ہوتے ہیں۔"

"اب کوئی ہر وقت تو نہیں پڑھائی ہوتی صرف گھنٹے بھر کی تو بات ہے، آجاؤ ناں اور مجھے اچھا لگے گا کہ تم میرے بھتیجے کے ولیمے میں شرکت کرو۔"

"کاش آنٹی میں آسکتی...... مگر سوری میں نہیں آسکوں گی۔ بالوں میں تیل لگا ہوا ہے کب شیمپو کروں گی کب ڈریس چوائس کروں گی اور مغرب ہو چکی ہے، ناممکن...... میں نہیں آسکتی۔"

"ولیمے کی تقریب میں مہمان دس بجے کے بعد آنا شروع ہوتے ہیں۔ بہت ٹائم ہے تمہارے پاس۔" شیریں آنٹی کا لہجہ پیار بھرا تھا مگر تحکم آمیز بھی۔

"میرے لیے پھر بھی مشکل ہوگا۔" ماہ نور کو ان کے ایسے لہجے سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔

"ماہ نور تم جانتی ہوناں نہ سننے کی مجھے عادت نہیں ہے اور تم آرہی ہو۔" شیریں آنٹی کا لہجہ کسی سخت گیر پرنسپل کا سا ہو گیا اور انہوں نے اپنی بات مکمل ہونے کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

"یہ شیریں آنٹی بھی پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں۔" ماہ نور کا موڈ آف ہو گیا۔ "جیسے وہ بلائیں گی اور میں دوڑتی ہوئی چلی جاؤں گی جیسے پہلے جایا کرتی تھی، ہونہہ...... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ لوگوں کے ولیمے اٹینڈ کرتی پھروں۔ تکبر بھری عورت کا بلانے کا انداز بھی تو کتنا جتا دینے والا تھا نہ سننے کی مجھے عادت نہیں ہے۔" ماہ نور نے نقل اتاری اور خود ہی ہنس دی۔

کتنی ہی دیر وہ خود کو مختلف کاموں میں الجھائے رہی مگر اس کے دماغ میں شیریں آنٹی کی پارٹی کا ہی خیال بار بار آرہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔

"شیریں آنٹی کے ہاں کی گیدرنگ ہمیشہ شاندار ہوتی ہے اور یہ ان کے لاڈلے بھتیجے کا ولیمہ ہے۔ گیدرنگ تو واقعی شاندار ہوگی۔ پتا نہیں، کون کون آئے گا جن سے ملنا بھی ایک اعزاز ہوتا ہے۔ اگر میں نہیں گئی تو میں خود ہی ایک اچھا موقع کھو دوں گی اور آنٹی برا مانیں گی تو اس کا دورانیہ خاصا طویل چلے گا لیکن اگر گئی تو...... کون سا سوٹ پہنوں جو سب سے زیادہ منفرد نظر آؤں۔ شیریں آنٹی کے ہاں تو ایک سے ایک سیلیبرٹی موجود ہوں گے۔ اس میں منفرد نظر آنا اتنا آسان ہے کیا؟" اس نے خود کو سمجھایا۔

"میں ایسی تقریب میں جاؤں ہی کیوں جہاں نظر انداز کر دی جاؤں اور کوئی مجھے ستائشی نظروں تک سے نہ دیکھے۔ یہ تو میں برداشت ہی نہیں کر سکتی۔" اب وہ از خود بڑبڑا رہی تھی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کروں تو کیا کروں۔" اب وہ مسلسل ٹہل رہی تھی اور جب اس کی

صبحِ آزادی

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا، شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خوابگاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہیں
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے، بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر بھی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

شاعر: فیض احمد فیض

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

ٹانگیں شل ہوگئیں تو وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بھاڑ میں گئی پارٹی...... شیریں آنٹی ناراض ہوتی ہیں تو ہوجائیں، میری بلا سے۔ اب اتنے شارٹ نوٹس پر میں تو تیار نہیں ہوسکتی۔ ہاں، ماہ نور نہیں جائے گی تو نہیں جائے گی۔“

☆☆☆

شیریں آنٹی بحیثیت فنانسر بے حد مقبول تھیں۔ کئی پروڈکشن ادارے ان کے مالی تعاون کی وجہ سے سر اٹھائے کھڑے تھے اور یہی وجہ تھی شوبز سے متعلقہ لوگ بھی ان کے آگے پیچھے گھوما کرتے تھے۔ کسی کو جانے والا ایک فون ہی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

فوزیہ اور سائرہ شوبز کی دو ابھرتی ہوئی فنکارائیں تھیں، وہ بھی شیری آنٹی کی تقریب میں جارہی تھیں۔ پارلر سے تیار ہوکر وہ ایک دوسرے کو پھولوں کے کنگن پہناتے ہوئے باتیں کررہی تھیں اور ان کی گفتگو کی تان ماہ نور پر آکر ٹوٹ رہی تھی۔

”دعا کرو آج کی تقریب میں بے شک شہزادیاں اور پریاں آجائیں مگر ماہ نور نہ آئے۔“ فوزیہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ ماہ نور سے خوف زدہ سی ہو۔

”مگر وہ تو ضرور آئے گی۔“ سائرہ نے ہنس کر حتمی سے لہجے میں کہا۔

”کیوں آئے گی؟“ فوزیہ کی بھوئیں چڑھ گئیں۔

”تم دیکھ لینا وہ ضرور وہاں موجود ہوگی۔“ سائرہ پھر ہنسی۔

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ شیریں آنٹی ویسے تو بے حد نخرے والی خاتون ہیں ہر ایک کو منہ نہیں لگاتیں مگر اپنے ہاں کی چھوٹی سی چھوٹی تقریب میں وہ ماہ نور کو ضرور انوائٹ کرتی ہیں۔“ فوزیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”سنا ہے ماہ نور سے ان کی رشتے داری ہے اور جب ماہ نور کی فیملی غریب ہوا کرتی تھی تو یہ شیریں آنٹی ہی ان کا سارا خرچ اٹھایا کرتی تھیں۔“ سائرہ نے جتاتے ہوئے بتایا۔

”تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟“

”ماہ نور کی ایک کزن نے مجھے بتایا تھا۔“

”ہوسکتا ہے وہ جھوٹ بول رہی ہو؟“

”نہیں...... وہ سچ کہہ رہی تھی اس کے لہجے میں جلن بھی تھی۔ یوں بھی اب رشتے دار ہی رشتے داروں سے جلا کرتے ہیں۔ غیر لوگوں کو تو پروا تک نہیں ہوتی۔“

”مگر مجھے تو یہ ماہ نور کبھی اچھی نہیں لگی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ کی وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ جب وہ اتراتے ہوئے باتیں کرتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کردوں۔“ فوزیہ نے سچائی سے اپنے دل کی بات بتائی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اس کی خوب صورتی سے جلتی ہو، ہے ناں یہی بات...... میں سچ کہہ رہی ہوں ناں؟“ سائرہ نے تمسخر بھرے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے تو خیر ماہ نور کبھی خوب صورت نہیں لگی مگر مجھے اس کی چھچھوری باتیں ضرور زہر لگتی ہیں۔“ فوزیہ نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

”یہ تو مت کہو خوب صورت تو وہ واقعی ہے اور اس وقت نئی لڑکیوں میں وہ سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور اسی وجہ سے اس کو خود پر ناز بھی بہت ہے۔“

”عجیب سائیکی سی لگتی ہے مجھے۔ اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ خوب صورتی اصل وہ کہلاتی ہے جس میں شائستگی بھی ہم وزن ہو۔“ فوزیہ دور کی کوڑی لائی۔

”اور وہ اس میں رتی بھر نہیں ہے۔“ سائرہ کو ہنسی آگئی۔

”ہاں جب ہی تو وہ خوب صورتی کی کیٹیگری میں نہیں آتی۔“

”فوزیہ تم پریشان نہ ہو میرا خیال ہے کہ آج کی تقریب میں وہ نہیں آئے گی۔“

”سائرہ یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو یقیناً تم نے اسے فون کیا ہوگا اور اس کے آنے کے بارے میں پوچھا ہوگا؟“

”میں کوئی ماہ نور کی نوکر ہوں جو اسے فون کرکے اس کے آنے جانے کا پوچھوں گی۔“ سائرہ برا مانتے ہوئے بولی۔

”تو پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟“ فوزیہ کے لہجے میں ہنوز حیرانی رچی تھی۔

”اس کا پہلا ٹی وی سیریل بری طرف فلاپ ہوا ہے اس لیے سنا ہے کہ وہ اپنے گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہے۔“

”اگر پہلا سیریل ہی پٹ جائے تو ایکٹر بھی لازمی پٹ جاتا ہے۔ اب خوب صورتی کوئی ٹیلنٹ تھوڑی ناں ہوا کرتی ہے۔“ فوزیہ نے پھولوں کی لڑیاں اپنے جوڑے کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

”یہ تو نہ کہو تم ایسا تو ہو نہیں رہا۔“

”میں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا؟“ پھولوں کی لڑی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

”آج کل خوب صورتی ہی ٹیلنٹ کے طور پر چل رہی ہے۔ اب ڈراموں کو غور سے دیکھو تو خوب صورت لڑکیاں ہر طرف چھائی ہوئی ہیں۔“ سائرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مگر ماہ نور کا سیریل تو ڈوب گیا ناں خوب صورت ہونے کے باوجود۔“ فوزیہ نے بال پن کی مدد سے لڑیاں لگا ہی لیں۔

”ماہ نور کے ساتھ بیڈلک یہ رہی ہے کہ سیریل کا اسکرپٹ بالکل بکواس تھا اس لیے بے چاری کو سلٹ دیا۔“

”اسکرپٹ کیوں خراب لے لیا گیا۔ ویسے تو

پروڈیوسر بڑی مین میخ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اصل چیز کو ہی انہوں نے نہیں دیکھا...... حیرت ہے بھئی۔“

”سنا ہے پروڈیوسر نے پیسے بچانے کے چکر میں سیریل اپنی بیوی سے لکھوالیا تھا اور مارے گئے۔“

”اللہ کرے ماہ نور کے لیے یہ تجربہ آخری ٹھہرے اور وہ ٹی وی پر اپنی شکل کبھی نہ دکھائے۔“ فوزیہ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا جیسے دعا مانگ رہی ہو۔

”اور اپنے گھر میں ہاؤس اریسٹ ہو جائے۔“ سائرہ نے بھی اپنے ہاتھ بلند کردیے۔

”آمین ثم آمین۔ کاش وہ نہ آئے اور آج کی تقریب میں ہم ہی ہم ہوں۔“ فوزیہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ارے دس تو یہیں بج گئے۔ جلدی چلو شیریں آنٹی ہمارا انتظار کررہی ہوں گی۔“ سائرہ نے ہاتھ کی گھڑی پر نظر پڑتے ہی گھبرا کر کہا اور وہ دونوں تیزی سے کار پورچ کی جانب چل دیں جہاں ڈرائیور ان کا انتظار کررہا تھا۔

☆☆☆

شادی کا لان بے حد خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ شیریں آنٹی نے شوبز کے لوگوں کے لیے علیحدہ صوفے لگوائے تھے جو قدرے اونچائی پر تھے جنہیں لوگ دور بیٹھ کر بھی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ فوزیہ اور سائرہ جب وہاں پہنچیں تو اپنے اطراف پر ایک نظر ڈال کر آہستگی سے بولیں۔

”شکر ہے وہ چڑیل نہیں آئی ہے۔“

”شاید ہماری دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔“

”یا وہ اپنا سیریل پٹ جانے کے بعد شرمندہ ہوکر اپنے گھر میں بیٹھ گئی ہے۔“

”اللہ کرے وہ اپنی ساری زندگی شرمندگی میں ہی گزار دے۔“ اور پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑیں جیسے

اپنی باتوں سے خود ہی لطف اندوز ہو رہی ہوں۔

☆☆☆

گیارہ بج گئے تھے تقریباً تمام مہمان ہی آچکے تھے۔ شیریں آنٹی اپنی خوب صورت رسٹ واچ کو بار بار دیکھ رہی تھیں۔ سمدھیانے کے اکا دکا مہمان شاید ابھی نہیں پہنچ پائے تھے۔ ان کے انتظار میں ہی انہوں نے ڈنر شروع نہیں کروایا تھا۔ کسی نے ان کو آواز دی تو وہ اسٹیج کی جانب مڑیں اور عین اسی لمحے ایک شاندار گاڑی لان کے عین دروازے پر آ کر رکی جس سے اترنے والی شخصیت شاندار تھی۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ندیم شکل ہی سے سیلیبرٹی نظر آ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں بڑا سا بوکے تھامے اندر بڑھا اِدھر اُدھر دیکھ کر جب اسے کوئی نظر نہیں آیا تو وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

"خواہ مخواہ ہی آ گیا میں، اب بور ہونا پڑے گا۔"

"تمہارے ساتھ فراز صاحب نہیں آئے۔ انہوں نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے۔" شیریں آنٹی کی اس پر نظر پڑی تو وہ فوراً اس کے پاس آئیں اور اسے یوں تنہا دیکھ کر بولیں۔

"ان کی ایمر جنسی میٹنگ نکل آئی اس لیے وہ نہیں آ سکے ورنہ وہ واقعی میرے ساتھ ہی آ رہے تھے۔ اس وقت پروڈکشن ہاؤس میں میٹنگ چل رہی ہے۔"

"اور وہ آمنہ، محب اور سیفتا کہاں رہ گئیں اور عبداللہ کی تو مجھ سے کمٹمنٹ تھی۔"

"وہ سب شوٹ میں مصروف ہیں۔ فراز صاحب نے کہا اگر میں بھی نہیں گیا تو آپ ناراض ہو جائیں گی۔ اس لیے میں سیٹ سے سیدھا آ رہا ہوں۔"

"فراز سے تو میں بعد میں پوچھوں گی۔" دیگر مہمانوں کو آتا دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

اب میرج لان مہمانوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ دولھا، دلہن اسٹیج پر ہنستے مسکراتے باتیں کر رہے تھے۔ کوئی گلوکار اسٹیج کے بائیں جانب کھڑا شادمانی کے گیت گا رہا تھا۔ شوبز کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آج کی تقریب میں تھی جسے ان کے دیگر مہمان بے حد خوشی سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

سائرہ اور فوزیہ یہاں اپنی پزیرائی پر از حد خوش تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے احساس برتری کا لہجہ لیے باتوں میں مصروف تھیں۔

"آج میرے ڈریس کی سب نے ہی بہت تعریف کی ہے۔" جب سائرہ نے کہا تو فوزیہ نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"میری تو جیولری تک کی تعریف ہوئی ہے بلکہ دلہن کی چھوٹی بہن کہہ رہی تھی کہ میں ٹی وی پر بہت موٹی لگتی ہوں ورنہ میں بہت خوب صورت ہوں۔"

"فوزیہ تم نے وزن بھی تو کافی بڑھا لیا ہے۔ اب دبلی کہاں رہی ہو تم۔" سائرہ کو غصہ تو آنا ہی تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو سائرہ تم...... میرا ویٹ تو وہی پرانا چل رہا ہے۔ ہاں موٹی تو مجھے تم لگ رہی ہو۔"

"میرا تو ویٹ... پہلے سے دو کے جی کم ہو گیا ہے۔ مجھے تو لوگ یہاں ماڈل گرل سمجھ رہے ہیں۔" سائرہ نے اترا کر کہا۔

"تم میرے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھو تم مجھ سے زیادہ موٹی لگ رہی ہو۔" فوزیہ نے تمسخر سے کہا۔ سائرہ ساڑی کا پلو کمر پر کس کر کھڑی ہو گئی۔ فوزیہ نے بھی اپنا پلو اپنے شانوں سے گرا لیا۔ ابھی یا ہی مقابلے بازی کی تقریر میں شاید کچھ طوالت آتی کہ پیچھے ہنسی کی آواز سن کر دونوں نے ایک ساتھ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

میرج گارڈن کے بڑے سے گیٹ پر شاندار سوک سے ماہ نور اتر رہی تھی۔ باوردی شوفر اسے سلام کر کے گاڑی بڑھا کر لے گیا تھا اور وہ ریڈ کارپٹ پر اپنی جھلمل سیاہ میکسی میں کسی اپسرا کی طرح داخل ہو رہی تھی۔ فوزیہ، سائرہ دونوں کے پرس ان کے ہاتھوں سے گر گئے اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ماہ نور جہاں سے گزر رہی تھی سب اسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ واقعی اتنی حسین تھی کہ اسے دیکھا جائے۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔" شیریں آنٹی اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

"آپ بلائیں اور میں نہ آؤں...... ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔"

"ہمیشہ کی طرح بہت پیاری لگ رہی ہو۔" شیریں آنٹی اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

"تھینکس۔" اس کا لہجہ فخر سے رچا ہوا تھا۔ فوزیہ اور سائرہ سے دل جلی باتیں سننے اور کرنے کے بعد وہ ایک خالی میز کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے یہ تنہا گوشہ اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس وقت اس کا نہ کسی سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور نہ ہی کسی سے ملنے کا۔

اتنی خوب صورت میکسی کی تعریف اتنی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ وہ چاہ رہی تھی۔ زیبا پاریکھ اس کی ڈریس ڈیزائنر نے صرف ایک فون کال پر ہی اس کے لیے یونیک سی میکسی اسے بھجوا دی تھی جسے دیکھ کر وہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی مگر اپنے اطراف اسے کوئی جگمگاتا نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیریں آنٹی اس سے کہیں گی کہ تم تو آج ہماری دلہن سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہو مگر انہوں نے بھی یہ جملہ اپنے دل میں ہی سینت کر رکھ لیا تھا۔ اس کا یہ اپنا خیال تھا۔ ویسے کی اس گیدرنگ میں اس سے آٹوگراف لینے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔

تقریب میں خواتین شوبز کے لوگوں کے آٹوگراف تو ضرور لے رہی تھیں مگر صرف مرد فنکاروں کے۔

"ہونہہ...... جیسے وہ خوش ہو کر ان کو شادی کی ویکسینیشن ہی کر دیں گے۔" اب وہ صوفے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند کر بڑبڑائی۔

"میں خوہ مخواہ ہی چلی آئی۔ اگر اپنے دل کی بات مان لیتی تو یوں بور تو نہ ہوتی۔" بیرے جوس سرو کر رہے تھے اس کے پاس آ کر انہوں نے گلاس اس کے سامنے رکھا۔ ماہ نور نے بیرے کو دیکھ کر آنکھوں سے منع کیا اور پھر لاتعلق سی بیٹھ گئی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" ندیم مسلسل ماہ نور کو دیکھ رہے تھے وہ اپنا لائم جوس پیتے ہوئے اس کی ٹیبل کے قریب آئے اور اپنی مخموری آواز میں بولے۔

"میں اس تقریب کی میزبان تھوڑی نہ ہوں۔ آپ جہاں دل چاہے بیٹھیں۔" ماہ نور اس پر ایک غلط نگاہ ڈال کر پیٹھ موڑ کر رکھائی بھرے لہجے میں بولی۔ اب ماہ نور اس سے قدرے منہ موڑ کر اپنا موبائل نکال کر دھیمے لہجے میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

"ہاں بھئی، سخت بور ہو رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں میں تو آ کر پچھتائی...... کاش نہ آتی۔ پرسوں پیپر بھی ہے میرا۔ کہیں فیل نہ ہو جاؤں۔ اللہ نہ کرے میں فیل ہو گئی ناں تو بہت مذاق اڑے گا میرا۔"

دوسری جانب ندیم بظاہر کہیں اور دیکھ رہا تھا مگر اس کی نظریں اور کان وہیں لگے ہوئے تھے اور اب وہ بھی قدرے ٹیڑھا ہو کر اپنا موبائل نکال کر بات کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ بھی قدرے دھیما تھا مگر اتنا دھیما بھی نہیں کہ ماہ نور کے کانوں میں آواز نہ جائے۔

"یار کبھی تو آواز پہچان لیا کر۔ میں فراز پروڈکشن ہاؤس سے بول رہا ہوں۔ یار میرے نئے سوپ کے لیے آمنہ شیخ سے ڈیٹس لے لو یا سنیتا مارشل سے۔ نو، نو میں ہیروئن ہلکی نہیں لے سکتا اور نیا چہرہ تو کسی صورت نہیں۔" ندیم کی باتیں سن کر ماہ نور کے بھی کان کھڑے ہوئے اور اب وہ اپنا موبائل آف کر کے ندیم کی جانب چہرہ گھما کر بیٹھ چکی تھی مگر ندیم لاتعلق سا اپنے فون میں مصروف تھا۔ ماہ نور نے اسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔

"یار سمجھا کرو اس سوپ میں، میں ساڑھے تین کروڑ کی انویسٹمنٹ کر رہا ہوں۔ اگر اچھی ہیروئن نہیں مل رہی تو مجھے تازہ کھلتا ہوا گلاب سا چہرہ

''چاہیے۔'' ندیم قدرے رخ موڑ کر رازدارانہ لہجے میں فون پر بولا۔ اب ندیم سیدھا ہو کر بیٹھا اور ماہ نور کو دیکھے بغیر اپنی بات مکمل کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سوا وہاں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

''دیکھ یار، کل تک ڈن کرنا ہے مجھے...... میں بہت پریشان ہوں اور میں نہیں ڈھونڈ سکتا تو جانتا ہے ناں مجھے۔'' اب اس نے موبائل اپنی جیب میں ڈال کر گہری سانس لی تو ماہ نور اسے دیکھ کر مسکرائی مگر ندیم اسے دیکھے بغیر اپنے خیالوں میں مگن تھا۔

''آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے آپ جوس پی لیں۔'' ماہ نور نے پاس سے گزرتے ہوئے بیرے کو بلا کر دو جوس کے گلاس لیے۔ ایک اپنے سامنے رکھ کر دوسرا گلاس ندیم کے سامنے رکھ کر بولی۔

ندیم نے گردن ہلا کر شکریہ ادا کیا اور ہنوز اپنے ہی خیالوں میں گم اس نے نظر اٹھا کر ماہ نور کو دیکھا تک نہیں۔

''آپ کیا پروڈکشن ہاؤس میں کام کرتے ہیں؟'' اسے یوں لاتعلق سا دیکھ کر ماہ نور ہی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی...... مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟'' وہ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا تو ماہ نور نے اپنا سوال دہرایا تو وہ مسکرا دیا۔

''چلیں مت بتائیں۔ میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' ماہ نور کو اس کا تکبرانہ انداز بھی برا نہیں لگا۔

''جی ہاں، میں تھوڑا بہت کام بھی کرتا ہوں اور پروڈکشن ہاؤس بھی میرا اپنا ہے۔''

''رئیلی...... !'' ماہ نور کا لہجہ یک دم کھل سا گیا۔

''جی ہاں بس اپنے آپ کو مشغول رکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا کام کر رہا ہوں ورنہ اصل بزنس تو ہمارا گولڈ کا ہے۔'' ندیم کا لہجہ سادگی سے مزین تھا۔

''گولڈ کا بزنس !'' اس نے سرشاری اور تحیر سے پوچھا۔

''ہاں چند دکانیں ہیں دبئی میں جو میرے سعودی دوست سنبھالے ہوئے ہیں۔ میں تو وہاں مہینے میں ایک دو بار جا کر وزٹ کر لیتا ہوں۔'' ندیم کے لہجے میں ہنوز سادگی کے ساتھ بے پروائی بھی موجود تھی۔

''گولڈ کی شاپس بھی بھلا کسی دوسرے کو دی جاتی ہیں؟'' وہ واقعی شاکڈ سی تھی۔

''مس......'' وہ رکا۔

''ماہ نور کہتے ہیں مجھے۔'' وہ مسکرائی۔

''ہاں تو مس ماہ نور سارا کام بھروسے کا ہوتا ہے۔ میرے دوست، میرے آفس ورکرز حد تو یہ ہے کہ میرے آرٹسٹ میرے سب ساتھی...... سب ہی میرے بھروسے کے ہیں۔''

''ایک سیریل میں تو میں نے بھی کام کیا ہے۔'' ماہ نور نے قدرے شرما کر بتایا۔

''اچھا۔'' ندیم نے اسے حیرت سے دیکھا اور پھر بے پروائی سے بولا۔ ''مگر میں نے نہیں دیکھا اگر دیکھا ہوگا تو یاد نہیں رہا کہ میری اپنی مصروفیات ہی اتنی ہیں کہ اپنے آپ کو یاد نہیں رکھ پاتا۔'' اب وہ از خود مسکرا رہا تھا جیسے اپنی بھولی بسری بات یاد کر کے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔

''باتیں دلچسپ کرتے ہیں آپ۔ اب ایسا بھلا کون ہوگا جو خود کو یاد نہ رکھ سکے۔'' ماہ نور نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنس دیا۔

''بے شک آپ میری بات کا یقین نہ کریں مگر میں ایسا ہی ہوں۔ نہ اپنے آپ کو یاد رکھ پاتا ہوں اور نہ ہی اپنی چیزوں کو۔''

''کیا مطلب؟'' ماہ نور حیرت زدہ سی سوالیہ نظروں سے پوچھ رہی تھی۔

''اب آپ اس ماہ کی بات سن لیجیے، اپنے دو آئی فون اور آئی پیڈ کہیں رکھ کر بھول گیا آئی فون تو G5 نمبرز کے تھے۔''

''آپ نے ڈھونڈے نہیں اپنے آئی فون اور آئی پیڈ؟''

''وقت ہی تو نہیں ہے اپنے لیے۔'' ماہ نور نے اسے بے یقینی سے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔ ماہ نور نے اسے دیکھا وہ ہنستے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''حیرت ہے بھئی۔'' ماہ نور نے اپنے کندھے اچکائے۔

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہ......''

''اوہ، آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ بڑے بڑے نقصانات برداشت کرتے ہی رہتے ہیں۔'' اس کی بات کاٹ کر ماہ نور نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا وہ چند ساعتوں میں ہی اپنی اصل جون میں لوٹ آئی تھی۔

''یہ بات بھی نہیں ہے۔'' وہ پھر ہنس دیا۔ ماہ نور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا ضرور مگر بولی کچھ نہیں۔

''جب مجھے خود یہ یاد ہی نہیں کہ میں نے اپنے موبائل اپنی دراز میں رکھے تھے یا کسی واسکٹ کی جیب میں گھر میں رکھے یا آفس میں۔ گاڑی میں رکھے یا کیبن میں تو میں کس سے کہوں کہ وہ میرا آئی پیڈ اور میرا موبائل ڈھونڈے جبکہ وہ چارج بھی نہیں ہے۔''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اس طرح تو آپ کا بہت نقصان ہوتا رہتا ہوگا۔'' ماہ نور کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔

''میری ان حرکتوں پر پاپا مجھے بہت ڈانٹا کرتے تھے اور ماما تو بہت زیادہ پریشان ہو جاتی تھیں۔'' ندیم نے مسکرا کر تائید میں سر ہلا کر کہا اور پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب آپ کے والدین بھی آپ کی ان عادتوں کے عادی ہو گئے ہیں۔'' ماہ نور اسے خاموش دیکھ کر یہی سمجھی تھی۔

''اب نہ کوئی ڈانٹنے والا رہا ہے اور نہ ہی کوئی پریشان ہونے والا۔'' ندیم کا لہجہ تاسف آمیز تھا۔

تم سے کیا تعلق ہے میرا

روح میں شامل ہے محبت تیری
کون ہو تم، تم سے کیا تعلق ہے میرا؟
خوب صورت سا ایک احساس ہو
جینے کی امید ہو
تاریکیوں میں اجالے کی طرح ہو
میری ذات کی پہچان ہو
تم ہی میرا سائبان ہو
ہمیشہ اپنے، اپنے لگتے ہو
کون ہو تم، تم سے کیا تعلق ہے میرا
دل میں بستے ہو، ایک دلکش احساس بن کر
براجمان رہتے ہو
ہر پل
ذہن و دل میں
کون ہو تم، تم سے کیا تعلق ہے میرا

شاعرہ: افسانہ آفتاب، کراچی

''کیا آپ کے گھر میں کوئی بھی نہیں ہے؟'' ماہ نور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہیں، کیوں نہیں ماشاء اللہ میرا گھر لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔'' یک دم ہی وہ سرشار سا ہو گیا اور آنکھوں میں چمک لوٹ آئی۔

''اوہ...... اچھا آپ کی فیملی ہوگی۔'' ماہ نور کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی پھیکا سا پڑ گیا۔

''ہاں، میں انہیں اپنی فیملی ہی کی طرح ٹریٹ کرتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' ماہ نور نے چونک کر پوچھا۔

''میرے گھر میں مالی، کک، ڈرائیور، واچ مین اور میڈز رہتے ہیں۔ وہ سب ماما کے زمانے سے ہی ہیں۔ اس لیے میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے وہ لوگ میری فیملی ہی ہوئے ناں۔'' ندیم نے

مسکرا کر کہا۔

''ایک شخص کو سنبھالنے کے لیے اتنے سارے لوگوں کو رکھنا، عجیب سا نہیں ہے؟''

''مجھے اچھا لگتا ہے، میں محبت کو ترسا ہوا شخص ہوں۔ یوں بھی ماما اور پاپا ایک دم ہی مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں غم سے پاگل ہو گیا تھا تب ان ہی لوگوں نے مجھے سنبھالا تھا۔''

''کیا ہوا تھا آپ کے ماما، پاپا کے ساتھ؟'' ماہ نور اس کی باتوں میں اتنی ان والو تھی کہ وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ ولیمے کی تقریب میں آئی تھی۔

''پلین کریش میں وہ ایسے گئے کہ ان کی لاش بھی نہ ملی۔''

''اوہ...... ویری سیڈ۔'' ماہ نور کا لہجہ بھی دکھ سے بھر گیا۔

''خیر جو آیا ہے اسے جانا بھی ہے کہ موت کا ذائقہ تو ہر نفس نے چکھنا ہے، زندگی فانی ہے۔ اب تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔'' ندیم نے گہری سانس لے کر پھیکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ماہ نور چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ندیم اس اثنا میں اپنے موبائل پر آنے والی کالز کے جواب دیتا رہا۔ نئے سوپ کے لیے ہیروئن کی تلاش اس کے لیے اہم مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ آخر پریشان ہو کر اس نے اپنا موبائل ہی آف کر دیا۔

''آپ اپنے ساتھ اپنی مسز کو نہیں لائے؟''

''مسز کا وجود ہوتا تو اسے لاتا۔'' وہ تمسخر بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ دولت مند گھرانوں کے لڑکے تو بیس یا بائیس تک ہی شادی کر لیتے ہیں اور آپ تو......'' ماہ نور نے جملہ پورا کرنے سے قبل اسے دیکھا۔

''ہاں، میں تیس کا ہو رہا ہوں مگر مجھے ابھی تک کوئی ایسی نہیں ملی جس کی محبت میرے دل کو چھو لیتی۔''

''آپ نے ڈھونڈی ہی نہیں ہوگی۔''

''ہاں، یہ بات بھی ہے۔'' اب ندیم نے اپنی گردن صوفے کی پشت سے لگالی۔

''آپ کو کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ مگر مجھ میں یہ خامی بھی تو بہت بڑی ہے......'' ندیم بات کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔

''کیسی خامی؟'' ماہ نور یک دم پریشان ہو گئی۔

''میں تن آسان بھی بہت ہوں۔ یہی چاہتا ہوں کہ میری پسند کی ہر چیز خود...... میرے سامنے آ جائے اور مجھے اس کے لیے کچھ بھی تگ و دو نہ کرنی پڑے۔''

''کیا آپ کے لیے محبت کسی چیز کا درجہ رکھتی ہے؟'' ماہ نور کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔

''نہیں، ایسی بات تو نہیں ہے۔'' وہ اب سیدھا بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دے رہا تھا۔

''تو پھر آپ کے لیے محبت کیا ہے؟'' ماہ نور کا لہجہ شرما سا گیا اور آنکھیں خود ہی اس کے قدموں سے لپٹنے لگیں۔

''محبت زندگی ہے، محبت نور ہے۔ محبت کے آنے سے میری زندگی کی ہر خوشی پُرنور ہو جائے گی۔''

''رئیلی؟''

''ہاں کاش...... جو میرے لیے بنی ہے وہ میرے سامنے آ جائے اور میں اس سے کہوں میں بہت تھک گیا ہوں اب مجھے سنبھال لو، پلیز۔'' ندیم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وثوق بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کا چاہت بھرا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر از خود آ گیا تھا جسے وہ ہولے ہولے بھینچ رہا تھا اور ندیم کی آواز تھی یا اس کی محبت بھری گزارش۔ ماہ نور یک دم شرما سی گئی۔

☆☆☆

شیری آنٹی شوبز سے متعلقہ مہمانوں کا خاص خیال رکھ رہی تھیں اور بار بار اس پورشن میں جا رہی تھیں جہاں فنکار بیٹھے ہوئے تھے۔ فوٹو گرافرز کی بڑی تعداد ان ہی کے کلوز اپ اور گروپس بنانے میں مشغول تھی۔ عام مہمان بھی فنکاروں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور ان سے آٹو گراف لے رہے تھے۔

شیریں آنٹی کی یہ بھرپور خواہش تھی کہ ان کے بھتیجے اور اس کی دلہن کے ساتھ ہر فنکار کی تصویر بنے، جب وہ فوزیہ اور سائرہ کے پاس آئیں تو انہوں نے ادھر اُدھر نظر ڈال کر کھوجتی نظروں سے چاروں طرف ایک نظر ڈالی تو انہیں ماہ نور کہیں بھی نظر نہیں آئی۔

''یہ ماہ نور نظر نہیں آ رہی...... پتا نہیں کہاں جا کر بیٹھ گئی ہے حالانکہ میں نے اسے بتایا بھی تھا اسے کہاں بیٹھنا ہے۔'' اب وہ بڑبڑانے کے انداز میں بول رہی تھیں۔

''آنٹی شاید وہ چلی گئی ہے۔'' سائرہ نے قصداً جھوٹ بولا۔

''نہیں، وہ جانے والی تو نہیں ہے۔ بیٹھی ہوگی کسی کے ساتھ۔'' شیریں آنٹی نے گو مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر اُن کا لہجہ وثوق بھرا تھا۔

اب وہ باری باری فنکاروں کو دلہن کے ساتھ تصویریں بنوانے کے لیے بھیج رہی تھیں اور شوبز کے لوگ ہنستے مسکراتے شیریں آنٹی کی بات کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے خود آگے بڑھ کر دولہا، دلہن کے ساتھ کھڑے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اس ماحول سے بالکل بے نیاز ماہ نور، ندیم کی باتوں پر بے اختیار ہنس رہی تھی اور ندیم سوچ رہا تھا یہ نازک کلی جیسی لڑکی خاموش ہو تو حسین مورت نظر آتی ہے اور جب بولنے لگے تو جلترنگ بجاتی مورت ہو جاتی ہے اور جب ہنسنے لگے تو اس کے سوا کچھ دیکھنے کو بچتا ہی نہیں ہے۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں کیا کہہ رہا تھا اس کے بارے میں اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بس بول رہا تھا کہ اسے بولنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو ختم ہو جائے۔ وہ تو باتوں کے طفیل اس کو خوب کھوج رہا تھا اور اس کی معصومیت، بھولپن اور سادہ لوحی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اس دور میں کیسی شاطر لڑکیاں ہیں کہ اللہ توبہ، کسی سے ذرا سی بات کیا کر لو کان کاٹنے لگتی ہیں۔'' اس نے اپنے دل کی سچی بات آخر کہہ دی۔

''مان لی آپ کی بات کہ آپ سے اب تک جتنی بھی لڑکیاں ٹکرائیں وہ ساری کی ساری چالاک، مکار اور لالچی لڑکیاں تھیں۔''

''ہاں، یہ بات تو سو فی صد درست ہے۔'' وہ بے اختیار اعتراف کر بیٹھا۔

''مگر کوئی تو ایسی ضرور ہوگی جس میں یہ خامیاں نہ ہوں؟'' وہ ہنسی۔

''پتا نہیں۔'' اس کا لہجہ سادگی لیے ہوئے تھا۔

''ناامید مت ہوں ایسی ضرور ہوگی۔'' ماہ نور نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر؟''

''اور اس لڑکی کو اللہ نے صرف آپ کے لیے ہی بنایا ہوگا۔''

''اچھا......!'' اب وہ غیر یقینی انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''سنیں، آپ اپنے دل سے پوچھیں ناں کہ آپ سے بے حد پیار کرنے والی کوئی لڑکی ہے یا نہیں؟'' ماہ نور نے شوخ سے لہجے میں کہا۔

''اے میرے دل ...... یار بتا دے ناں مجھے!'' وہ اپنے سینے سے ٹھوڑی لگا کر آنکھیں بند کر کے بولا اور پھر مسکرایا اور کہا۔ ''ہاں ہے تو ضرور ایسی۔''

''گڈ۔'' ماہ نور ہنسنے لگی۔

"پر ہے کہاں وہ۔ مجھ سے آکر ملتی کیوں نہیں وہ؟" ندیم کسی جلد باز کے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"صبر...... صبر...... ملے گی وہ۔"

"کاش وہ جلدی سے یہاں آجائے اور میرے پاس آکر کہے کہ سنو میں آگئی ہوں۔ تمہارا انتظار ختم ہوا۔" ندیم آنکھیں بند کر کے بولا۔

"تمہارا انتظار ختم ہوا۔" ماہ نور نے آہستگی سے کہا۔

"کیا وہ آگئی، مجھے آواز سنائی دی تھی ابھی؟" ندیم کا لہجہ شوخ سا ہو گیا۔

"وہ ضرور آئے گی آپ کے پاس۔" ماہ نور کا لہجہ اس سے کھویا کھویا سا تھا۔

"پتا نہیں کہاں ہے وہ...... آتی کیوں نہیں، لگتا ہے بڑی نخرے باز سی ہے۔"

"نہیں، نہیں وہ نخرے باز نہیں ہو سکتی۔" وہ پھر ہنسی اور شیریں آنٹی اس کی ہنسی کو پہچان کر مڑ کر اسی کی سمت آگئیں۔

"ارے ندیم، تم یہاں ہو، میں تو تمہیں پیچھے دیکھ رہی تھی۔"

"ہاں فراز صاحب کا فون آیا تھا وہ بتا رہے تھے......"

"جی میری بات ہو چکی ہے ان سے۔"

"مگر آنٹی آپ مجھے پہلے اپنی دلہن سے ملوا دیجیے یہ نہ ہو کہ یہاں سے اسے دیکھے بغیر ہی چلا جاؤں اور کوئی پوچھے تو کچھ بتا ہی نہ سکوں۔"

"ہاں...... ہاں آؤ ناں، میں تو خود ہی یہ چاہ رہی تھی۔" شیریں آنٹی اسے لے کر اسٹیج کی جانب مڑ گئیں اور ماہ نور نے اس بات کا شکر ادا کیا کہ شیریں آنٹی کو دیکھ کر ندیم نے ماہ نور کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا ورنہ یہ شیریں آنٹی بے بات کی بات بنانے میں کسی طرح کم نہیں تھیں۔

ماہ نور اپنے صوفے پر بیٹھی دیکھ رہی تھی ندیم دولہا، دلہن کے ساتھ بیٹھا ایسی تصویریں بنوا رہا تھا جیسے ماڈلنگ کر رہا ہو۔ ماہ نور کی نظر اسی پر جمی ہوئی تھی اور اس کے کانوں میں ندیم کے جملے گونج رہے تھے۔

"دبئی میں چند دکانیں ہیں گولڈ کی۔ صرف اس ماہ میرے دو آئی فون کھوئے ہیں اور وہ دونوں آئی فون 5 تھے۔ پتا نہیں وہ لڑکی کہاں ہے جو میری قسمت کے ساتھ جڑی ہے۔ پتا نہیں، وہ کب آئے گی۔ نخرے باز کہیں کی۔" یہ جملے اس کے ذہن میں بار بار گونج رہے تھے اور وہ ان جملوں کی گونج میں کھوئی ہوئی تھی ... جب ایک مہمان لڑکے نے اس کے پاس آکر پوچھا۔

"معاف کیجیے گا آپ ٹی وی ایکٹریس ماہ نور ہیں ناں، ٹی وی کا نیا چہرہ؟" اور وہ چونک سی گئی۔

"ہاں...... آں...... ہاں۔" بہ مشکل اس کے لبوں سے یہ ٹوٹے پھوٹے لفظ برآمد ہوئے۔

"کیا میں آپ کے پاس چند منٹ بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ لڑکا لجاجت سے لہجے میں بولا۔

"مگر کیوں؟" ماہ نور کی بھویں چڑھ گئیں۔

"آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا سیریل مجھے بہت پسند آیا تھا۔"

"اچھا...... اچھا۔" ماتھے کی تیوریاں کم ہوئیں۔

"آپ میری فیورٹ ایکٹریس ہیں۔" اب وہ اس کے مدِمقابل بیٹھ چکا تھا اور باتیں بنانے کے موڈ میں تھا۔

"شکریہ مگر سوری میں یہاں اپنے فرینڈ کے ساتھ بیٹھی ہوں اور آپ یہاں سے چلے جائیں تو مجھے اچھا لگے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" لڑکا مایوس نظروں سے اسے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ ماہ نور اس وقت تنہائی کی طلب گار تھی اور وہ ان لمحات میں ندیم کے لیے سوچنا چاہتی تھی مگر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کوئی اسے تنہا بیٹھا دیکھنا نہیں چاہتا۔

شیریں آنٹی کی بھاوج غزالہ اپنے بھاری جسم پر غرارہ پہنے بطخ کی طرح بھدر بھدر چلتی ہوئی اس کے پاس آکر رکیں تو کتنی دیر تک اسے دیکھ کر بے وجہ مسکراتی رہیں۔ انہیں اس طرح دیکھتا پا کر وہ جواباً مسکرانے پر مجبور تھی۔

"میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی تھی اور تم یہاں بیٹھی ہو۔"

"جی...... تو پھر؟"

"تمہارے بہت سے فینز تمہارے ساتھ تصویریں بنوانا چاہ رہے ہیں، تم چلو میرے ساتھ۔"

"آپ جائیں میں ابھی آتی ہوں۔" شیریں آنٹی کی بھاوج کو اس کا جواب اچھا نہیں لگا اور وہ منہ بناتی ہوئی چلی گئیں۔

"توبہ ہے اگر ہم فنکار کسی کی تقریب میں چلے جائیں تو میزبان کمیٹی کا ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ ہم صرف پرفارمنس دیتے رہیں۔" اسے شیریں آنٹی کی بھاوج کی باتیں بالکل پسند نہیں آئی تھیں اور جب کوئی بھی اپنی سوچ کے سُر تال کے ساتھ تنہا انجوائے کرنا چاہتا ہے تو اسے کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں آتی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کر بیٹھ گئی کہ پاس آکر بھی کوئی سے پہچان نہ سکے مگر کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا ہولے سے شانہ تھپتھپایا تو وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے سامنے ہنستا مسکراتا ندیم اسے اسی والہانہ انداز سے دیکھے جا رہا تھا۔

"دیکھ آئے دلہن؟" لہجے میں شکوہ سا گھلا ہوا تھا۔

"ہاں۔"

"کیسی لگی؟"

"بہت اچھی ہے مگر آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔"

"سچ؟" بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں۔" وہ مسکرایا۔

"ایمان سے؟" وہ پُرجوش سی تھی۔ ندیم نے تائید میں سر ہلایا اور اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جیسے اس کی بات کی توثیق کر دی ہو۔

"سنیں......" وہ جیسے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"ہوں۔"

"میں آپ سے پہلی بار ملی ہوں۔"

"ہاں۔"

"مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں نہ جانے کب

سے آپ کو جانتی ہوں۔"

"مجھے بھی آج کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ندیم کا لہجہ اور وہ خود کھویا کھویا سا ہی تھا۔

"واقعی؟" ماہ نور کی آنکھوں میں چمک سی بڑھ گئی۔

"ہاں۔" ندیم نے جیسے اقرار کرلیا۔

"میں نے آج کی تقریب میں نہ آنے کی معذرت کوئی پانچ مرتبہ کی ہوگی۔ شیریں آنٹی تو مجھ سے اچھی خاصی ناراض بھی ہوگئی تھیں۔" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

"ایسا ہی کچھ میں نے بھی کیا تھا۔" ندیم نے بھی ہنس کر بتایا۔

"مگر شاید اللہ کو ہمیں ملوانا تھا۔"

"میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہوگا کہ آج مجھے تم مل گئیں۔" اب ماہ نور شرما رہی تھی اور ندیم کی نظریں اسے محبت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھیں چھیڑ رہی تھیں اور شادی لان میں کوئی گلوکار کوئی محبت بھرا گیت گا رہا تھا جسے مہمان تالیوں کی گونج میں سن رہے تھے۔

☆☆☆

کھانے کا وقت ہوا تو قابوں کی ٹھناٹھن کی مخصوص آواز سن کر مہمان کھانے کی جانب دوڑے نہیں بلکہ شیریں آنٹی کو مائیک پر اعلان کرنا پڑا کہ آیئے کھانا تناول فرمائیں۔ تب مہمان دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھانے کی میزوں تک پہنچے۔ کھانا بے حد مزے دار تھا اور متعدد ڈشز موجود تھیں... سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کھایا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔

ماہ نور کی ٹیبل پر ندیم کھانا لے کر آگیا تھا اور چاول کا چمچہ اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں دے کر پوچھ رہا تھا۔

"میں نے اپنے بارے میں الف سے یے تک بتا دیا۔ اب آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔"

"میرا پورا نام ماہ نور ہے۔" وہ ہنسی

"واہ...... ماہ بھی اور نور بھی۔"

"جی۔" وہ پھر ہنسی۔

"ماشاء اللہ چاند بھی اور چاندنی بھی۔" ندیم کا لہجہ سرشار تھا۔

"ہاں، پھول بھی اور خوشبو بھی۔" وہ پھر ہنسی اور یوں لگا جیسے ہنسی کا اس کے لبوں سے کوئی میل ہوگیا ہو۔ کسی کو قریب آتا دیکھ کر ندیم اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہا تھا اور جواباً وہ بھی اس کے کانوں میں فسوں پھونک رہی تھی۔

دور بیٹھے ہوئے لوگ جو اُن کو جانتے نہیں تھے وہ انہیں کوئی نئے دولہا، دلہن سمجھ رہے تھے جو بے وجہ ہنسے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

کھانے کا دور ختم ہوا تو چائے اور کافی کا دور شروع ہوگیا۔ باوردی بیرے گرما گرم کافی کے مگ ان کی ٹیبل پر بھی رکھ گئے۔

"اور کیا مشاغل ہیں تمہارے؟" ندیم نے کافی کا گھونٹ بھر کر اس سے پوچھا۔

"میں پڑھتی ہوں۔"

"کالج میں یا اسکول میں؟" لہجے میں شوخی سے زیادہ شرارت کا عنصر مزین تھا۔

"اسکول میں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"رئیلی اسکول گرل ہو کیا تم؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے ایکٹنگ اسکول میں داخلہ لیا ہے۔"

"اوہ، ابھی اسکول گرل ہو تم۔" وہ سنجیدگی کا چولا پہن کر بولا۔

"جی ہاں۔"

"شناختی کارڈ بنا ہے یا وہ بھی نہیں بنا؟"

"وہ تو خیر بن گیا ہے۔"

"ایکٹنگ اسکول کے بجائے کسی ڈانسنگ اکیڈمی میں داخلہ کیوں نہیں لیا تم نے؟" وہ اب

مشورہ... دینے کے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"مگر میں تو ڈراموں میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ ڈانسنگ سیکھ کر کیا کروں گی۔"

"اب ہمارے ڈراموں میں بھی انڈیا کے ڈراموں کے اثرات بہت آگئے ہیں اور انڈیا کے ڈراموں میں ڈانس ان کا ایک خاص حصہ بن گئے ہیں۔"

"نہیں، ہمارے ڈرامے بھارت کے ڈراموں سے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ یہ ڈانس اور گانے مارننگ شوز کا حصہ بن گئے ہیں صبح کے وقت کوئی بھی چینل لگا لو ہر جگہ شادی کی رسمیں اور ڈانس دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔"

"تم یہ سمجھو کہ اب انڈین سینما ان کے ٹی وی ڈراموں میں آگیا ہے اور ہمارے ہاں بھی یہ سب جلدی نہیں تو بعد میں ہوگا ضرور۔"

"پتا نہیں، جب ہوگا تو میں بھی ڈانس سیکھ لوں گی۔"

"میرے ٹی وی سوپ میں کام کروگی؟"

"آف کورس۔" لہجہ وثوق بھرا تھا۔

"چند دنوں بعد مجھے اپنے سوپ کی لوکیشنز دیکھنے پاکستان ٹور پر جانا ہوگا۔"

"آپ اپنا سوپ ملائشیا، سنگاپور میں جا کر کیوں نہیں بناتے؟"

"کہانی یہاں کی ہے اس لیے باہر نہیں جا سکتے۔"

"میرا دل چاہتا ہے کہ میرا کوئی سوپ لندن، امریکا اور کینیڈا میں شوٹ ہو۔"

"تمہاری ساری خواہشیں پوری ہوں گی۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" ماہ نور نے مسکرا کر اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

☆☆☆

چائے اور کافی کے بعد کچھ لوگ جانا شروع ہوگئے تھے مگر جانے والوں کا انداز ایسا تھا کہ اگر کسی

قطعہ

ایک شبنم تیری پلکوں پہ ہے پھولوں جیسی
ایک تیرا عکس جو آنکھوں میں جگنو جیسا
قتل کردیں نہ فری خود میری سوچیں مجھ کو
میرے ہمراہ بھی تو کوئی ہو ڈھالوں جیسا

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

نے سلام کرنے کے لیے روکا تو وہ ان سے ہی رک کر باتوں میں مصروف ہوتے نظر آرہے تھے۔

"آج کی تقریب اتنی خوب صورت تھی کہ یہاں سے جانے کا بھی دل نہیں چاہ رہا۔" فوزیہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، آج کی شب تو میرے لیے بھی لکی رہی میڈم ثریا نے مجھے اپنے آنے والے سیریل میں لینے کو کہا ہے۔"

"میڈم ثریا تو ایسی باتیں ہر نئی لڑکی سے کرنے کی عادی ہیں۔" فوزیہ کو ہنسی آگئی۔

"بلیو می، انہوں نے واقعی کہا ہے کہ وہ مجھے اپنے نئے آنے والے سیریل میں ہیروئن کاسٹ کریں گی۔"

"پہلی بات یہ ہے کہ میڈم ثریا یہ سیریل نہیں بنا رہی ہیں۔"

"خوامخواہ میں ہی۔"

"یہ بات میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں جانتی ہوں کہ یہ آغا صاحب کا پروجیکٹ ہے۔"

"رئیلی؟"

"ہاں، میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔"

"اُف خدایا...... اتنا جھوٹ۔ میڈم ثریا کو اللہ ہی سمجھے۔" فوزیہ نے غصے سے کہا۔

"شوبز کے لوگ جھوٹ بول' بول کر جھوٹے بہروپ سجا سجا کر جھوٹ بولنے میں ماسٹر ہوجاتے ہیں تب ان کو واقعی پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہے

ہیں۔" سائرہ نے ہنس کر کہا۔
"مگر میں تمہاری رائے سے اس لیے اتفاق نہیں کرسکتی کہ میں تو ایسی نہیں ہوں۔" فوزیہ نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
"جھوٹ تو خیر میں بھی نہیں بولتی۔" سائرہ قصداً ہنس دی۔

☆☆☆

"تم اسے جھوٹ مت سمجھنا۔ میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ کچھ عرصے پہلے میں نے ایسا ہی ایک خواب دیکھا تھا۔" ندیم نے اس کا ہاتھ یوں تھام لیا جیسے کلیاں چن رہا ہو۔
"کیسا خواب؟" ماہ نور نے پوچھا۔
"ایک پری جیسی لڑکی میرے خواب میں آکر مجھ سے بولی۔ ندیم میں تمہارے پاس آگئی ہوں مگر بہت مشکلوں سے آئی ہوں۔"
"بہت مشکلوں سے......" ماہ نور نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں، وہ کوہِ قاف چھوڑ کر جو میرے پاس آئی تھی۔ اس لیے اسے مشکل تو ہوئی ہوگی۔"
"ہاں، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا واقعی آسان نہیں ہوتا۔" ماہ نور اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔
"میں تو اس کی آمد پر ہی حیران ہو رہا تھا۔"
"تو پھر آپ نے اس سے کیا کہا؟" ماہ نور کا لہجہ رازدارانہ سا ہو گیا اور اس نے اپنے کان اس کی جانب لگا دیے۔
"میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔" ندیم نے بے اختیار نازک سی نور کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔
"اور آج آپ کو یہ لگ رہا کہ آپ کو اپنے خواب کی تعبیر مل گی ہے؟" ماہ نور کا لہجہ بھی خواب ناک سا تھا۔
"ہاں، مجھے واقعی ایسا لگ رہا ہے۔ میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔ میری شہزادی، میری پری، میری ہم سفر آج مجھے مل گئی ہے۔" ندیم نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر بے اختیار چوم لیے اور ماہ نور نے سرشار ہو کر اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

میرج گارڈن سے جانے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ شیریں آنٹی سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں رخصت کر رہی تھیں کہ عین اسی وقت جب وہ اپنی قریبی دوست کو چھوڑنے باہر تک آئی تھیں کہ سیاہ مرسیڈیز ان کے قریب رکی اور اس میں سے ان کی دیرینہ دوست اتریں۔ شیریں آنٹی ان کو دیکھ کر محبت سے آگے بڑھیں اور انہیں گلے لگاتے ہوئے بولیں۔
"شمع تم اتنی دیر سے آئی ہو، میں تو نا امید ہو گئی تھی اور دیکھو فراز صاحب پھر بھی نہیں آئے۔ اب تو میں ان سے لازمی لڑوں گی۔"
"ہمارے میاں جی تو بیمار پڑے ہیں گھر میں۔ انہوں نے کہا شمع تم چلی جاؤ اور ہماری سفارش کر دو ورنہ ہماری فنانسر ناراض ہو جائیں گی۔"
"مگر ندیم تو کہہ رہا تھا کہ وہ شوٹنگ میں مصروف ہیں۔" شیریں آنٹی کے لہجے میں حیرت گھلی ہوئی تھی۔
"کیا ندیم آیا ہے یہاں؟" شمع کو استعجاب سا ہوا۔
"ہاں، وہ تو کافی دیر پہلے آگیا تھا۔"
"فراز اگر اس شخص پر ناراض ہوتے ہیں تو غلط نہیں ہوتے۔" شمع کو غصہ ہی آگیا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"آج تو ہمارا پروڈکشن ہاؤس بند ہے اور ندیم تو گھر آیا تھا چھٹی لینے کے لیے کہ اس کی بیوی بیمار ہے اسے لے کر اسپتال جانا ہے۔ اسے یہ چاہیے اور وہ چاہیے۔"
"وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ پروڈکشن ہاؤس سے آرہا

ہے اور فراز صاحب نے اسے یہاں بھیجا ہے۔"
"ہے کہاں وہ جھوٹا؟" شمع نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔
"ابھی تو یہیں تھا۔" شیریں نے ہنس کر کہا۔
"ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا یہ سب سے زیادہ غیر ذمے دار شخص ہے۔ میں تو کئی مرتبہ فراز سے کہہ چکی ہوں کہ اسے نکال باہر کریں۔ وارڈ روب کا انچارج تو کوئی بھی بن سکتا ہے مگر انہیں اس کے حالت پر ترس آتا ہے۔"
"وہ دیکھو وہ بیٹھا وہاں۔" شیریں آنٹی نے اشارہ کیا۔ وہ اس وقت اپنے موبائل سے ماہ نور کی تصویریں بنا رہا تھا اور ماہ نور پوز پہ پوز دیے چلی جا رہی تھی۔
"بڑے جھوٹے ہو تم ندیم۔ ہمارے گھر سے تو یہ کہہ کر چلے تھے کہ سیدھے اسپتال جاؤ گے اور تم یہاں آگئے۔" شمع، شیریں کے ساتھ ہی اس کی ٹیبل پر پہنچ گئیں اور غصے سے بولیں۔ شمع کو یوں اپنے پاس دیکھ کر ندیم یکدم سٹپٹا سا گیا۔
"میڈم...... میں تو بس جا ہی رہا تھا۔" وہ روہانسا سا ہو کر بولا۔
"کب جاؤ گے تم؟ تمہاری بیوی کے دس میسجز آچکے ہیں میرے موبائل پر۔ اپنا موبائل شاید تم نے بند کر رکھا ہے۔"
"میڈم، بس میں نکلنے ہی والا تھا۔"
"فراز نے تمہیں گاڑی اس لیے دی تھی ناں کہ رابعہ کو لے کر فوراً اسپتال پہنچو۔ اس کے پین شروع ہو چکے ہیں۔" شمع کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ماہ نور کو دیکھے بغیر ندیم کلانچیں بھرتا ہوا باہر چلا گیا تھا اور شمع، ماہ نور کی جانب سے پیٹھ کیے شیریں آنٹی سے رازدرانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
"رابعہ کو اپنا الٹرا ساؤنڈ کروانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اگر اس کو معلوم بھی ہو گیا تھا تو اسے ندیم کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اب اگر اس کے دوسری بیٹی ہونے والی ہے تو اس میں بیچاری رابعہ کا کیا قصور ہے۔" ماہ نور کے کانوں میں یہ سب آوازیں آرہی تھیں اور اس کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے اور وہ چپ چاپ ساکت سی اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔
"جب کبھی میں نے اپنے دل کی خوشی کے بارے میں سوچا خوشی مجھ سے روٹھ کر بہت دور چلی گئی اور یہ ندیم کس قدر جھوٹا شخص تھا جو تھوڑی سی دیر میں ہی میرے خوابوں کو تہس نہس کر کے چلا بھی گیا۔"

☆☆☆

شیریں آنٹی بیروں سے گھر والوں کے لیے کھانے کی ٹیبل سیٹ کرنے کا حکم دے رہی تھیں۔
"میں تو گھر سے کھانا کھا کر نکلی تھی۔" شمع نے کہا۔
"مگر میں آپ کا انتظار کر رہی تھی اس لیے میرا ساتھ تو دینا پڑے گا۔"
ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ یہ شادی ہال، یہ چمک دھمک، میوزک سب اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک ریلا ختم ہوتا تو دوسرا آنے کو تیار ہوتا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑبڑائی۔
"جھوٹا، فریبی...... کیسے مجھے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ چہرہ معصوم مگر شیطانی عزائم والا مکروہ شخص...... بے ایمان کہیں کا۔" شیریں آنٹی نے اسے آواز دی تو وہ اپنے آنسو ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے خود سے بولی۔
"ندیم، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔" وہ شیریں آنٹی کے پاس جاتے ہوئے بھی من ہی من میں بڑبڑا رہی تھی۔
"ماہ نور بیٹا تم مسز فراز کو کمپنی دو میں ذرا چند رائٹرز کو خدا حافظ کہہ آؤں۔ آسمانِ ادب کے ستاروں نے آکر آج میری عزت بڑھا دی۔" شیریں آنٹی اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئی تھیں

اور وہ چپ چاپ مسز شمع فراز کے پاس بیٹھی تھی۔ جو سلاد کی پلیٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔

''آپ کھانا لیجیے ناں۔'' ماہ نور نے کہا۔

''میں نے سب چکھ لیا ہے، بہت مزے کی ہے ہر چیز۔ تم پڑھتی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''شکل سے ہی اسٹوڈنٹ لگ رہی ہو۔''

''جی۔''

''شیریں کے ہاں کی ہر تقریب میں نظر آتی ہو کیا ان سے تمہاری رشتے داری ہے؟''

''جی۔'' ماہ نور کو لگ رہا تھا جیسے لفظ جی طویل ترین جواب ہو۔ اس سے اس سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے اور اپنے تکیے میں اپنا منہ چھپا کر دل بھر کر روئے۔ اس طرح تو اسے کسی نے بے وقوف نہیں بنایا تھا۔

''ذلیل، خبیث۔'' وہ پھر دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

''بیٹا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' اس کو یوں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے دیکھ کر شمع نے اس سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' وہ کھسیا سی گئی۔ شیریں آنٹی ٹیبل پر آ کر سوئٹ ڈش نکال کر اس کے لیے لے آئیں تو وہ بہ حالتِ مجبوری کھانے لگی۔ شمع، شیریں آنٹی کی کسی بات پر ہنسیں تو ماہ نور نے دیکھا۔ دولھا، دلہن ایک دوسرے کو کھانا کھلا رہے تھے اور مووی میکر ان لمحات کو قید کر رہے تھے۔

دونوں کا کپل بے حد خوب صورت تھا۔ ماہ نور ان دونوں کو دیکھ کر رشک ہی کر رہی تھی کہ شیریں آنٹی کی آواز سنائی دی۔

''ماہ نور، تمہارے میاں صاحب تمہیں لینے آ گئے ہیں۔'' ماہ نور نے پلٹ کر دیکھا ایک موٹا، کوتاہ قد گنجا عمر رسیدہ شخص ہنستا ہوا اس کی سمت بڑھ رہا ہے۔

''اتنی دیر کر دی آپ نے۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' ماہ نور قصداً مسکرائی اور اس کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ جب تم موبائل کرو گی تب میں گاڑی بھیجوں۔ ڈرائیور سو گیا تھا تو میں خود ہی لینے آ گیا حالانکہ تم نے تو مجھے فون بھی نہیں کیا۔'' اب وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دے کر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ماہ نور نے جاتے جاتے شیریں آنٹی اور شمع کو خدا حافظ کہہ کر ہاتھ ہلایا اور اپنے میاں کے کانوں میں کن من، کن من کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

''کیسا بے جوڑ کپل ہے۔ ایسی پھول سی لڑکی کیسے بے ڈھنگے سے شخص کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے؟'' شمع نے انہیں جاتا ہوا دیکھ کر آہ بھر کر کہا۔

''ارے عمر والا ہے تو کیا ہوا...... بہت پیسے والا ہے۔ ماہ نور نے اس سے اپنی پسند سے شادی کی ہے اور اس کی خاطر اس شخص نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا ہے...اور ان دونوں کا کپل بے حد محبت کرنے والا کپل سمجھا جاتا ہے اور یہ دونوں بڑی محبت بھری اور آئیڈیل زندگی گزار رہے ہیں۔'' شیریں آنٹی نے مسکرا کر بتایا۔

''رئیلی؟'' شمع نے ناک سکوڑ کر پوچھا۔

''ہاں بھئی، ان کی پیار بھری زندگی کی تو لوگ مثالیں دیا کرتے ہیں۔'' شیریں آنٹی نے قہقہہ لگایا۔

اب وہ دونوں ہنستے مسکراتے میرج گارڈن سے باہر نکل گئے تھے۔ ماہ نور اپنے شوہر کا بازو تھامے چل رہی تھی اور اس نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکایا ہوا تھا مگر مسز شمع فراز بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

''مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔''



سالے کی بیوی

شیریں حیدر

''السلام علیکم، کرم بھائی! پلیز مجھے کال کریں، میرے پاس بیلنس نہیں ہے......'' میں نے اسکرین پر جگمگاتا ہوا پیغام دیکھا۔

''سالے کے پاس کبھی بیلنس نہیں ہوتا......''

میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

''دماغ کا بیلنس بھی ختم ہے اس کا تو ویسے۔'' گھنٹی بج رہی تھی۔

''غضب ہو گیا کرم بھائی......'' فون اٹھاتے

ہی اس نے کہا۔ ”میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور آپ کے سوا کوئی مجھے اس سے نکلنے کا طریقہ نہیں بتا سکتا!“ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہاتھ پر مکے مار رہا ہوگا مگر ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ...... ایک ہاتھ میں تو اس نے فون پکڑ رکھا ہوگا۔

”پھر تم بازار میں کسی لڑکی کو چھیڑ کر تھانے پہنچ گئے ہو یا بچیوں کے اسکول میں جا کر جھگڑا کر آئے ہو اس کی استانیوں سے؟“ میں نے چڑ کر کہا۔ تحفے میں ملا ہوا، مسائل کا پلندہ یہ سالا...... بلا کا خود غرض، جذباتی اور تھوڑا بد دماغ بھی...... بیوی کا اکلوتا بھائی، عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا اس لیے شروع سے ہی میں نے اسے اپنے چھوٹے بھائیوں جیسا سمجھا مگر بسا اوقات وہ ایسی بے وقوفیاں کرتا کہ میں سر پیٹ کر رہ جاتا، کسی مصیبت میں گھرنے پر اسے سب سے پہلا خیال میرا ہی آتا۔

ابھی چند دن قبل ہی تو چاند رات پر وہ بازار میں لڑکی کو چھیڑنے پر پٹا اور تھانے بھی پہنچ گیا، بعد ازاں وہ قسمیں بھی کھاتا رہا تھا کہ غلط فہمی ہوئی تھی، وہ اس لڑکی کو اپنی بیوی سمجھا تھا۔ میں تو مان لیتا مگر بھرے بازار میں اس کی بات کون مانتا...... اگلے روز عید تھی اور عافیت اسی میں تھی کہ اسے چھڑوا کر لاتا تاکہ میرے گھر میں بھی عید کے دن شام غریباں نہ ہوتی اور اس کی چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کو عید کے دن ماں کھانا بھی نہ دیتی۔ فرح...... اس کی بیوی، بیس کی دہائی کے اولین سالوں میں تھی، عامر سے شادی کے بعد اوپر تلے کی تین بیٹیوں کے باوجود وہ کمسن سی لگتی تھی، میری بڑی بیٹی جو اب اٹھارہ برس کی ہو رہی تھی، فرح کے ساتھ کھڑی ہوتی تو اس سے بڑی لگتی تھی، فرح کو میں بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا تھا، یوں بھی وہ میری ایک کزن کی بیٹی تھی۔

کرن میری بیوی ہے اور تین بیٹیاں، سارہ، ہاجرہ اور ناعمہ...... ان کی عمریں بالترتیب اٹھارہ، سولہ اور چودہ برس ہیں مگر تینوں ایک برابر لگتی ہیں۔

”اب کیا، کیا ہے پھر تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”فون پر نہیں بتا سکتا، میرا آپ سے ملنا ضروری ہے......“ بے تابی اس کے انداز سے عیاں تھی۔

”شام کو گھر پر آ جاؤ......“ میں نے تجویز دی۔

”شام...... شام میں تو بہت وقت پڑا ہے ابھی نہیں مل سکتے ہم؟“ اس نے کہا۔ ”اور گھر پر نہیں ملنا چاہتا میں آپ سے، کرن آپی کے سامنے!“

”کیا کوئی رقم کی ضرورت ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ارے نہیں کرم بھائی، بہت سنگین معاملہ ہے......“ اس نے کہا تو میرے پورے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔

”حرا اور حنا تو ٹھیک ہیں ناں؟“ میں نے اس کی جڑواں بیٹیوں کے بارے میں پوچھا جو نہایت کمزور سی تھیں اور آئے دن بیمار رہتی تھیں۔

”بات اتنی سی نہیں ہے کرم بھائی!“ گویا اس کی بیٹیوں کی بیماری اس کے لیے معمولی بات تھی۔ ”میں تو بہت خیال کرتا تھا اُن کا اور ان کے لیے پریشان رہتا تھا...... تو کیا، اس کا مطلب ہے کہ اتنا سنگین معاملہ ہے کہ اس کی بیٹیوں کی بیماری اس کے سامنے ہیچ ہے۔

”میں نکلتا ہوں دفتر سے...... تم مجھے ملو!“ میں نے اسے جگہ سمجھا کر میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور اپنے دفتر کے ماتحت کو بلا کر کام سمجھایا۔ اپنے کام کا یہ فائدہ تو ہے کہ انسان چھٹی لینے کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

☆☆☆

جوس کے گلاس کو وہ مسلسل ہاتھوں میں گھما رہا تھا...... ابھی تک ایک گھونٹ نہیں لیا تھا۔

”جوس پیو عامر اور مجھے بتاؤ بیٹا کہ کیا معاملہ ہے......؟“

”میں نے غصے میں فرح کو طلاق دے دی ہے کرم بھائی...... ایک نہیں، تین بار!“ اس نے جوس کا گلاس میز پر رکھا اور اپنے سر کو ہاتھوں سے تھام کر میری طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ کیا بیہودہ مذاق ہے......“ میں نے اس کی بات کو قطعی مذاق سمجھا۔ ”کوئی خواب سنا رہے ہو کیا؟“

”نہیں کرم بھائی، اسی لیے تو فوراً آپ سے ملنا چاہ رہا تھا۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے اور کس طرح بات کروں......“

”کیا وجہ ہو گئی اس حد تک جانے کی؟“

”بس معمولی سی بات تھی، فرح تو آپ کو علم ہے کہ کتنے تحمل والی ہے، کسی بات پر اس نے دلیل دی تو میں قائل ہونے کے بجائے بھڑک اٹھا اور غصے میں...... قطعی غصے میں...... کرم بھائی اسے طلاق کے الفاظ کہہ گیا۔“

”اور وہ بھی ایک نہیں...... تین بار......“ میں نے اسے گھورا۔ ”طلاق تو غصے کی حالت میں ہی دی جاتی ہے بیٹا، کبھی کسی نے کسی کو منہ دکھائی کے تحفے میں بھی طلاق دی ہے؟“

”میں نے تو اس سے کہا تھا کرم بھائی کہ ہم آپس میں بیٹھ کر معاملہ طے کر لیتے ہیں، میں نے سوری بھی کہہ دیا مگر اس پر مولویانی بننے کا ایسا بھوت سوار ہے کہ وہ میری سننے کو تیار ہی نہیں، تب سے اب تک اس نے اپنا کمرا بھی الگ کر لیا ہے اور مجھے معاف کرنے کو تیار ہی نہیں۔“

”کاش میرے بھائی یہ معاملہ اتنا ہی سیدھا ہوتا اور سوری کہنے سے حل ہو جانے والا ہوتا تو کتنے ہی ٹوٹے ہوئے گھر جڑ جاتے...... کاش تم میں عقل ہوتی تو تم اس سے بیٹھ کر معاملات سلجھانے کی بات ہی نہ کرتے...... طلاق کوئی مذاق نہیں عامر...... اور نہ ہی اس کے بعد تم اس سے اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہو کہ وہ تمہیں معاف کر دے اور تم سب کچھ بھول بھال کر پھر اسی طرح رہنا شروع کر دو، تم سے بڑھ کر تو وہ عقلمند ہے......“

”میں تو چاہ رہا تھا کہ آپ اسے سمجھائیں، آپ کو ماموں کہتی ہے اور باپ کی طرح آپ کا احترام کرتی ہے......“ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

”ایک تو بے وقوفی کی حرکت کی اور اب اس سے بڑھ کر بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو تم......“ میں نے اس سے اپنے ہاتھ چھڑائے...... ”کیا تم نے اس مسئلے کی بابت چیک کیا ہے کہ شرعی طور پر اب تم دونوں کے لیے کیا احکامات ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی کرم بھائی، اسی پر تو وہ مجھ سے بات نہیں کرتی، کہتی ہے کہ ہم نامحرم ہو چکے ہیں...... کیسے ہو سکتا ہے یہ، میری بیوی ہے وہ، میں نے محبت کی شادی کی ہے اس سے، آپ کو تو علم ہے ناں کہ کتنی ناک رگڑوا رگڑوا کر اس کے ماں باپ مانے تھے......“ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

”میں کچھ سوچتا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے...... تم تب تک خاموش رہو اور کسی سے بات نہ کرنا، کرن سے بھی نہیں۔“ میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے امید تھی کہ جس طرح کا جلد باز اور جذباتی وہ ہے کوئی گل کھلا بیٹھا ہوگا، کسی کا قتل کر دینے تک کی صورتِ حال کا میں نے اس ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے سوچ لیا تھا...... مگر یہ وہ آخری بات تھی کہ جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور یہ یقین آنے کے بعد کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں...... فرح میرے لیے بیٹی جیسی تھی، میری چچا زاد بہن کی بیٹی، میری اپنی بیٹیوں جیسی...... گاڑی چلاتے ہوئے میرا سارا دھیان اسی طرف تھا، کیا کیا جائے...... سوچ ہی رہا تھا کہ گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆

''عامر نے بتایا آپ کو کہ اس سے کیا بے وقوفی ہوگئی ہے......'' کرن نے رات بستر پر لیٹتے ہی پوچھا تو گویا وہ بہن سے بات کیے بنا رہ نہیں سکا۔

''ہوں!'' میں نے فقط اتنا ہی کہا۔

''اتنی بڑی بات اور بہن سے چھپائی اس نے...... وہ تو میں اس کے گھر نہ جاتی اور اس کی چار سال کی فاطمہ مجھے نہ بتاتی کہ مما اور پپا الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں تو میں کبھی جان نہ پاتی۔ پھر بھی میں سمجھی کہ کوئی جھگڑا ہو گیا ہوگا مگر فرح کی طبیعت کو جانتے ہوئے امید نہیں تھی کہ کوئی جھگڑا ان کے درمیان اس حد تک بڑھ سکتا ہے کہ ان کے کمرے الگ الگ ہو جائیں...... جب فرح سے پوچھا تو......'' عامر نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' اتنی سہولت سے کہہ دیا اس نے کرم جیسے عامر نے اس کو اپنی جائداد دے دی ہو......'' کرن شدتِ جذبات سے رونے لگی۔

''اور کیا کرتی وہ...... کس طرح بتاتی تمہیں؟ تمہارے بھائی کو گالی گلوچ کرتی...... سینہ کوبی شروع کردیتی، بچیوں کے سامنے تماشا کھڑا کردیتی کیا؟'' میں نے دھاڑ کر کرن سے کہا۔ ''شکر کرو اللہ کا کہ اس نے اتنی صابر بچی کو تمہاری بھابی بنایا ورنہ جس طرح کا جذباتی اور جلد باز عامر ہے، اسی طرح کی وہ بھی ہوتی تو پورے خاندان میں تم لوگوں کا تماشا بن چکا ہوتا...... جانتی تو ہو کہ وہ میری چچازاد کی بیٹی ہے اور منتوں سماجتوں سے یہ رشتہ لیا تھا ہم نے، میرا تو ناطقہ خاندان والے بند کر دیں گے...... ہماری بیٹیوں جیسی ہے فرح، تم خود کو اس کی ماں کی جگہ رکھ کر سوچو ذرا......کوئی مذاق ہے کیا!''

''میرا کیا قصور ہے کرم؟'' وہ بھل بھل رونے لگی۔ ''میں تو خود پریشان ہوں، عجیب سی صورتِ حال بن گئی ہے، تین بچیاں ہیں اور خاندان میں بدنامی الگ......''

''تم اگر خاموش ہو جاؤ تو میں کچھ سوچوں'' میرے ڈانٹنے پر وہ کروٹ بدل کر سسکیاں لینے لگی مجھے اندازہ ہوا کہ میں زیادہ غصہ کر گیا تھا، اس کا قصور تھا بھلا...... میں نے اس کے کندھے کو تھپکا کروٹ بدل کے میرا ہاتھ تھام کر زار و قطار رونے لگی۔ ''پریشان نہ ہو، کچھ نہ کچھ حل نکل آئے گا'' میں نے اس سے کہا مگر مجھے احساس تھا کہ میرے الفاظ کسی خالی برتن کی طرح کھوکھلے تھے۔

☆☆☆

''فرح بیٹا......'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم بتاؤ کہ کیا تم چاہتی ہو کہ کوئی صورت نکل جائے کہ تم لوگ پھر اکٹھے رہ سکو؟''

''ہم کس طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں ماموں؟'' سکی۔ ''ذرا سی بات پر عامر نے اپنے اور میرے تعلق کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا، اب ہم ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں کس طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں؟''

''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیا کوئی صورت نکلے تو اس کے ساتھ رہنا چاہو گی؟'' میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

''ماموں، تین بیٹیوں کو لے کر اور کہاں جاؤں گی، امی ابو تو جیتے جی مر جائیں گے، اسی لیے تو میں نے اتنی بڑی بات انہیں بتائی تک نہیں، ابو بھی بیمار رہتے ہیں اور امی دل کی کتنی کمزور ہیں...... آپ نے اپنا بچپن ان کے ساتھ گزارا ہے، آپ سے زیادہ کون جانتا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''واقعی طاہرہ کو علم ہوگا تو وہ نہیں سنبھل پائے گی اس صدمے سے، جو کچھ بھی کرنا ہوگا، انتہائی چھپ چھپا کر اور خفیہ طریقے سے کرنا ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''کیا ہو سکتا ہے ماموں؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''فرح...... حلالہ واحد صورت ہے، دیکھنے ہیں کہ کس طرح اور کس سے ممکن ہے۔'' میں نے کچھ

پوچھتے ہوئے کہا۔
''مگر یوں منصوبہ بنا کر تو حلالہ نہیں کیا جا سکتا.....'' وہ متردد ہوئی۔
''کچھ سوچتے ہیں بیٹا.....'' میں نے بے خیالی میں کہا۔ ''میرا تو اپنا دماغ کام کرنا چھوڑ گیا... اس مسئلے پر۔''

☆☆☆

''کچھ آئی بات اس کی عقل میں یا وہیں کی وہیں سوئی اٹکی ہوئی ہے اس کی؟'' کرن نے چائے پیتے ہوئے سوال کیا، عامر بھی وہیں موجود تھا۔
''سوئی اٹکی ہونے کا کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے کرن کو دیکھا۔
''عامر بتا رہا تھا کہ اس نے اس سے معافی بھی مانگی ہے اور اپنی غلطی پر شرمندہ بھی ہے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے......''
''تمہارا دماغ کیا درست کام کرتا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا، کرن بھی اپنے بھائی کی طرح ہے وہ تو میں نے اس کی ان عادتوں کو اپنے غصے سے لگام ڈال رکھی ہے ورنہ بے وقوفی میں وہ اپنے بھائی سے چار قدم آگے ہی ہوتی۔ ''کیا ہٹ دھرمی کی ہے اس نے بھلا؟''
''یہ جو موڈ بنا رکھا ہے..... کمرا الگ کر لیا ہے، عامر کا کام نہیں کرتی..... اسے صرف کھانا پکا کر دیتی ہے اور وہ بھی اس لیے کہ بچوں کے سامنے اس کا بھرم قائم رہے۔''
''ہوش کے ناخن لو کرن..... وہ اس گھر میں اپنی عدت پوری کر رہی ہے۔ یہ وقت اسے یہ سوچنے کا موقع بھی دے گا کہ وہ آگے کیا چاہتی ہے، اس کے علاوہ وہ اپنے ماں باپ کو فوراً ایسا صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی سو وہ سوچ رہی ہے کہ اگر عامر کو اس کا یہاں رہ کر عدت گزارنا منظور نہیں تو میں فرح سے کہتا ہوں کہ کوئی اور بندوبست کر لے..... بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ اسی گھر میں رہتی، اسے در بدر نہ کیا جاتا، چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ اور پھر یہاں رہتے ہوئے ممکن ہے کہ اس کے دل میں عامر کے لیے نرم گوشہ بیدار ہو جائے...... عامر تو شرمندہ ہے اور معافی بھی مانگتا ہے مگر معافی مانگنے سے طلاق باطل نہیں ہو جاتی......''
''عدت کے بعد کیا کرے گی وہ..... لڑکیاں پیدا کر کر کے اس نے عامر کا گھر بھر دیا ہے..... ایسے میں اگر اس نے بیٹے کی خواہش کا اظہار کر دیا تو کیا قیامت آ گئی تھی کہ اس نے بحث شروع کر دی اور اسے اتنا غصہ دلا دیا کہ اس کے منہ سے غلطی سے طلاق کے الفاظ نکل گئے...... اور عامر کو تو اس بات پر بھی شک ہے کہ اس نے وہ الفاظ تین دفعہ کہے ہوں گے...... اور اس کا ایسا مطلب بھی ہرگز نہیں تھا!''
کرن کے منہ سے وہ بات نکل گئی جس کا ابھی تک مجھے علم نہ تھا، میں عامر سے پوچھ چکا تھا کہ ایسی کون سی بڑی بات ہو گئی تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی تھی۔
''طلاق کا مطلب، طلاق ہی ہوتا ہے کرن، تم بھی عامر کی بے ہودہ باتوں سے متاثر ہو کر اسی کی زبان بولنا شروع ہو گئی ہو...... اور اس نے تین بیٹیاں پیدا کی ہیں تو تم سے زیادہ بیٹیاں نہیں پیدا کر لیں۔'' میں نے لاکھ کوشش کر کے خود کو قابو میں رکھا، فرح کا چہرہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا، معصوم سی بچی اس بے وقوف کے ہاتھوں جانے کیسے کیسے ذلیل ہونے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''تم اپنی بیوی کو طلاق دے چکے ہو، اولاد کی زنجیر بھی ہے، مجھے امید ہے کہ وہ بھی یہی چاہے گی، اس کے لیے وہ کہیں اور شادی کرے، دوسرے شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہو اور پھر وہ شوہر کسی وجہ سے اسے طلاق دے دے، اسے حلالہ کہتے ہیں، اس کے بعد وہ بیوی تم پر حلال ہو جائے گی اور اس سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہو!'' مفتی صاحب نے

ان کے دریافت کرنے پر بڑی وضاحت سے بتایا تھا۔

☆☆☆

''عجیب سی صورتِ حال ہے...... کس سے نکاح کریں اس کا؟'' کرن نے یہ سب سن کر تشویش سے سوال کیا۔ ''جو وہ بدنیت ہو جائے تو کیا ہوگا......''

میری ہنسی نکل گئی۔

''بدنیت......'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''شوہر بیویوں کے ساتھ بدنیتی کا اظہار کیسے کرتے ہیں ویسے بیگم صاحبہ، اگر آپ اس پر روشنی ڈال سکیں تو؟''

''میرا مطلب ہے کہ اتنی پیاری ہے...... جو وہ اسے طلاق ہی نہ دے تو؟'' کرن نے اپنے خدشے کا اظہار کیا، میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''اس کا ایک حل ہے ناں......'' عامر کے ذہن میں کوئی تجویز آ گئی تھی۔

''ہاں، ہاں بولو......'' کرن نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہم اس کے لیے کوئی ایسا بدشکل سا، غصیلا سا آدمی ڈھونڈیں کہ فرح خود ہی اس سے طلاق مانگ لے!'' عامر نے پٹاری کھولی۔

''غصیلے تو تم بھی بہت ہو...... تم سے مانگی طلاق اس نے......؟'' کرن نے غصے سے کہا۔

''مان لو کہ وہ ایسی صابر بندی ہے کہ کسی سے بھی طلاق نہیں مانگے گی۔''

''اب تم دونوں آپس میں لڑنا بند کرو اور اس کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈو......'' میں نے مداخلت کی، اس سے پہلے کہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بھڑ پڑتے۔

''رشتہ؟'' عامر نے میرا منہ دیکھا۔

''جب کسی لڑکی کی شادی کرنی ہو تو اس کے لیے رشتہ ہی دیکھا جاتا ہے......'' دل ہی دل میں اپنے ذہن میں آنے والی اس اصطلاح پر مجھے خود بھی ہنسی آئی مگر میں اپنی ہنسی کو پی گیا، وہ دونوں پہلے ہی کافی تپے بیٹھے تھے۔ جب ''رشتہ'' ڈھونڈنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ جس صورتِ حال میں ہم پھنس چکے تھے وہ دنیا کی سب سے مشکل صورتِ حال تھی۔ عدت کا وقت گزرتا جا رہا تھا اور اس کے بعد فرح اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔

ہماری کاوشیں جاری تھیں کہ مقررہ مدت ختم ہو گئی اور کرن فرح کو اپنے گھر لے آئی، بچیاں تو ممانی کے اس طرح گھر آنے پر خوشی سے بے حال تھیں۔ انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ ماموں ان دنوں دفتر میں بہت مصروف تھے اور رات دیر سے گھر لوٹتے تھے اس لیے فرح کو مما ساتھ لے آئی تھیں کہ بچیاں بھی بیمار رہتی ہیں۔

☆☆☆

''کرم......'' کرن نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے مخاطب کیا، جس کے بعد عموماً کوئی نہ کوئی فرمائش جاری ہوتی تھی۔ ''آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟''

''تین ہزار چار سو پندرہ......'' میں نے کتاب بند کی، عینک اتار کر سرہانے رکھی اور پوری طرح کرن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا تین ہزار چار سو پندرہ؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کلو......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کیا تین ہزار چار سو پندرہ کلو......؟'' اس نے چڑ کر پوچھا۔

''یار اتنے کلو پیار کرتا ہوں میں تم سے!'' میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بڑے وہ ہیں آپ......'' وہ ہنسی۔ ''کیا کر سکتے ہیں آپ میرے لیے؟'' چلو، میں نے دل ہی دل میں سوچا، کوئی قیمتی چیز پسند آ گئی ہے بیگم صاحبہ کو مگر کوئی بات نہیں، اللہ نے ہمیں جیب بھی اتنی بڑی دے رکھی ہے جتنی بڑی بڑی ہماری بیگم صاحبہ اور بیٹیوں کی فرمائشیں ہوتی ہیں۔

''ہوں......'' میں نے شرارت سے کہا۔

''آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں، پلک جھپکتے میں دنیا کے کسی کونے سے جا کر تمہاری پسند کی چیز لا سکتا ہوں، تمہارے پاؤں دبا سکتا ہوں...... سات سمندروں کی تہ سے تمہارے لیے چن چن کر موتی لا سکتا ہوں...... اور...... اور...... بس یار لوڈشیڈنگ کے خاتمے کے علاوہ سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

''پکی بات ہے؟'' اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ جو وہ چاہ رہی ہے وہ اس سے بھی مشکل اور مہنگا سودا ہے......'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھایا، ایک گھونٹ لیا، خود کو دلاسہ دیا، ممکنہ نقصان کا دل ہی دل میں تخمینہ لگایا۔ ''پکی بات ہے...... کبھی کچی بات کی ہے میں نے تم سے؟'' میں نے کہہ کر پانی کا ایک اور بڑا سا گھونٹ لیا۔

''آپ فرح سے شادی کر لیں......'' اتنے زور کا اچھو لگا کہ میں کھانس کھانس کر بے حال ہو گیا، سانس لگا کہ اکھڑ گئی ہو، وہ بھی گھبرا گئی۔

''کیا ہوا کرم......'' وہ میری کمر سہلانے لگی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں......؟''

''میں تو ٹھیک ہوں مگر تمہارا دماغ لگتا ہے کہ خراب ہے......'' سانس بحال ہونے کے بعد میں نے اس سے کہا، اپنی عینک اور کتاب اٹھائی اور بنا کچھ کہے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ وہ میری توقع کے عین مطابق میرے پیچھے پیچھے ہی آ گئی اور لگی معذرتیں کرنے۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں اپنی سوچ پر......'' میں نے بس اتنا کہا اور وہ رونے لگی۔

''میں کب بانٹ سکتی ہوں اپنی محبت کو کرم مگر کیا کروں، مسئلہ ہی ایسا آن پڑا ہے کہ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی......''

''میری بیٹی کے برابر ہے وہ۔''

''بیٹی تو نہیں ہے ناں......'' اس نے دلیل دی۔ ''آپ نے آج تک ہر مسئلے میں عامر کی مدد کی ہے، آپ کو وہ ابو کی طرح سمجھتا ہے اور اسی لیے اس کے ذہن میں یہ تجویز آئی ہے......''

''کیا وہ اپنے ابو سے کہتا کہ وہ اس کی مطلقہ سے شادی کر لیں؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''اس کے سمجھنے سے آپ عامر کے حقیقی ابو بن گئے ہیں نہ آپ کے سمجھنے سے فرح آپ کی بیٹی، آپ سے زیادہ کون اس مسئلے کو سمجھ سکتا ہے، آپ ہماری مجبوری سے واقف ہیں اور پھر یہ تو ایک وقتی رشتہ ہے ناں!'' اس نے میرے گھٹنے پکڑ لیے...... ''پلیز کرم!''

میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ کر منہ دوسری طرف پھیر کر لیٹ گیا، وہ بھی آ کر اپنی طرف آہستگی سے لیٹ گئی۔ اسے علم تھا کہ اس موضوع پر مزید بات کرنا مجھے مزید غصہ دلانے کا باعث ہوگا۔ فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ لیٹ گیا۔

فرح کی تینوں بیٹیاں میرے سینے پر کھیل رہی تھیں، ایک رونے لگی تو فرح لپک کر آئی اور میرے پہلو میں بیٹھ کر بچی کو گود میں اٹھا لیا...... میری آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور تھا، بجلی بند تھی، اٹھ کر بیٹھا تو کرن کمرے میں نہ تھی، میں نے پانی کا پورا گلاس غٹاغٹ چڑھا لیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کمرے سے نکلا تو لاؤنج میں فرح بچیوں کے ساتھ بیٹھی انہیں ناشتا کروا رہی تھی۔

''السلام علیکم ماموں......'' فرح نے کہا تو اس کی نقل میں فاطمہ نے بھی سلام کیا، میں نے نظر چرا کر سلام کا جواب دیا۔

''کرن کہاں ہے؟'' میں نے بات برائے بات کی۔

''آپ کا ناشتا بنا رہی ہیں، میں نے تو کہا کہ ماموں کا ناشتا میں بنا دیتی ہوں، سب کے لیے بنایا ہے مگر وہ کہنے لگیں کہ وہ خود بنائیں گی......''

''ہاں جب ملازم چھٹی پر ہوں تو وہ میرا ناشتا

خود ہی بناتی ہے......'' میں کہہ کر کچن کی طرف بڑھا، سارہ ماں کے ساتھ ہاتھ بٹا رہی تھی۔

''تم کالج نہیں گئیں بیٹا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بس آج دل نہیں چاہ رہا تھا......'' سارہ نے میرا ناشتا کچن میں ہی میز پر لگانا شروع کر دیا۔

''تم نے کر لیا ناشتا؟''

''صرف آپ اور ممارہ گئے ہیں......ہم سب نے تو آج ممانی جان کے ہاتھ کے مزے کے پراٹھے کھائے ہیں......'' سارہ برتن میز پر لگا کر باہر نکل گئی، لاؤنج سے اس کی اور فرح کی ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''سوری کرم......'' کرن نے آہستگی سے کہا۔ ''میں نے بڑے مان سے آپ سے درخواست کی تھی۔''

''کوئی بات نہیں......'' میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''معذرت کرنے کی ضرورت نہیں......''

''میں خود پر زیادہ ہی مان کر گئی تھی کرم...... میں سمجھی میری محبت میں آپ سب کچھ کر لیں گے......میری بات نہیں جھٹلائیں گے......''

''کون سی بات تمہاری جھٹلائی ہے میں نے آج تک کرن......'' میں نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا، تھوڑی دیر رکا...... ''اور یہ بات بھی نہیں جھٹلاؤں گا...... کیونکہ میں تمہیں تین ہزار چار سو پندرہ کلو محبت کرتا ہوں۔''

وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی، اس کی چیخ سن کر فرح اور سارہ بھاگتی ہوئی کچن میں آئیں تو کچن کے اندر کا منظر دیکھ کر شرمندہ ہو کر خود ہی لوٹ گئیں۔

☆☆☆

کورٹ سے میں اور فرح نکلے تو ہم ایک رشتے کی ڈور میں بندھ چکے تھے، سارہ کو اس روز دیر سے آنا تھا، اس نے بتایا کہ اسے کالج کے بعد کسی سہیلی کے ساتھ کہیں جانا تھا، چھوٹی دونوں یوں بھی اکثر کالج سے سیدھی ٹیوشن سینٹر جاتی تھیں اور دیر سے آتی تھیں۔ عامر اس روز کرن کے پاس گھر آ گیا تا کہ بچیوں کو سنبھال سکے۔

''جوس پیو گی فرح؟'' میں نے پوچھا۔

''پی لوں گی ماموں......'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تو ساتھ ہی ہم دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

''ابھی تازہ تازہ نکاح ہوا ہے......'' میں نے اسے ٹوکا۔

''عورتوں کے یوں کہنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا......'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اور یوں بھی عادت تو ہوتے ہوتے ہوگی ناں......'' وہ ہنسی تو میں اسے دیکھنے لگا، اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس کی عادت ہونے تک اسے ایک بار پھر طلاق کا داغ لگ چکا ہوگا، وہ مجھے بہت معصوم اور مظلوم لگی۔

جوس کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا، ہم دونوں نسبتاً اندھیرے میں تھے اور یوں بھی باہر سے آنے والے کو اندر کی روشنی سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے......وہ سارہ کے سوا کوئی نہ تھی، تنگ سی جینز پہنے ہوئے ایک لڑکے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے، ہنستی ہوئی اور ہنس کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر بے حال ہوتے ہوئے......اس سے قبل کہ وہ مجھے اور فرح کو دیکھتی یا فرح اسے، میں نے فرح کا ہاتھ تھاما اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف چلا، کاؤنٹر پر میں نے بل کی رقم سے اضافی رقم رکھی اور بقایا لیے بغیر ہی گاڑی کی طرف بڑھا۔

''کیا بات ہے ماموں؟'' وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟'' وہ سہمی ہوئی تھی۔ میں شرمندہ ہو گیا۔

''سوری...... مجھے کوئی کام یاد آ گیا تھا دفتر کا، تمہیں گھر اتارتا ہوا دفتر جاؤں گا۔'' میں نے اسے صفائی دی جو اسے مطمئن نہیں کر سکی تھی۔

گھر پہنچے تو عامر اور کرن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ''مبارک ہو کرم بھائی!'' عامر کے کہنے پر میں نے اس کا چہرہ دیکھا، اس کے چہرے پر مجھے طنز کی چھاپ دکھائی دی...... ''بدتمیز!'' میں دل ہی دل میں بڑبڑایا، وہ سمجھا ہوگا کہ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے، اس سے اسی کم ظرفی کی امید تھی مجھے۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی کرم......'' کرن نے لگاوٹ سے کہا۔

''کورٹ سے نکل کر جوس کا ایک گلاس پینے کو رک گئے تھے اور وہ بھی پورا نہیں پیا، اگر تمہیں لگتا ہے کہ اتنی بھی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی تو معذرت چاہتا ہوں......'' سارہ کا سارا غصہ ان بہن بھائی پر اتر رہا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو اس فضول سے حلیے والے لڑکے کی وہیں پٹائی کر دیتا مگر میں فرح کے سامنے اپنی بیٹی کے اس راز کو آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''دفتر جا رہا ہوں میں......'' میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔ ''تم رکو گے عامر؟''

''نہیں میں جا رہا تھا کرم بھائی، آپا نے کہا کہ بچیاں ان سے مانوس نہیں ہیں اس لیے فرح کے آنے تک رکوں......'' وہ کرن کو خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی نکلا، فرح اس سے قبل ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

☆☆☆

رات میں اپنے کمرے میں گیا تو کرن کروٹ بدلے لیٹی ہوئی تھی، میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اٹھ بیٹھی...... ''آپ یہاں؟''

''یہ کیا سوال ہے...... میں اور کہاں ہوں گا اس وقت؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو فرح کے پاس جانا چاہیے ناں آج......'' اس نے جس کرب سے یہ کہا ہوگا مجھے اندازہ تھا۔

''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں......'' میں نے بیڈ کے کونے پر ٹکتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بچیوں کی مصروفیات، ان کی دوستیوں کی خبر رکھتی ہو تم؟''

''کیوں، کیا ہو گیا میری بچیوں کو، کسی نے کچھ کہا آپ سے؟'' اس نے ذرا اکھڑ انداز میں پوچھا۔

''کون کہے گا مجھ سے......'' میں نے بھی غصے سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے اسے اور شکر کرتا ہوں کہ فرح کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی...... جوس کی دکان میں وہ ایک فضول سے حلیے والے لڑکے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے......'' میرا چہرہ غصے سے تپنے لگا۔ ''جو میں اکیلا ہوتا تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا......''

میں بات کر رہا تھا کہ وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی...... میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر اس کے تعاقب میں سارہ کے کمرے کی طرف چلا......سب بیڈ روم ایک راہداری میں تھے، انہی میں سے ایک کمرے میں فرح بھی تھی، میں سارہ کے کمرے کے باہر کھڑا تھا، اندر سے دونوں ماں بیٹی کی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔

''کس کم بخت کے ساتھ تم گھومتی پھرتی ہو، گھر میں سہیلیوں کا بہانہ کر کے۔''

''پپا نے بتایا ہوگا آپ کو...... پہلے تو ان سے پوچھیں کہ وہ کہاں تھے......ممانی کے ساتھ کیا رنگ رلیاں منا رہے تھے، گھر سے کیا بہانہ کر کے انہیں ساتھ لے گئے تھے؟'' اس کے الفاظ تھے یا گولیاں جو میرے کانوں کے پاس سے شائیں شائیں کر کے گزر رہی تھیں۔

''بے حیا...... فرشتوں جیسے باپ پر الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی، میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ فرح کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، اس کی طبیعت ناساز تھی......'' کرن کی آواز آئی۔

''ذرا خیال رکھیے گا مما...... ساتھ خود چلی جایا کریں۔''

''بے شرم، بٹی سمجھتے ہیں وہ اسے تم لوگوں کی

طرح اور چلی جاتی ساتھ میں جو اس کی تین بچیاں نہ سنبھالنا ہوتیں......"

"ممانی پیا کی نہیں...... ماموں کی ذمے داری ہیں، بہتر ہے کہ آپ انہیں ان کے گھر بھجوا دیں مما، اس سے پہلے کہ کوئی اور کہانی بن جائے...... اگر ماموں، ممانی کے بیچ کوئی جھگڑا ہے تو صلح صفائی کروا دیں اور انہیں چلتا کریں......" سارہ کی آواز سنائی دی۔

"تم میری توجہ دوسری طرف نہ کرو اور مجھے بتاؤ کہ کس خبیث کے ساتھ گل کھلا رہی ہو، میں تمہارا گھر سے نکلنا بند کر دوں گی......" کرن کا غصہ اپنی حدیں چھونے لگا تو میں واپس کمرے کی طرف آیا اور دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کرن کو آواز دی...... وہ باہر آئی تو اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

"پانی تو لا دو کرن! میں نے دوا کھانی ہے!" میں نے دانستہ بلند آواز میں کہا۔

"جی ابھی لاتی ہوں......" کرن اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

"فرح تم انیکسی میں کیوں نہیں منتقل ہو جاتیں......" چھٹی کا دن تھا اور ناشتے کی میز پر کرن فرح سے کہہ رہی تھی۔ "ایک کمرے میں تین بچیوں کے ساتھ تنگی ہوتی ہوگی۔"

"میں بھی ممانی کے ساتھ انیکسی میں جاؤں گی......" ناعمہ نے فوراً کہا۔ "میں فاطمہ کے ساتھ سوؤں گی۔" ناعمہ کی فاطمہ سے خوب دوستی ہوگئی تھی۔

"بات تو پھر وہی ہوئی ناں......" کرن نے فوراً ٹوکا۔ "میں بچیوں اور فرح کی سہولت کے لیے تو کہہ رہی تھی، شام کو اکٹھے ہی ہوتے ہو ناں تم سب...... رات کو انہیں آرام سے سونے دیا کرو......" کرن نے سرزنش کی۔

"ممانی...... کب تک رہیں گی آپ یہاں؟" سارہ نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"جب تک آپا نہیں جانے دیں گی......" فرح نے شرارت بھرے لہجے میں کہا، وہ سارہ کے لہجے کے طنز کو نہیں سمجھ سکی تھی۔

"بس تم اپنا سامان سمیٹو اور انیکسی میں منتقل ہو جاؤ آج فرح......" کرن نے بات کا رخ بدلا۔

"جس طرح آپ کا حکم......!"

بچیاں ناشتا کر کے اٹھ گئیں، فرح نے برتن سمیٹنا شروع کر دیے، ہم اکیلے ہوئے تو کرن میرا منہ دیکھنے لگی۔ "سارہ بہت گستاخ ہوگئی ہے کرم...... اس روز اس نے آپ کو اور فرح کو جوس کی دکان میں دیکھ لیا تھا، آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔"

"آفرین ہے کرن تم پر بھی...... وہ اپنی بے شرمی پر پردہ ڈالنے کے لیے الٹا باپ کو بدکردار ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے......"

"ایسا تو نہ کہیں...... ایسا کیوں سوچے گی وہ؟"

"وہ سوچے گی کیا، اس نے کہا ہے یہ سب اور میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے...... گھر میں فرح نہ ہوتی تو میں بتاتا اسے کہ ماں باپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی اولادوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے......"

"جوان اولاد ہے کرم...... سرکشی پر اتر آئے گی، میں سمجھاؤں گی اس کو، آپ غصہ نہ کریں۔"

"عامر کے گھر کے مسائل کے حل میں الجھ کر تم نے اپنے گھر کے مسائل پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے تو یہی ہونا تھا، اب تم کس طریقے سے اسے سمجھاؤ گی۔ سختی کرو گی تو وہ بغاوت پر اتر آئے گی......"

"درست کہتے ہیں آپ...... واقعی میں عامر کے مسئلے میں بہت الجھ گئی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس کا مسئلہ حل ہوا...... اب آپ فرح کو طلاق دیں گے تو ہی اصل مسئلہ حل ہوگا ناں......"

"اسے میں ابھی طلاق دے دیتا ہوں......"

"ایسے کیسے طلاق دے سکتے ہیں آپ......"

کرن فوراً بولی۔ "پہلے اس سے شادی کا حق تو ادا کریں۔"

"جو پانچ ہزار روپیہ حق مہر مقرر ہوا تھا وہ میں نے اسے اسی وقت دے دیا تھا......" میں نے کہا۔

"کرم...... آپ میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہیں......" اس نے چڑ کر کہا۔ "میں فرح کو اسی لیے انیکسی میں منتقل کر رہی ہوں...... ممکن ہے کہ کوئی موقع مل جائے ورنہ اس راہداری میں تو فوراً علم ہو جاتا ہے کہ کون کمرے سے نکلا اور کس کمرے میں گیا، ایسی صورت حال میں، جب سارہ پہلے ہی آپ کی طرف سے شک میں ہے میں نہیں چاہتی کہ اسے موقع ملے......"

"میں اس سے چوری چھپے انیکسی میں ملوں کرن...... دماغ چل گیا ہے تمہارا...... کیا وہاں پر سارہ نہیں دیکھ سکتی؟" میں الجھ گیا۔ "اور یوں بھی مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا ہے، میں نے اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی اس کے مسئلے کے حل کے لیے کر تو لی ہے مگر اب میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے...... وہ ابھی تک مجھے ماموں کہتی ہے۔"

"اچھا چلیں تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر سے آپ اس کے ماموں بن جائیں گے......" وہ رکی۔ "ویسے میں سوچ رہی تھی کہ سارہ سمجھدار ہے، اسے میں اس راز میں شریک کر لیتی ہوں یا پھر آپ فرح کو لے کر ایک آدھے دن کے لیے لاہور چلے جائیں......" کرن نے دوسری تجویز دی۔

"دیکھنا پڑے گا کہ اپنے دفتر کی مصروفیت سے وقت نکال سکتا ہوں کہ نہیں...... اور پھر تین بچیوں کے ساتھ لاہور میں کہاں جائیں گے......" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"بچیوں کو میں اور عامر مل کر رکھ لیں گے......" کرن نے بے سوچے سمجھے کہا تھا۔

"اور سارہ کو کیا بتاؤ گی کہ......"

"اوہ ہاں...... ذہن سے نکل ہی گیا، پہلے سارہ سے بات کرتی ہوں یا عامر سے کہتی ہوں کہ آ کر فرح کو لے جائے اور پھر وہاں سے آپ فرح کو ساتھ لے جائیں......" یہ بہتر تجویز تھی، عامر بچیوں کو دو تین دن کے لیے رکھ سکتا تھا...... میں کبھی فرح کو لے کر دوسرے شہر نہ جاتا جو مجھے اس شہر میں دیکھ لیے جانے کا ڈر نہ ہوتا، میں شہر کی ایک جانی پہچانی کاروباری شخصیت تھا اور اس شہر میں کم از کم میں چھپ کر ایک رات بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

☆☆☆

"آپ خود تو بالکل ٹھیک ہیں ناں کرم؟"



کرن کی آواز میں تشویش تھی۔ میں نے لاہور پہنچ کر اسے بتایا تھا کہ لاہور شہر میں داخل ہوتے وقت ایک ٹرالر نے پیچھے سے گاڑی کو ٹکر ماری تھی اور ہمیں ٹیکسی کر کے ہوٹل پہنچنا پڑا تھا، گاڑی مرمت کے لیے ورکشاپ گئی تھی اور اس میں چند روز لگ سکتے تھے۔

''میں فرح کو جہاز پر ایک دو دن میں بھجوا دیتا ہوں......'' میں نے کرن سے کہا، مجھے علم تھا کہ عامر اکیلا بچیوں کو نہیں سنبھال سکتا تھا اور کرن صرف دن کو اس کی مدد کے لیے جاسکتی تھی ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا۔

''ٹھیک ہے......'' کرن نے کہا۔ ''میری فرح سے بات کروائیں!'' میں نے فون فرح کو دیا۔

''جی آپا...... بالکل ٹھیک ہیں ہم دونوں، جی ماموں بھی بالکل ٹھیک ہیں......'' وہ اپنی رو میں کہہ گئی۔ ''بچیوں کو بہت مس کر رہی ہوں......'' اس کی آنکھیں لبریز ہونے لگیں، میں نے اس سے فون لے لیا اور اس کے کندھے پر اسی شفقت سے ہاتھ رکھا جس سے میں ہمیشہ برتاؤ کرتا تھا، وہ پگھل کر میرے بازوؤں میں آ گئی۔

گھر کے محتاط ماحول سے باہر، دوسرا شہر، ہوٹل کا خواب ناک ماحول...... ہر احتیاط پر غالب آ گیا، وہ میری بیوی تھی، نکاح کے بولوں میں بندھی ہوئی اور مجھے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا تھا۔

''واپس بھجوا دوں آج تمہیں فرح......؟'' صبح میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''اکیلی...... میں کبھی گئی نہیں جہاز پر، پہلا سفر...... خوف آتا ہے مجھے......'' کرن نے کال کر کے فرح کا پروگرام پوچھا تھا، میں نے اسے بتایا کہ وہ جہاز کے سفر سے ڈر رہی ہے اس لیے میں اسے بس پر بھجوا دیتا ہوں، عامر وہاں اڈے سے لے لے گا اسے۔

''نہیں نہیں...... جوان جہان ہے، خوب صورت ہے، بس پر اکیلے مت بھیجیں اسے......'' کرن کی ممتا جاگی۔ ''آپ بھی ساتھ آ جائیں...... گاڑی بعد میں آ جائے گی۔''

''کیا بات کر رہی ہو یار، گاڑی چھوڑ کر کیسے آ جاؤں اتنی قیمتی۔''

''تو پھر فرح کو بھی اکیلے مت بھیجیں، کوشش کر کے گاڑی کا کام جلدی کروالیں......'' کرن نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

فرح کو اس دن میں نے عامر کے پاس چھوڑا تھا، جو اسے چند دنوں کے لیے اس کے میکے چھوڑنے چلا گیا تھا اور یوں ہمارے گھر میں گویا سکون آ گیا تھا۔ اس رات...... ہمارے کمرے میں عجیب سی خاموشی تھی، کرن خاموش لبوں سے جانے کیا، کیا سوال کر رہی تھی اور میں جانے کیوں اس سے نظریں چرا رہا تھا...... میرا قرب اسے تسلی نہیں دے رہا تھا، مجھے علم ہے کہ بٹنے سے بڑا دکھ عورت کے لیے کوئی نہیں ہوتا۔

''پلیز کرن...... یوں نہ دیکھو مجھے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''ارے نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... بس کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی......''

''ہوں؟''

''سب ٹھیک تو ہو گیا ناں......'' وہ رکی۔ ''اب وہ عامر کے لیے حلال ہو جائے گی ناں؟'' میں نظر چرا گیا، اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ ''اب کیا دیر ہے طلاق کے لیے......''

''جب تم کہو کرن......'' میں نے کہا۔

''سارے فیصلے تو تم نے ہی کیے ہیں......''

''کل...... کل اسے فون کر کے...... یا کہیں مل لیں اس سے۔''

''وہ اپنے ماں باپ کے گھر پر ہے...... اور پھر اسے تو علم نہیں کہ ہمارا مکمل پلان کیا ہے، اس لیے اسے چند دن سکون سے رہ لینے دو......''

''طلاق کے بعد وہ ہمارے گھر رہے گی کیا؟''

''تو اور کہاں جائے گی، طلاق کے بعد عورتوں کو عدت کا وقت سابقہ شوہر کے گھر پر گزارنے کی اجازت تو ہے ناں...... عامر کے پاس تو نہیں رہ سکتی وہ...... اس کے لیے مکمل نامحرم ہے وہ۔''

''وہ تو طلاق دے کر آپ بھی ہو جائیں گے......'' اس نے فوراً کہا۔

''مگر میرے گھر میں وہ تنہا تو نہیں ہو گی ناں......'' کرن خاموش ہو گئی، جو چند دن اسے انتظار کرنا تھا وہ تو اسے کرنا ہی تھا...... مگر فرح کی امی کا فون آیا کہ اسے فوڈ پوائزننگ ہو گئی تھی اور وہ اسپتال میں تھی، شام کو ہم اسے اسپتال دیکھنے گئے تو وہ پیلی زرد ہو رہی تھی...... اس کی امی نے بتایا کہ اسے دو تین دن اسپتال میں رکھیں گے۔

اسپتال سے لوٹی تو عامر اسے اس کی امی کے گھر سے لے کر ہمارے گھر چھوڑ گیا، وہ انیکسی میں اپنے بچوں کے ساتھ منتقل ہو چکی تھی، اس کا چہرہ دیکھ کر میرا دل چاہا کہ اس کی خیریت پوچھنے کے لیے انیکسی میں جاؤں مگر اپنے بچوں اور کرن کی وجہ سے اپنے ارادوں پر بند باندھ کر رہ گیا۔

''مجھے اکیلے میں کہیں ملیں......'' رات ایک بجے اس کا پیغام آیا تو میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور انیکسی میں جا پہنچا۔

☆☆☆

''مگر یہ تو ہمارے پلان کا حصہ نہیں تھا......'' میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا، کرن کو علم ہو گا تو وہ مجھے ملامت کرے گی کہ میں نے اتنی بے احتیاطی کیوں کی۔ میں تو دو ایک دن میں تمہیں طلاق......'' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا آپ نے عامر اور آپا کے ساتھ مل کر حلالہ کا منصوبہ بنایا تھا......؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''جو بھی ہے فرح...... اس سے نجات تو حاصل کرنا ہو گی تمہیں......'' میں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ ''یہ غلط ہو گیا ہے......''

''اس طرح نہ کہیں کرم خدا کے لیے......'' اس نے پہلی بار میرا نام لیا تھا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''دیکھو فرح...... منصوبہ جو بھی تھا، یہ دو گھروں کی بربادی ہے، کرن اپ سیٹ ہو جائے گی جب اسے علم ہو گا کہ مجھ سے اتنی بڑی بھول ہو گئی ہے......''

''یوں بات نہ کریں کرم...... یہ ہماری جائز اولاد ہے......'' وہ سسکی۔ ''ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

''میں اپنی بیٹیوں کو منہ نہیں دکھا سکتا فرح...... پلیز، اسے ختم کر دو۔''

''میں صرف اس لیے قتل نہیں کر سکتی کرم کہ آپ اپنی بیٹیوں کو منہ نہیں دکھا سکتے...... قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے آپ......'' اس کے آنسوؤں کے دھارے میں میں اس طرح بہہ گیا کہ ہم دونوں کو خبر نہ ہوئی کہ کب کرن میرا تعاقب کرتی ہوئی وہاں آئی اور ہمیں اس حال میں دیکھ کر لوٹ گئی۔

''اس طرح پلان کر کے حلالہ کروانے والے کو سوٗر سے تشبیہ دی گئی ہے کرم...... بہت بڑا گناہ ہے یہ، پلیز خود کو اس طرح اللہ کی نظر سے نہ گرائیں، اس گھٹیا منصوبے کا حصہ نہ بنیں...... مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دیں، عامر کی بچیاں پل جائیں گی، مجھے ایک بار پھر طلاق کا داغ نہ دیں۔''

''میں نے کرن اور عامر سے وعدہ کیا ہوا ہے فرح......''

''تو پھر میری ایک بات سن لیں کرم...... اگر آپ نے مجھے طلاق دی تو میں عامر سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے...... اٹل فیصلہ!''

''میں اپنی بیٹیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟'' میں خود کو بے بس اور ایک شکنجے میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

''میں بات کروں گی آپ کی بیٹیوں سے......''

☆☆☆

"پپا مجھے آپ سے بات کرنا تھی......" میں لاؤنج میں بیٹھا تھا جب سارہ میرے لیے چائے کا کپ لے کر آئی اور میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"جی بیٹا......!" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، میں سمجھا کہ اسے کوئی رقم چاہیے ہوگی یا کالج کا ٹرپ کہیں جا رہا ہوگا اور اسے اجازت چاہیے ہوگی۔

"پپا...... آپ یہ زیادتی ہرگز نہ کریں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا، وہ مجھے اپنی عمر سے کئی برس بڑی دکھائی دی۔

"کیا زیادتی......؟" شاید وہ اس بہی سے لڑکے کے بارے میں میرے خیالات سے آگاہ ہو گئی تھی۔

"آپ ممانی کو طلاق نہیں دیں گے پپا......" اس نے کہا اور ذرا سا رکی۔ "مجھے ممانی نے بتایا ہے پپا اور یہ بہت بڑا گناہ ہے، آپ ماموں اور مما کے بنائے ہوئے منصوبے کا حصہ بن کر کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں؟"

"میں واقعی بے وقوفی کر بیٹھا ہوں بیٹا اور اب سمجھ نہیں پا رہا کہ کس طرح اس صورتِ حال سے نکلوں؟" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پپا، مجھے ممانی نے سب کچھ بتا دیا ہے، شک تو مجھے پہلے بھی تھا۔ ممانی اتنی سمجھدار اور صابر عورت ہیں پپا...... انہیں مزید دکھ نہ دیں آپ...... یوں بھی وہ جس حالت میں ہیں......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہاری مما کس قدر ناراض ہیں مجھ سے۔"

"وہ بھی سمجھ جائیں گی پپا، میں بھی ان سے بات کروں گی اور انہیں سمجھنا ہی ہوگا کہ زندگی کوئی تھیٹر نہیں جہاں وہ کٹھ پتلیوں کا سارا کھیل ترتیب دے کر، اپنے ہاتھوں میں ڈوریاں تھام کر سب کی حرکات کو کنٹرول کریں گی۔"

"میں واقعی بہت شرمندہ ہوں بیٹا...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری بیٹی اتنی سمجھدار ہو گئی ہے......" میں نے اسے ساتھ لگا لیا۔

☆☆☆

فرح کے ہاں ہمارے بیٹے کی ولادت نے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، بچیاں تو اس ننھے سے کھلونے کو پا کر بہت خوش تھیں...... کرن مجھ سے ایسی اکھڑی تھی کہ کوئی معافی تلافی کام نہیں آ رہی تھی۔ سارہ نے اسے بہت سمجھایا تھا مگر وہ اپنے موقف پر قائم تھی۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ جو بھی اس سے شادی کرے گا اس کی نیت خراب ہو جائے گی......" وہ ہمیشہ یہی بات کہتی۔

عامر بھی ناراض ہو گیا مگر فرح نے کرن کو صاف صاف کہہ دیا کہ چاہے کرم اسے طلاق دلا دیں مگر وہ عامر سے شادی پھر بھی نہیں کرے گی۔ اس کے بعد عامر اور کرن کو ٹکا سا جواب مل گیا تھا۔

میں دونوں کے بیچ توازن قائم کرنے کی کوششوں میں نڈھال ہوا جا رہا ہوں مگر فرح کی خوب صورتی اور مزاج کی خوبی اس کا پلڑا دانستہ بھاری کر دیتی ہے اور پھر اس نے مجھے اس عمر میں بیٹے کا تحفہ دیا ہے جو اس کی قدر بڑھا گیا ہے۔

فرح کی رفاقت نے میری بیٹی کو ہیرے کی طرح تراش دیا ہے اور ہم نے اس کا رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔ عامر اپنی جلد باز طبیعت کے ہاتھوں تہی دامن ہو گیا ہے، کرن اپنے بھائی کے لیے رشتے تلاش کرتی پھر رہی ہے اور اس کے نصیب کی خوشیاں فرح کے روپ میں میری جھولی میں آن گری ہیں...... میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑے گناہ کا حصہ بننے سے بچا لیا ہے۔



اب محبت کرنی ہے

عالیہ حرا

ناولٹ

اوائل سردیوں کے دن تھے، موسم میں قدرے خنکی تھی۔ اپنے گھر کی بالکونی میں ڈاکٹر شہریار احمد اپنے ہونہار بیٹے خرم شہریار احمد کے ساتھ کھڑے تھے۔ آج بڑے دنوں بعد ڈاکٹر شہریار کو قدرے فرصت کے لمحات میسر تھے۔ جب وہ ان کے پاس آیا تو ڈاکٹر صاحب بالکونی میں کھڑے چائے پی رہے تھے۔ انہیں اسی کا انتظار تھا کافی دنوں سے اور وہ اپنا کلینک اسٹیبلش کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ ایک

کامیاب ماہرِ نفسیات تھا۔

"پاپا، ماما کب تک آئیں گی؟" اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے باپ سے پوچھا۔

"اچھا... بابا بچے بن رہے ہو..." وہ مسکرائے۔

"پورا گھر سونا پڑا ہوا ہے، شادی کو ختم ہوئے بھی ہفتہ ہوگیا ہے، انہیں گھر یاد ہی نہیں آرہا۔"

"یار... بور ہورہے ہو، میں بھی تو ہوں ناں!"

"پاپا..." وہ ہنس دیا۔

تبھی وہ چونک گئے۔ دور سامنے سے وہ لڑکی چلی آرہی تھی جس کی خاطر وہ خاصی دیر سے اِدھر کھڑے تھے۔ انہوں نے دُزدیدہ نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا اس کی توجہ سامنے والے گھر کی جانب تھی جہاں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے... یا پھر نیچے لان میں سرسری نگاہ ڈال لیتا جہاں مالی پودوں کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھا... مگر... اس لڑکی پر نگاہ صرف انہی کی تھی۔

حسبِ معمول سیاہ سوٹ، شانوں پر اڑتا ہوا دوپٹا، سینے پر بندھے ہاتھ، بال کیچر میں ہونے کے باوجود کچھ کچھ آزاد شانوں پر بکھرے تھے۔ اردگرد سے بے خبر وہ دھیرے دھیرے چلتی قریب آرہی تھی۔

ڈاکٹر شہریار نے خرم کی جانب دیکھا پھر ایک سرسری سی نگاہ رخ موڑ کر لڑکی پر ڈالی تھی۔ اب وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے قدرے آگے کو جھکا... بچوں کی ہی جانب متوجہ تھا۔

"علینہ کو بھی احساس نہیں ہے کہ واپس آجائے۔"

"خرم... اس لڑکی کو غور سے دیکھو۔" انہوں نے بیٹے کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

"کس کو پاپا...؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"وہ جو سامنے سے آرہی ہے، بلیک کپڑوں میں..." خرم پاپا کے اشارے پر اس جانب دیکھنے لگا۔ لڑکی قدرے قریب آگئی تھی۔ اچھی خوش شکل، درمیانے قد کی تنہا، اکیلی لڑکی چلی آرہی تھی۔

"پاپا...! اگر میرے لیے ہے تو... ویری بیڈ شرم کریں اور اگر آپ کے لیے تو ویری سیڈ... اس عمر میں ماما کی غیر موجودگی میں... میں تو یہ سب کرتا اچھا لگوں گا مگر آپ... چہ... چہ۔" خرم کے چہرے پر شرارت تھی۔

"اُف... ماما کو معلوم ہوگا تو... کیا ہوگا؟" وہ مصنوعی خفگی دکھانے لگا۔

"خرم...!" ڈاکٹر شہریار کے انداز میں خفگی تھی۔

"خرم اس لڑکی کو غور سے دیکھو..." انہوں نے اس کا کان پکڑ کر کہا۔

"پا... پاپا فضہ بھی مارے گی۔"

"اور مجھے بتاؤ تم نے اس میں کیا دیکھا؟" ڈاکٹر شہریار احمد آنے والے رستے کو دیکھ رہے تھے لڑکی قدرے قریب آگئی تھی۔ دبیز سنجیدگی اس کے چہرے پر تھی اردگرد سے بے خبر... بس چلتی جارہی تھی گویا چلتے رہنا ہی اس کا کام تھا۔ تبھی سامنے گھر کا مرکزی پھاٹک کھول کر بارہ سالہ اسامہ اپنی سائیکل چلاتا ہوا باہر نکلا چونکہ وہ تیزی سے آرہا تھا سیدھا لڑکی سے جاٹکرایا۔ لڑکی لڑکھڑا گئی

"سوری... سوری آنٹی... وہ میں دراصل۔"

لڑکی نے ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی۔

"آئی ایم سوری... میرا بھائی میرے پیچھے آرہا تھا وہ..." سر کھجاتے ہوئے اسامہ خفت زدہ تھا۔ لڑکی مزید بات سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔

"اس کے تاثرات، اس کا انداز غور سے دیکھو۔" ڈاکٹر شہریار، خرم کے قریب ہوتے ہوئے بولے۔

"پا... پاپا... شیم شیم، اپنے شریف بیٹے کو برائی کے لیے اکسا رہے ہیں۔ ماما کی تربیت پر پانی پھر جائے گا۔" کان سہلاتے ہوئے خرم لڑکی کی جانب متوجہ ہوا جو اُن کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اور اب چند لمحوں میں ان کے گھر کے آگے سے گزر جاتی۔

"اس موضوع پر ہم تفصیل سے بات کریں گے۔"

"موضوع...؟" خرم چونکا۔

اردگرد سے بے خبر لڑکی اب ان کے گھر کے قریب سے گزر رہی تھی سر جھکائے، ہونٹ کاٹتی... برابر والوں کے گھر کے آگے گاڑی دُھل رہی تھی۔ زمین پر پانی تھا۔ اس پانی میں پاؤں رکھتی، آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک پلو دوپٹے کا قدرے لمبا تھا جو زمین کی سطح کو چھو رہا تھا۔ آگے بڑھتی لڑکی پام کے بڑے سے پودے کی آڑ میں ہوئی۔ سفیدے اور کھجور کے درختوں کے درمیان چھپی... گھنیرے برگد کی اوٹ میں ہوئی۔

خرم اچک اچک کر تاحدِ نگاہ اسے دیکھتا رہا۔

"بس برخوردار... وہ جاچکی ہے۔" انہوں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کیا۔

"پاپا میں نے ٹھیک سے دیکھا ہی نہیں۔"

"جتنا دیکھ لیا ہے بولو اتنا بھی کیا دیکھا؟" وہ ٹیرس پر رکھی کرسیوں کی جانب بڑھے۔

"پاپا... یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ کس نظر سے دیکھنا تھا۔" وہ لب دبا کر ہنسا۔

"میں سیریس ہوں۔"

"پاپا...!" وہ حواس باختگی سے اُن کی جانب بڑھا۔

"نہیں... نہیں پاپا... ایسا مت کریں، لوگ ہنسیں گے ماما... کا کیا ہوگا... ان کے جسٹس بھائی، جج بہن... ڈی ایس پی ماموں، آپ کا مستقبل پاپا، میری شادی... نہیں پاپا نہیں ایسا مت کریں۔" دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں جوڑ کر وہ مسخرے پن سے ان کی جانب بڑھا۔ ڈاکٹر شہریار احمد کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"لگتا ہے تمہاری ماں کی غیر موجودگی نے دماغ پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ انہیں بلوانا پڑے گا... تم بیٹھو..." انہوں نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور خود ٹہلنے لگے۔

"لڑکی کی عمر چھوٹی ہے، آپ کی عمر..."

"ہا... ہا... ہا... یعنی تھوڑی سی عمر زیادہ ہو تو میں شادی کرسکتا ہوں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" وہ سنبھلا۔

"میں تو بک ہوں پاپا... علینہ جان سے مار دے گی، عمرا بھی کرے گا نہیں، پھر... پھر کس کے لیے؟" اس نے اردگرد نگاہ کی۔ "پاپا چائے کی طلب ہورہی ہے، آپ پئیں گے؟"

"منگوالو۔"

"کچھ اور...؟" وہ اٹھ کر ریلنگ کی جانب بڑھا۔

"جو دل چاہ رہا ہے۔"

"اکرم، اکرم!" اس نے نیچے کی جانب جھک کر آواز دی۔

"چائے کے ساتھ فریج میں جو کچھ بھی ہے لے آؤ۔" پھر اُن کے سامنے آبیٹھا۔

"میں اس لڑکی کو پچھلے پانچ دن سے واچ کررہا ہوں۔"

"ماما کو بلوا لیتے ہیں پاپا۔" اس نے ان کی بات کاٹی۔

"یعنی کہ تم اپنے پروفیشن میں سنجیدہ نہیں ہو۔"

"میں...! اس میں میرا شعبہ کہاں سے آگیا، پسند آپ کی... معیار آپ کا... انتخاب آپ کا... سزا آپ ہی کو ملے گی۔ میں کہاں...؟"

"تم سنجیدہ نہیں ہو...؟"

"کس بارے میں پاپا...؟" اس نے معصومیت سے سر اٹھایا

"اُف... میں زندگی میں فیرنیس کا قائل ہوں، گو کے میرے کیریئر کا اسٹارٹ ہے مگر میں مستقل مزاج رہنا چاہتا ہوں، مجھے علینہ پسند ہے، اب کوئی اور نہیں..."

"خرم... بس بہت ہوگیا... تم اس لڑکی کو دیکھو میں، پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں، اس موضوع پر میں تم سے بھی بعد میں بات کروں گا اور اسے محض دل پھینک لڑکے کی نظر سے مت دیکھنا۔"

ان کی جیب میں پڑا موبائل بجنے لگا تھا تو وہ اس طرف متوجہ ہوگئے۔ ماحول میں سناٹا چھا گیا اور حقیقت میں خرم، پاپا کی بات پر غور کرنے لگا۔

''پاپا اسی لڑکی میں اتنا انٹرسٹڈ کیوں ہیں؟ کیا خاص بات ہے جو اتنا اصرار......'' پاپا کی سوچ نے اسے بھی سوچنے پر مجبور کردیا۔

☆☆☆

اگلے دن سرِ شام ہی خرم ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سردی کو وہ انجوائے کررہا تھا۔ اسے کلینک جانا تھا لیکن پاپا کا اصرار تھا کہ اس لڑکی کو واچ کرنا ہے تو ضرور کوئی خاص وجہ ہوگی سو اس نے ڈاکٹر فہد کو بتادیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گا۔ وہ اب انتظار کررہا تھا تا دیر وہ لڑکی آ نہیں جاتی اور وہ آگئی...... ہلکے ہلکے آتی چلی گئی۔

بلیک سوٹ...... آدھے کھلے آدھے بندھے بال، سینے پر بندھے بازو اردگرد سے بے نیاز، بے فکر، دھیرے دھیرے چلتی گھر کے آگے سے گزر گئی۔ اس کا پلو زمین کی سطح کو چھو رہا تھا اسے پروا نہیں تھی۔ آگے جا کر پام، سفیدے اور پھر برگد کے گھنے درخت کے پیچھے گم ہوگئی۔

خرم کھڑا اسے دیکھتا...... اور سوچتا رہا...... پاپا کی توجیہہ اسے سمجھ نہیں آئی...... بس وہ ایک لڑکی تھی۔ دبلی، پتلی، کھلتی ہوئی گندمی رنگت والی...... اور...... پاپا......؟

☆☆☆

اگلے دن پاپا نہیں آئے وہ سرِ شام سے کھڑا تھا۔

''کدھر ہو......؟'' پاپا کا فون آگیا۔

''پاپا...... ریلنگ کے ساتھ کھڑا...... آپ کی منتخب کی ہوئی لڑکی پر ڈورے ڈالنے کے لیے پر تول رہا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''ارے، ایسی کوئی حماقت مت کرنا۔''

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکا۔

''صرف واچ کرو...... اس کا احساس کرو، اسے محسوس کرو۔'' ڈاکٹر شہریار احمد نے برجستگی سے کہا۔

''اسے تنگ بالکل مت کرنا۔''

''لاحول ولا قوۃ...... آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں، ماما، علینہ نہیں ہیں گھر میں تو کیا ہوا...... کریم، رحیمن بوا، چوکیدار تو ہیں ناں......''

''لاحول ولا قوۃ......'' اب کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ خرم زبان دبا کر ہنسا۔

''پاپا آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ تنگ مت کرنا۔''

''ہاں...... اسے مت چھیڑنا...... میرا مطلب تھا۔''

''لاحول ولا قوۃ...... پاپا میں کوئی لچا لفنگا ہوں۔'' اسے پاپا کو ستانے میں لطف آتا تھا۔

''اس سے بات مت کرنا......''

''پاپا کیا کہہ رہے ہیں؟ سارے محلے والے جاگ رہے ہیں میں کیسے بات کرسکتا ہوں۔''

''اسے صرف محسوس کرو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''محسوس کرو۔'' جانے والے راستے کو دیکھتے ہوئے وہ پاپا کی بات پر غور کرنے لگا۔ اب وہ لڑکی گھر کے آگے سے گزر رہی تھی۔ وہی انداز، وہی چال ڈھال، آج کپڑوں کا رنگ وائٹ تھا۔ خاموشی سے چلتے ہوئے اردگرد سے بے نیاز آگے جا کر مڑ گئی۔

''کیا، دیکھوں، کیا نوٹ کروں، پاپا بھی بس ناں۔'' وہ نیچے اترنے لگا۔

''تم نے کیا نوٹ کیا، کیا محسوس کیا اس لڑکی کے متعلق؟'' رات پاپا ڈائننگ ٹیبل پر پوچھ رہے تھے۔

''پاپا کچھ خاص نہیں...... اس میں نوٹ کرنے والی کوئی خاص بات نہیں ہے، آپ بھی ٹائم برباد کررہے ہیں۔''

''تم نے میری بات کو سیریس نہیں لیا۔''

''پاپا...... ماما نہیں ہیں اور مجھے یہ نان سیریس ٹاپک لگتا ہے اور پھر ماما آجائیں گی۔''

''تم ایک ماہرِ نفسیات ہو...... شہر کے بارونق

علاقے میں تمہارا کلینک ہے اور یہ تمہارا شوق ہے......'' ڈاکٹر شہریار احمد نے سلاد سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

''آف کورس پاپا...... یہ بتانے والی بات نہیں ہے، میرا فیوچر ہے یہ۔''

''میں نے اس لڑکی کو بہت اچھی طرح سے واچ کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ اب تم اس لڑکی کو واچ کرو۔''

''پاپا......'' خرم منمنایا۔

''یہ ضروری نہیں ہے جس نظر سے آپ دیکھ رہے ہیں اس نظر سے میں بھی دیکھوں۔''

''یہ ضروری ہے، ہم دونوں کی فیلڈ ایک ہے اور ہم دونوں ہی مسیحا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی کی مسیحائی کرو۔''

''مسیحائی...... اور میں......؟ پاپا آپ بھی ناں......؟'' خرم گڑبڑا گیا۔

''ہاں مسیحائی...... اور تم...... خرم...... تم......''

''پاپا میرا کلینک ہے، وہاں مریض خود آتے ہیں، میں کھینچ کر نہیں لے جاتا...... میں اس لڑکی کو کیسے کھینچ کر لے جاسکتا ہوں اور کیوں...... وہ کیا بیمار ہوگی۔''

''انسان ہے کوئی نہ کوئی فکر، کوئی پرابلم یا کوئی پریشانی ہوگی اسے۔'' پاپا کی منطق ہی نرالی لگ رہی تھی۔

''ماما کب تک آئیں گی تاکہ آپ کا دھیان بٹے۔'' وہ کہتے ہوئے اپنا کھانا ختم کرکے نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔

''ابھی تمہاری ماں کے آنے کے کوئی آثار نہیں ہیں، اگلے ہفتے ایک اور شادی نکل آئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے۔

اگلے دن پاپا اس سے لڑکی کی رپورٹ لے رہے تھے۔

''پاپا آج وہ آئی ہی نہیں......'' اس نے سوچا ہوا جواب دیا۔

''آئی تھی، تم نہیں آئے تھے۔''

''جی......'' اتنا سچ پاپا کو کیسے پتا چلا۔

''میں اسپتال سے گھر آیا تھا۔ وہ لڑکی گزر رہی تھی اور تم بالکونی سے غائب تھے۔''

''وہ...... پاپا......'' خرم خفت زدہ ہوتے ہوئے سر کھجانے لگا۔

''آپ کیوں اس میں اتنا انٹرسٹ لے رہے ہیں۔'' اس نے اپنی خجالت چھپائی۔

''اس لیے کہ......'' ڈاکٹر شہریار احمد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ''اسے مسیحا کی، رہنما کی، ہمدرد کی ضرورت ہے خرم۔'' وہ چونک گیا۔ ''وہ ایک مریض ہے، ایسی مریض جسے اپنے مرض کا نہیں پتا...... اپنی تکلیف کا اندازہ نہیں ہے، اس پر بے حسی طاری ہوگئی ہے۔ اور میں...... تم...... اک ڈاکٹر ایک مسیحا اور مسیحا کا کام بے لوث ہونا چاہیے اگر چار مریضوں سے فیس لیتے ہیں تو پانچواں مریض ہمیں بغیر فیس کے لینا چاہیے خرم...... کچھ زادِ راہ بھی تو ہو یار...... بس دنیا داری میں لگے رہیں۔'' اتنی سنجیدہ اور گہری بات...... خرم کا سر جھک گیا۔

''پاپا اگر وہ مریض نہ ہوئی تو......'' اس نے سر اٹھایا۔

''وہ مریض ہے...... میں کہہ رہا ہوں، فیصلہ تم کروگے فیس لو یا نہیں لو۔''

''پاپا......'' اس نے سر کھجایا۔ ''ایک مشکل کیس ہے۔''

''مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں، دلچسپ بھی ہوگا اگر دلچسپی لوگے تو یہ ضروری نہیں ہے بیٹا کہ مریض کلینک ہی میں آئے تو علاج ہو، کچھ لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ مریض ہیں، بیمار ہیں، ہمیں ان کا بھی علاج کرنا چاہیے، بے لوث ہوکر۔ یہ زندگی ہے بیٹا...... اور یہ کردار ہمیں آگہی دیتے ہیں اور آگہی ادراک سے مشروط ہے۔ تم اس مسئلے کو حل کر لینا، دیکھنا تمہیں کتنی خوشی ہوگی۔''

”مسئلہ......؟“ خرم حیران ہوا۔

”کسی چہرے پر مسکراہٹ سجا دینا کتنی بڑی نیکی ہے تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔“

”پاپا......“ وہ انہیں بس دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن خرم اپنے گھر کے آگے کھڑا گاڑی دھو رہا تھا۔ جب وہ گزری تو اس نے وہی سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ وہی مخصوص انداز، وہی چال ڈھال، خرم دو قدم آگے ہوا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے سیدھی گزر گئی تھی۔ اس کے لب بھینچے ہوئے تھے۔ پیشانی پر غصیلی شکنیں تھیں، قدموں کی رفتار تیز تھی، خرم اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

”یہ جاتی کہاں ہے۔“ پانی پائپ سے بھل بھل گر رہا تھا، وہ گاڑی دھونا بھول گیا۔

”یہ کہاں جاتی ہے؟ اس کا گھر کہاں ہے؟ آتی کہاں سے ہے۔“ اگلے دن خرم اس کے پیچھے، پیچھے تھا۔ موڑ کاٹ کر لمبی سڑک پھر موڑ...... پھر لمبی سڑک...... اور گھوم کر وہ بچوں کے پارک میں داخل ہو گئی۔ سیدھی سیدھی ٹریک پر چلتی رہی۔ خرم ایک سائڈ پر مور کے پنجرے کے قریب کھڑا اسے نوٹ کرتا رہا۔ ایک، دو، تین، چار......اور خرم سر پکڑ کر بینچ پر گر گیا۔

”پاگل تو نہیں ہے......“ پارک کے گول ٹریک کے چار چکر لگائے۔ بہت تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے چہرہ کسی اندرونی احساس سے دہک رہا تھا۔ مٹھیاں بند تھیں۔ پھر وہ ایک کونے میں بیٹھ کر بچوں کو دیکھنے لگی۔ ایک گیند اس کے سر پر آ لگی۔ اس نے غصے سے اٹھا کر دور پھینک دی۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا۔ انگوٹھے کا ناخن کتر رہی تھی...... اس ہاتھ کی بند مٹھیاں مسل رہی تھی...... وہ کسی غصے، کسی تناؤ، کسی اضطراب اندرونی خلجان کا شکار تھی۔

مغرب کا اندھیرا پھیلنے لگا موسم کی خنکی بڑھنے لگی۔ وہ اٹھی اور پارک سے نکلنے کے لیے اس کے قریب سے گزر کر گیٹ سے نکل گئی۔

خرم بھی پیچھے، پیچھے نکلا...... خرم کے قدم پھر رک گئے۔ وہ لڑکی جانے والے راستے کی جانب نہیں پلٹ رہی تھی۔ اسی روڈ پر ذرا سا آگے بڑھی اور ایک...... گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔

”پاگل......!“ بے اختیار خرم کے منہ سے نکلا۔ گھر کے سامنے پارک تھا۔ اس کے لیے اتنا لمبا چکر اور پھر ٹریک کے چکر...... کیا ضرورت تھی۔

”پاگل...... پاگل تو نہیں تھی یہ لڑکی۔“ وہ بڑبڑایا اور پھر چونک گیا۔

”پاگل...... یعنی نفسیاتی......افوہ......“ وہ اچھلا...... ”تو یہ نفسیات کا الجھا ہوا کیس ہے اس لیے پاپا اسے بغور دیکھنے اور احساس کرنے کو کہہ رہے تھے۔ پاپا اسے جانتے ہیں، ہاں جان گئے ہیں۔“ واپس جانے والے راستے پر چلتے، چلتے وہ چونکا۔

”پاپا......! اِک مسٹری...... اُف......“ اسے یہ گیم بڑا دلچسپ لگا۔

☆☆☆

”پاپا...... وہ پاگل...... میرا مطلب ہے کہ وہ سائیکو کیس ہے۔“ ڈاکٹر شہریار احمد نے لفظ پاگل سن لیا تھا گھور کر اسے دیکھا۔

”آئی ایم سوری...... پاپا......“ اس نے سر کھجایا۔

”اگر تم کسی نفسیاتی مریض کے لیے یہ لفظ استعمال کرو گے تو علاج کے لیے سنجیدہ کیسے ہو گے؟“ خرم حقیقت میں شرمندہ تھا۔

”وہ...... پاگل نہیں نفسیاتی ہے۔ اس کی زندگی الجھنوں کا شکار ہے۔ خوف، دل شکستگی، کم ہمتی، خود ترسی میں مبتلا ہے وہ۔ ان چیزوں نے اسے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا ہے اس کے ارد گرد منفی رجحانات ہیں۔ جس نے اس کی شخصیت پر ایسے اثرات مرتب کیے ہیں، اس کی زندگی میں مثبت پوائنٹ کم اور منفی پوائنٹ زیادہ ہیں۔ اس کی زندگی میں مایوسی کا عنصر بہت زیادہ ہے اور تمہیں خرم شہریار احمد...... اب تمہیں اسے زندگی کی جانب لانا ہے۔ ایک نارمل انسان بنانا ہے۔ مثبت فکر اور مثبت طرزِ زندگی کی طرف اسے راغب کرنا ہے۔“ اور ماہرِ نفسیات خرم شہریار حیرت سے ڈاکٹر شہریار احمد کی زبانی یہ تفصیلات سن رہا تھا۔

”اور تمہیں معلوم ہے اس ساری خرابی کے ذمے دار اس کے فیملی ممبرز ہیں۔“

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا، کیا آپ اس کی فیملی کو جانتے ہیں؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”اسے تم رہنے دو...... یہ سوال اس مسئلے کا حصہ نہیں ہے۔ بس تمہیں اپنے طور اس کا علاج کرنا ہے۔ اسے زندگی کی خوشیوں کی طرف لانا ہے، زندگی کتنی خوب صورت ہے اسے بتانا ہے۔“

”پاپا...... اول تو وہ ایک لڑکی ہے اگر وہ کلینک پر آ جائے تو اور بات تھی اسے میں کس طرح......؟“ خرم نے بات ادھوری چھوڑ کر چپ سا ہو گیا۔

”اسی طرح ہی اس کا علاج ہو گا، کلینک، ڈاکٹر یا پھر ماہرِ نفسیات...... ان سب سے تو وہ بھاگتی ہے۔ وہ انسانوں کے رویوں سے خوفزدہ ہے...... مایوسی کی چادر میں خود کو لپیٹ کر آنکھیں موند لیں اور سمجھتی ہے کہ تمام مسائل سے چھٹکارا مل گیا ہے۔“

”پاپا میں سمجھتا ہوں آپ اسے بہت قریب سے جانتے ہیں...... بہت قریب سے۔“

”تم جتنی چاہو معلومات لے لینا مگر سب راز میں رکھنا...... کسی قسم کی ہمدردی اس کے نزدیک ترس ہے...... اور ترس سے اسے نفرت ہے۔“

”ہوں......“ خرم نے اِک گہری سانس لی۔ ”پاپا یہ میرے کیریئر کا انوکھا کیس ہے۔“

”ہاں بے شک......“ ڈاکٹر شہریار احمد نے تسلیم کر لیا۔

”اوکے پاپا...... میں کوشش کروں گا آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور باتیں کر کے باہر نکل گیا۔ وہ اسے سنجیدگی سے جاتا دیکھتے رہے۔

☆☆☆

وہ لڑکی پارک میں داخل ہوئی تو خرم پہلے سے اس کی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا مگر اسے شاید مطلق پروا نہیں تھی وہ ٹریک کے چکر لگا رہی تھی۔ پاپ کارن کھاتے ہوئے وہ واچ کرتا رہا۔

وہ تھک گئی تو اسی سیٹ پر آ کر بیٹھنے لگی مگر خرم کو براجمان دیکھ کر اگلی بینچ پر چلی گئی۔ اس کے ارد گرد بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند اور ان کی آوازوں سے وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی گیند قریب آ جاتی تو وہ اٹھا کر دور پھینک دیتی۔ دو تین بار ایسے ہی کیا۔ ایک بچہ جھنجلا کر اس کی جانب بڑھا۔

”کیا ہے پھپھو، آپ کیوں ہماری بال پھینک رہی ہیں، کہیں اور جا کر بیٹھ جائیں۔“

”پھپھو......“ خرم چونکا۔

بال پھر اس کے شانے پر آ لگی...... اور گود میں گری۔ اس نے پھر دور اچھال دی۔

”پھپھو......“ بچہ پاؤں پٹخ کر چیخا۔ ”میں دادا ابو سے آپ کی شکایت کروں گا۔“ بچہ پلٹ گیا۔ لڑکی دوسری جانب دیکھتی رہی۔ اس کے پاؤں کا انگوٹھا مسلسل ہل رہا تھا۔ وہ دونوں ہتھیلیوں کو مسل رہی تھی۔ موسم ہلکا ہلکا سرد ہو رہا تھا اور وہ لان کے کپڑوں میں تھی۔ آج اس کے بال الجھے ہوئے سے تھے پھر وہ اپنا ناخن کترنے لگی۔ خرم دو بار اس کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”اس سے بات کیسے ہو گی......؟“ وہ مور کے پنجروں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بچے ذرا آگے جا کر کھیل رہے تھے...... وہ ٹکر ٹکر ایک سمت دیکھ رہی تھی...... ماحول میں ملگجا سا اندھیرا پھیلنے لگا۔ بچے

پارک سے نکلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اٹھی اور اس کے قریب سے نکل گئی۔ اس کا دوپٹا قدموں کے ساتھ ساتھ نیچے گھاس سے ہمکلام تھا۔ خرم بھی باہر نکل کر اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر بائیک اسٹارٹ کر کے کلینک کی جانب چلا گیا۔

☆☆☆

پاپا کو اب رپوٹ دینی تھی، اس کیس میں اس کی ذاتی دلچسپی بھی شامل ہوگئی تھی۔ اس نے پاپا کی دی ہوئی معلومات کی روشنی میں نوٹس بنانے شروع کردیے، اگلے دن وہ اسی بچے کو ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ لڑکی لمبا راستہ طے کر کے ٹریک کے چکر لگا کر اب اسی بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ آج وہ بچہ نہیں آیا تھا اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تبھی وہ بچہ ایک آدمی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔

''یہ دیکھیں چاچو، یہ بیٹھی ہیں، ہمیں کھیلنے نہیں دیتیں۔ بار بار بال دور پھینک دیتی ہیں، انہیں سمجھائیں۔''

خرم نے نزدیکی بینچ پر بیٹھے یہ منظر دیکھا اور کان اسی سمت لگا دیے۔

''کیوں...... کیا بات ہے، یہ کیا پاگل پن ہے، بچوں کو کھیلنے کیوں نہیں دے رہی ہو تم نشاط؟'' اس آدمی کے انداز میں غراہٹ اور نظروں میں نخوت تھی۔

''یہاں بھی چین نہیں ہے تو اپنے کمرے میں بند رہا کرو۔'' لڑکی، سر جھکائے ناخن کتر رہی تھی۔

''اگر آئندہ فضول قسم کی حرکتیں کیں تو پاگل خانے بھجوا دوں گا...... تم اُدھر ہی ٹھیک ہو۔''

لڑکی نے جھٹکے سے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں خوف، سراسیمگی، اضطراب تھا پھر سر جھکا لیا اور مٹھیاں مسلنے لگیں۔

''چاچو، انہیں پاگل خانے چھوڑ آئیں۔'' بچہ ہنس رہا تھا۔

''امی بھی کہہ رہی تھیں کہ یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں......''

''نہیں، نہیں، جھوٹ بولتی ہیں وہ...... جاؤ تم جاؤ...... ٹھیک ہے، میں آئندہ نہیں کروں گی...... کبھی نہیں کروں گی، بھائی بس مجھے پاگل خانے نہیں بھیجنا۔'' ایک دم سے وہ چیخی اور پھر اس کی آواز دھیمی ہوگئی...... عاجزی، بے بسی، بے چارگی تھی...... خرم ساکت بیٹھا تھا۔

مرد اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''چاچو یہ گھر میں بھی مجھے چیخ، چیخ کر ڈانٹتی ہیں۔'' بچے نے آج ساری شکایتیں لگا دینی تھیں۔ لڑکی جس کا نام نشاط تھا اس کا چہرہ اور جھک گیا۔ مرد اسے وارننگ دے کر پلٹ گیا۔ نشاط ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو گر رہے تھے پھر اس نے پیر اٹھا کر بینچ پر رکھ لیے گھٹنوں کے گرد بازو رکھ کر اُن پر چہرہ رکھ لیا۔ خرم ساکت بیٹھا تھا۔ بے بسی، کم ہمتی، بے چارگی کی واضح تصویر کو سگا بھائی کیسے ڈانٹ رہا تھا اور بھتیجا کیسے دیدہ دلیری سے شکایتیں لگا رہا تھا۔ گویا ان میں قریبی تعلق نہ ہو بلکہ کوئی غیر ہوں، اجنبی ہوں، راہ چلتے مسافر ہوں۔

خرم کا دل چاہا آگے بڑھے، اس کی دل جوئی کرے، اس کے آنسو سمیٹے اور زندگی کا نیا سبق اسے پڑھائے کہ زندگی، بزدلی کا نام نہیں، زندگی اس بات کا سبق نہیں پڑھاتی کہ اسے بے بسی کی نذر کردو۔ خرم کھڑا ہوا...... ماحول میں اندھیرا پھیلنے لگا...... پارک کی لائٹس جلنے لگی تھیں، بچے چلے گئے...... تبھی وہ اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی پارک سے نکل گئی۔ خرم کو معاشرے کے اس کردار پر بے حد افسوس اور دکھ ہوا۔ وہ بھی سر جھکائے باہر نکلنے لگا۔ اپنوں کے ہاتھوں دکھ کا شکار لڑکی...... پاپا نے اس کے دکھ کا اندازہ کتنا ٹھیک لگایا تھا۔ اسے محسوس کرو، اس کردار کے دکھ کو، مرض کی نوعیت کو محسوس کرنے پر اپنائیت محسوس ہوگی اور یہی اپنائیت اس کے دکھ کی

دوا ہوگی ایسے شخص کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرنا اور اس کے لیے دعا کرنا ہی بہترین عمل ہوگا۔

☆☆☆

اگلے دن پاپ کارن اور چاکلیٹ سے بھرا شاپر دے کر اس نے بچے سے دوستی کرلی جس کا نام ابو ریحان تھا اور وہ نشاط کا بھتیجا تھا۔

''وہ......'' اشارے سے بینچ پر بیٹھی نشاط کی جانب اشارہ کیا۔ ''وہ میری پھپو ہیں، ایک دم گندی، چالاک اور مکار......'' اتنے ثقیل اور بھاری الفاظ، خرم کو شاک لگا۔ ''یہ تو سب بہانے ہیں بیماری کے، کوئی بیمار شمار نہیں ہیں، ساری اداکاری ہے۔'' وہ پاپ کارن پھانکتے ہوئے گل افشانی کررہا تھا۔ وہ بینچ پر بیٹھے دونوں ہاتھ گود میں رکھے، ایک ہی سمت دیکھ رہی تھی۔ خرم، نشاط کو دیکھ رہا تھا اور ابو ریحان کو سن رہا تھا۔ گھر کے کسی بڑے کی زبان اسے ازبر تھی۔

''کام نہ کرنا نہ پڑے، ہم بچوں سے تو ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہیں سائے کی طرح، آدم بو کی طرح پیچھے آجاتی ہیں پھر مارتی ہیں، رات کو تو بہت زور زور سے چیختی تھیں۔''

''کیوں......؟''

''بھائی نے ان کے بیڈ پر چھپکلی رکھ دی تھی ان کا ہاتھ پڑ گیا۔ بس وہ تو امی نے بچا لیا ورنہ تو وہ سیڑھیوں سے گر جاتیں۔ چاچو نے انہیں زور سے تھپڑ مارا تھا...... پاپا تو ہاکی لے کر آگئے تھے۔''

''اور تمہاری دادی......؟''

''میری دادی نہیں ہیں، دادا ہیں مگر وہ دوسرے گھر میں رہتے ہیں۔ دوسری دادی کے ساتھ۔''

دکھ...... درد...... تکلیف خرم کے اندر سے اٹھا تھا۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اب وہ اپنے ناخن کتر رہی تھی۔ ہلکی، ہلکی دھوپ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

''ابو ریحان تمہاری پھپو اتنی غصے والی کیوں ہیں؟'' خرم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''امی کہتی ہیں سایہ ہے ان پر۔'' نخوت بھرا انداز تھا۔

''اس سے بچ کر رہا کرو کہیں تم پر بھی نہ آجائے۔''

''انکل یہ سایہ کیا ہوتا ہے؟''

''سایہ......؟'' وہ کان کھجانے لگا۔

''کیا وہ بہت ڈراؤنا ہوتا ہے، چڑیل، جن بھوت کی طرح؟'' خرم اس کے انداز پر ہنس دیا۔

''نہیں...... ہر انسان کے ساتھ اس کا سایہ ہوتا ہے۔ جیسے تم دھوپ میں کھڑے ہو تو یہ تمہارا سایہ ہے۔'' خرم نے اسے کھڑا کر کے سمجھایا۔

''مگر ماما تو بہت ڈراؤنی شکل بنا کر کہتی ہیں۔''

وہ اس سائے کو اس کے لیے آسان نہیں کرسکتا تھا۔ اس کو جو سمجھایا گیا تھا وہ زیادہ مضبوط تھا۔

''کبھی تم نے اپنی پھپو سے پیار سے بات کی ہے؟''

''وہ تو کسی سے بات نہیں کرتیں، ہر وقت غصے سے بھری رہتی ہیں۔'' اس نے اپنا منہ پھلا اور بگاڑ کر کہا۔ خرم ہنس دیا...... کیلو...... کیلو ابو ریحان اپنی بھرپور معصومیت کے ساتھ اسے اچھا لگا۔ واقعی بچے فرشتہ ہوتے ہیں۔

''ریحان...... ریحان......'' دونوں نے پلٹ کر دیکھا...... ہاتھ میں بیٹ پکڑے ایک بچہ اسے بلا رہا تھا۔

''انکل میں جاؤں میری باری ہوگی بیٹنگ کی۔'' خرم نے اس کے شانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔

''جاؤ...... کل ملیں گے۔'' خرم سر گھما کر نشاط کو دیکھنے لگا۔ اب وہ اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں میں الجھی ہوئی تھی۔ ترس، ہمدردی، مظلومیت، کیسے، کیسے کردار ہمارے اردگرد سسک رہے ہیں اور ہمیں اس کا ادراک ہی نہیں، کچھ منظر پر آجاتے ہیں اور کچھ...... خرم نے گہری سانس لی، باسی پھولوں کی مہک اِدھر اُدھر بکھرنے لگی تھی۔

☆☆☆

"یار آجاؤ ناں......" رات علینہ کا فون آیا تو سنتے ہی خرم نے کہا۔
"دماغ خراب ہے تمہارا...... یہ امریکا ہے کیا ایسے کیسے آجاؤں اکیلئے بارات بھیجو میرے لیے۔"
"بہت خوش فہمی ہے اپنے بارے میں۔" خرم نے اِک گہری سانس لی۔
"اور کیا...... تیاریاں، شیاریاں کرو، بری شری بناؤ...... جوڑا خریدنے کی آفر کرو اور کہو بھئی کب چلنا ہے بارات کا جوڑا خریدنے۔" علینہ کی شوخ ہنسی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔
"ہوتی ناں تم یہاں ابھی...... تو......"
"جملہ مکمل کرو شہزادے۔"
"تم نے بی کام مکمل کرلیا ہے کیا...... جو خواب دیکھ رہی ہو۔"
"یار...... تم میرے ہونے والے اتنے قابل شوہر ہو تو مجھے کیا پڑی ہے پڑھ، پڑھ کر اپنا خون جلاؤں جبکہ مجھے علم ہے کہ نوکری بھی نہیں کرنے دیں گے خالو جان......" ساتھ ہی اس کی ہنسی کی مترنم آواز ابھری۔
"سدھر جاؤ لڑکی۔"
"فیصل آباد میں صدر کہاں...... اور تم مجھے اکیلے جانے کب دیتے ہو صدر۔" خرم ہنس دیا۔
"لگ رہا ہے بڑی فرصت سے بیٹھی ہو۔"
"جی نہیں، میں جھولے پر بیٹھی ہوں۔"
"تم نے آنا ہے یا نہیں؟"
"ابھی سے دھونس جما رہے ہو؟"
"کیوں نہ جماؤں......؟"
"آرہی ہوں، چپلیں تو پہن لوں۔" بسوری سی آواز ابھری۔
"اب میں نے اتنی جلدی بھی نہیں کہا......" وہ ہنس دیا۔
"خالہ آرہی ہیں ناں پرسوں ان کے ساتھ آجاؤں گی۔"
"کیا......؟" خرم زور سے چیخا۔
"امی فیصل آباد آرہی ہیں؟"
"ہاں خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے۔"
"چلو ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

ابوریحان سرخ رنگ کی بال کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا اور خرم اس کے تاثرات نوٹ کررہا تھا۔ دور بینچ پر بیٹھی نشاط کے ہاتھ میں ایک ٹہنی تھی پتوں والی جانے کیا، کیا سوچتی وہ پتی پتی توڑ رہی تھی۔
"پھپھو ہم سے پیار نہیں کرتیں...... انہیں ہم سے پیار ہے ہی نہیں...... انہیں صرف غصہ کرنا آتا ہے۔"
"ہر غصے کی کوئی وجہ ہوتی ہے...... بغیر وجہ کے غصہ پتا ہے کون کرتے ہیں؟"
"پاگل......" ابوریحان نے سر اٹھائے بغیر کہا۔
خرم جز بز ہوگیا۔ ایسے تلخ اور واضح الفاظ......" تو پھپھو پاگل ہی تو ہیں...... امی کہتی ہیں، پاپا کہتے ہیں، چاچو کہتے ہیں باقی سب محلے والے بھی۔" خرم کو افسوس ہوا۔
"ان کی کوئی دوست نہیں ہے؟"
"ان کو کوئی کھیل کھیلنا ہی نہیں آتا...... تو دوست کیسے بنائیں گی؟" وہ ہنسا۔
"کیا کرتی رہتی ہیں آپ کی پھپھو گھر میں؟" تاسف، اس کے اندر ٹھہرنے لگا۔
"کچھ...... کچھ......" ابوریحان منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسا۔
"سوتی رہتی ہیں، غصہ کرتی ہیں، چیختی چلاتی رہتی ہیں اور جب تھک جاتی ہیں تو سیڑھیوں پر یا کسی کونے میں یا اپنے کمرے میں خاموش بیٹھ جاتی ہیں۔" پاپ کارن کھاتے، ٹانگیں چلاتے بڑے مزے سے ابوریحان اسے بتاتا جارہا تھا۔ اپنوں کی تنہائی کی، بے بسی کی ماری مظلوم لڑکی نشاط...... ایسا کیوں تھی...... یہ بات اسے یہ چھوٹا سا بچہ نہیں بتا سکتا

تھا۔ اس کے لیے خرم کو نشاط سے معلومات کرنا تھی یا پھر کوئی اور دوست، رہنما، ہمدرد۔
"آپ کی پھپھو پڑھتی ہیں؟" اس کے بال سہلاتے ہوئے خرم نے پوچھا۔
"نہیں تو پڑھاتی ہیں۔" خرم کو ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا سا لگا۔
"یہ کنڈیشن اور پڑھانا......؟"
"کہاں......؟"
"وہ جو روڈ کے اوپر پارک کے ساتھ اسکول ہے ناں وہ والا۔"
"اوہ......" خرم نے سر ہلاتے ہوئے ہونٹ سکوڑ لیے۔ "اور آپ کہاں پڑھتے ہیں؟"
"میں دوسرے اسکول میں...... انکل میں مور دیکھ لوں۔"
"ہوں۔" ابوریحان کے شانے سے اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ اٹھ کر پنجرے کی جانب بھاگ گیا۔ خرم نے گردن موڑ کر دیکھا۔ نشاط ایک کونے میں کھڑی کسی پودے کو دیکھ رہی تھی۔ دوپٹا حسبِ معمول زمین کی سطح کو چھو رہا تھا۔
"جانے اسے کیا دکھ ہے۔ یہ اکیلا پن، یہ اداسیاں، یہ محرومیاں، تنہائی یہ عمر تو نہیں۔"
وہ دانتوں سے ناخن کتر رہی تھی۔ اسی پل اس نے بھی گردن گھمائی اور خرم کو دیکھا پھر دوسرے لمحے گھبرا کر چہرہ گھما لیا۔ اِک خوف، اضطراب نمایاں تھا۔ پہلے وہ بینچ پر بیٹھی چند لمحوں بعد وہاں سے اٹھی اور بیرونی راستے پر چلتے باہر نکل گئی۔ خرم اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"ایسا کون سا مسئلہ ہے جو تو کلینک سے باہر ٹہل رہا ہے۔" فہد نے اس کے سوال پر ٹھٹک کر دیکھا۔
"بس ابا جان کا حکم ہے موصوفہ کا علاج بھی کرنا ہے اور اسے معلوم بھی نہ ہو۔"

چوڑیاں

میری کلائیوں کو ستاتی ہیں چوڑیاں
ساجن کو صبح شام بلاتی ہیں چوڑیاں
لگتی ہیں زہر جب بھی چلا جائے اٹھ کے وہ
ہو سامنے تو پھر مجھے بھاتی ہیں چوڑیاں
ٹوٹی ہوئی جو ملتی ہیں کمرے میں ہر جگہ
اُس کی بہت ہی یاد دلاتی ہیں چوڑیاں
جب گنگناؤں اس کی محبت میں، میں کبھی
سکھیوں کی طرح ساتھ یہ گاتی ہیں چوڑیاں
لگتی ہیں کڑی کی طرح یہ اپنے ہاتھ میں
مجھ کو کبھی کبھی تو ڈراتی ہیں چوڑیاں
تمثیلہ جب وہ مجھ سے خفا ہو کبھی تو پھر
اس کو بہت ادا سے مناتی ہیں چوڑیاں
شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جودھالہ

"موصوفہ کیسی ہیں، میں کچھ خدمت انجام دے سکتا ہوں؟"
"جی بالکل، ناخن کترنے کی وجوہات بتاؤ اور ان کا سدِباب......" بچکانہ سے انداز میں سوال کیا۔ فہد نے اسے گھورا۔
"بتاؤ...... بتاؤ...... چپ کیوں ہو؟"
"دانتوں سے ناخن کاٹنا دراصل منفی رویے کا اظہار ہے۔ اندرونی خلفشار، اضطراب اور تناؤ کا اظہار ہے، بے بسی کی انتہا ہوتی ہے...... کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ایسے مریض بس ناخن منہ میں ڈال کر کترنے لگتے ہیں۔ غصے کا اظہار اندر ہی اندر کرتے ہیں خود سے۔"
"اس کا تدارک؟"
"سب سے پہلے ری ٹینشن، ڈپریشن، اندرونی تناؤ ختم کریں۔ بچے کے منہ میں ہر وقت کچھ نہ کچھ ڈالیں کھانے کے لیے مثلاً چیونگم وغیرہ یا پھر دوسری مصروفیت تاکہ اس کے ہاتھ مصروف رہیں اور ناخن

منہ میں نہ ڈالے۔"

"ہوں...... اپنا دماغ بھی استعمال کرلو۔"

"موصوفہ کتنی بڑی ہیں؟" فہد ہنسا۔

"قابلِ شادی سمجھو۔"

"خوب صورت بھی؟" وہ شوخ ہوا۔

"بالکل! ویسے ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔"

"ارے ہم کولہو چلوالیں گے۔" فہد بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ "یہ بتاؤ، تمہاری بات چیت ہے اس سے؟"

"یہی تو اہم مسئلہ ہے کیا، کیا جائے؟"

"اور اتنی معلومات جو حاصل کی ہیں۔"

"سب اِدھر اُدھر سے مگر کچھ سوالات کچھ معلومات ایسی ہوتی ہیں جو اس کے اپنے دے سکتے ہیں خاص طور پر وہ لوگ جو اس کے قریب ہوں اور اس کا علاج بھی کروانا چاہتے ہوں۔ والدہ ہوتیں تو کیا بات تھی۔ شاید کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔"

"فضہ سے کہو۔"

"یار فضہ اور ماما تو اسلام آباد سے آنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔"

"پھر انتظار کر۔"

"ہوں۔"

"مسئلہ تو مشکل ہے مگر مجھے یقین ہے تو حل کرلے گا۔"

"اور اگر لینے کے دینے پڑ گئے تو؟"

"یار کچھ نہیں ہوتا۔ کہہ دینا کہ علاج کی غرض سے بات کی ہے۔" فہد کی بات پر خرم زور سے ہنسا۔

"اس کا بھائی پہلوان ٹائپ کا ہے۔ جمائے گا رکھ کر تو سارے طبق طباق بن جائیں گے۔"

"خرم ایک آئیڈیا۔" فہد اچھلا۔

"کیا......؟"

"اس کے بھتیجے نے بتایا ہے کہ وہ اسکول میں پڑھاتی ہے تو اسکول میں اس کی کوئی دوست بھی تو ہوگی نا، اس سے مل۔" خرم چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"گڈ آئیڈیا۔" پیپر ویٹ گھماتے ہوئے خرم کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن خرم گرامر اسکول کے آفس میں میڈم کے سامنے بیٹھا نشاط کے متعلق پوچھ رہا تھا اور میڈم زویا سنجیدگی سے خرم کو دیکھ رہی تھیں۔

"جی، وہ میرے اسکول میں میری وجہ سے ہی پڑھاتی ہے۔ میری بہت اچھی دوست ہے نشاط۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایم اے اکنامکس کیا ہے۔ ہم لوگ بہت اچھی فرینڈز ہیں۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں کہ وہ بہت اچھا پڑھا سکتی ہے؟"

"پڑھانا تو اس نے نہیں ہوتا بس کبھی کبھی آجاتی ہے میرے اصرار پر... دراصل وہ ڈپریشن میں مبتلا رہتی ہے مصروفیت اس کے لیے بہت اچھی ہے مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میڈم زویا کی حیرت دیدنی تھی۔

"آپ مجھے ان کا معالج سمجھ لیں۔"

"اوہ...... اچھا! اس کے گھر والوں نے اس کی بیماری سمجھ لی۔ صد شکر ورنہ تو وہ اسے پاگل کہتے ہیں۔ دراصل پاگل وہ خود ہیں ایک ہنستی کھیلتی لڑکی کو نفسیاتی بنادیا۔"

"نہیں، مجھے ان کے گھر والوں نے معالج مقرر نہیں کیا ہے میں خود......" میڈم زویا چونکیں اور کر کے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب؟"

"دراصل وہ میرے پاپا کے دوست کی بیٹی ہے اور پاپا نے کہا ہے کہ میں اس کا علاج کروں۔ ایک صحت مند، باشعور لڑکی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میڈم زویا نے سر ہلایا۔

"مجھے خوشی ہوگی کہ میری دوست ایک صحت مندانہ زندگی گزارے۔ زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے۔ ایک نارمل زندگی گزارنا اس کا بھی حق ہے۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

"آپ اس کے اتنے قریب ہیں آپ وہ سب کچھ بتا سکتی ہیں جو کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ، اس کے حالاتِ زندگی، وہ سب وجوہات جس نے اسے اتنا ابنارمل کردیا ہے۔"

"نشاط اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہے۔ اس کے والدین میں ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی، روز روز کے جھگڑوں نے نشاط کی ذہنی حالت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ والدین کی طلاق نے حالات میں اور بگاڑ پیدا کردیا۔ نشاط اپنی والدہ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر وہ کسی بھی بچے کو ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھیں۔ اس چیز نے اسے دل شکستگی اور بے بسی میں مبتلا کردیا پھر اس کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ والدہ نے بھی دوسری شادی کرلی۔ اس کے باقی بہن بھائیوں نے گزرتے وقت کے دھارے میں سے اپنے، اپنے لیے راہیں نکال لیں۔ احساسِ کمتری کا شکار نشاط اسی جگہ کھڑی رہی جہاں اس کے والدین نے اسے چھوڑا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی بچی ہے، جس بچی کا ہاتھ میلے میں چھوٹ جائے اور وہ پھر سے میلے میں کھوجائے...... ڈری، سہمی، خوفزدہ سی۔ وہ خود سے باتیں کرتی ہے۔ میرا ساتھ اگر نہ ہوتا تو وہ اتنا پڑھ بھی نہ پاتی۔" میڈم زویا سانس لینے کو رکیں تو خرم کا قلم بھی رک گیا۔

"اس کی دو بہنیں اپنی پسند سے شادی کر کے باہر چلی گئیں۔ نشاط کو اس کے ماموں زاد بھائی نے پسند کیا تھا مگر اس کی بہن نے نشاط کو پاگل قرار دے کر خود اس سے شادی کرلی۔ بھائی نے بھی شادی اپنی پسند سے کی۔ بھابی سونے پر سہاگا نکلیں۔ نشاط کے پاپا نے اپنے دوست کے بیٹے سے منگنی کی تھی اس کی۔ بھابی صاحبہ نے نشاط کو ذہنی مریض قرار دے کر منگنی تڑوادی اور اپنی بہن کی شادی اس سے کروادی۔ اب بھائی اپنے سالے سے اس کی شادی

کروانا چاہتا ہے۔ زور دیتا ہے تو نشاط چیخنے لگتی ہے۔ والد، بھائی سب اسے پاگل سمجھتے ہیں کوئی اس کا درد نہیں سمجھتا...... تنہائی، اکیلے پن، خوف، کم ہمتی نے اسے زندگی سے دور کردیا ہے۔ ماں کی محرومی کو وہ دل سے نکال نہ سکی۔ کسی بہن بھائی کی زندگی میں اس کی جگہ نہیں کہ اس کے درد کو، دکھ کو سمجھ سکے حالانکہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ پاگل کہہ کر بھابی نے اسے بے موت مار دیا ہے یہاں تک کہ بچے بھی اب پاگل، پاگل کہہ کر چھیڑتے ہیں۔" دلگیر و اداس لہجے میں میڈم زویا بولے جارہی تھیں اور خرم کا قلم کاغذ پر چلا جارہا تھا۔

"نشاط کی اسی ذہنی پسماندگی کا شکار اس کے اپنے ہی ہیں مگر کسی کو اس کا احساس نہیں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ میری دوست ٹھیک ہوجائے۔ اسے ایک ایسے اچھے دوست، رفیق، رہنما کی ضرورت ہے جو اس کا درد سمجھے، اس کا احساس کرے۔" میڈم زویا، خرم کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"آپ اس کی زندگی میں بہار کا جھونکا ثابت ہوں گے۔" خرم ایک لمحے کو چپ سا ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنی ڈائری بند کردی۔

"انشاء اللہ! مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی میں جب آؤں گا تو آپ مجھے مزید ٹائم دیں گی۔"

"آف کورس...... اگر آپ کال کر کے آئیں تو بہتر ہوگا میں نشاط سے آپ کی ملاقات بھی کرواسکتی ہوں۔"

"وائے ناٹ۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ میڈم زویا بھی کھڑی ہوگئیں۔

"آئندہ میں اپنی بیگم کو بھی ساتھ لاؤں گا۔" خرم نے مسکرا کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ میڈم زویا اس کے آخری جملے پر غور کرتی رہ گئیں۔

☆☆☆

"مت آؤ تم، جب کوئی دوسرا لے اڑے گا

ناں پھر عیش کرتی پھرنا۔" رات فون پر علینہ سے بات کرتے ہوئے وہ گرج رہا تھا۔

"میں خوشبو کو قید کروں گی تو خوشبو اڑ جائے گی میں نے محبت کو آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ محبت میرے پاس رہے گی کہیں بھی ہوئی اڑ کر آئے گی۔" علینہ ہنس رہی تھی۔

"ہائے ری خوش فہمیاں۔"

"اعتماد جو ہے آپ پر۔" دھیرے سے کہا۔

"بکواس بند کرو اور فوراً آنے کی تیاریاں کرو۔"

"خرم ڈیٹ فکس ہوئی نہیں، میں کیسے آؤں؟"

خرم نے بے بسی سے فون کو دیکھا۔

"تمہیں تو میں......" خرم نے بے بسی سے فون کو دیکھا۔ ڈاکٹر شہریار اندر آ گئے۔ خرم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں بعد میں بات کرتا ہوں۔ پاپا آئے ہیں۔" اور فون آف کر دیا۔

"کیسا چل رہا ہے تمہارا کیس، کہاں تک پہنچا؟"

"ڈائریکٹ ڈیلنگ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ ابھی تو تھوڑا ٹائم لگے گا پاپا۔ ویسے بے حد مظلوم کردار ہے معاشرے کا۔ اپنوں نے کتنی زیادتی کی ہے اس کے ساتھ۔ فائل دوں گا آپ کو اسٹڈی کے لیے۔"

"میں جانتا ہوں بس تم اسے ٹھیک کر دو۔"

"پاپا جس قسم کے ماحول میں وہ رہ رہی ہے اس کا ٹھیک ہونا مشکل ہے۔ بات، بات پر ٹارچر کرنا، طعنے دینا، پاگل کہنا چہ معنی دارد۔"

"یہ سب اس لیے کہ نشاط کے والد اپنی جائداد کی تقسیم کر رہے ہیں اس کے بھائیوں کی کوشش ہے کہ نشاط کو پاگل ثابت کریں تاکہ اس کا حصہ بھی انہیں ہی مل جائے۔ اس لیے اس کا علاج ضروری ہے۔ وہ شدید ڈپریشن اور احساسِ کمتری کا شکار ہے بس اس احساس سے اسے چھٹکارا دلانا ہے۔"

"تو پھر اسے صحت مند ماحول، خوشگوار فضا اور اچھی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ تبدیلیِ ماحول انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔"

"اس کے گھر والے اسے نفسیاتی اسپتال بھیج سکتے ہیں، پاگل خانے بھجوا سکتے ہیں اور کہیں نہیں۔"

"پھپو، نانا، ماموں، چچا کوئی تو گھر ہو گا ناں اس کے لیے جہاں رہ کر اس کا علاج شروع ہو۔" خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ناممکن، پورا خاندان اسے پاگل، خبطی، دیوانی سمجھتا ہے۔ گھر بلانا تو دور کی بات ہے۔ خاندان میں اتنے لڑکے ہیں مگر کہیں سے اس کے لیے رشتہ نہیں آیا۔"

"اگر آپ کے دوست حقیقی معنوں میں بیٹی کی زندگی چاہتے ہیں تو وہی اسے ایک صحت مند ماحول دے سکتے ہیں۔"

"ایسا کرتے ہیں اپنے گھر بلوا لیتے ہیں اسے۔" خرم کو اچھو لگ گیا۔

"پاپا، ماما اور فضہ کی غیر موجودگی میں؟"

"انہیں کل بلوا لیتا ہوں میں۔"

"دیکھ لیں جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"ہوں۔" اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگے۔

☆☆☆

آج کتنے دن بعد پارک آیا تھا اور آ بیل مجھے مار کی مثل بن گیا۔ نشاط سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کا بھائی کھڑا خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہا تھا اور ساتھ ہی کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ خرم بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ تبھی ابوریحان بھاگتا ہوا پارک میں آیا اس کی نظر خرم پر پڑی تو اس کی جانب آ گیا۔

"کیسے ہو شہزادے؟" خرم نے پیار سے اس کا رخسار چھوا۔

"بالکل ٹھیک، اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں نے

ماما اور چاچو کو بتایا تھا آپ کے بارے میں۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے، آئیں ملواؤں۔"

"باپ......رے۔" اس کے کان کھڑے ہوئے۔ "رہنے دو بیٹا پھر کبھی سہی۔" وہ پارک سے کھسک لینا چاہتا تھا مگر برا ہو وقت کا۔

"چاچو......چاچو، اِدھر آئیں۔ یہ رہے میرے دوست انکل۔" نشاط کا بھائی لمبے لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا کہ ابوریحان نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر رہ گیا اِدھر خرم کی عجیب حالت ہو گئی۔

"چاچو، یہ پوچھتے ہیں پھپو کے متعلق۔" اس کے کہنے پر خرم پر گھڑوں پانی گر گیا۔

"کیوں جی؟" بھائی کے کہنے خرم سن سا ہو گیا۔

"کچھ نہیں جناب، دراصل یہ بچہ اُن کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا اور وہ رو رہی تھیں تو میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ بڑوں کے ساتھ ایسا نہیں کرتے۔" اس نے بروقت بات سنبھالی۔

"وہ تو پاگل ہے، اِدھر اُدھر نہ نکل جائے اس لیے بچے دھیان رکھتے ہیں۔" وہ کس بے حسی سے سگی بہن کے بارے میں کہہ رہا تھا۔

"اچھا۔"

"بہتر یہ ہے اپنے کام سے کام رکھو۔" اس نے گویا وارننگ دی اور بچے کا ہاتھ تھام کر نکل گیا۔ وہ انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ بچے پر اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر نشاط کو دیکھا۔ وہ اُدھر ہی دیکھ رہی تھی۔

خرم نے نوٹ کیا وہ دیکھتی رہی اس نے سر نہیں جھکایا۔ چند گز کا فاصلہ طے کر کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ رخ موڑ کر پارک میں گھومتی بطخوں کو دیکھنے لگی۔

"اگر کسی کا ہمارے بارے میں خیال اچھا ہے تو اسے اور اچھا ثابت کرنا چاہیے اور برا ہے تو اسے باطل کرنا چاہیے۔" سینے پر ہاتھ باندھ کر خرم نے اسے دیکھا۔ نشاط اضطراب سے ہتھیلیوں کو مسل رہی تھی۔

"اور زندگی یوں نہیں گزرتی جیسی آپ گزار رہی ہیں۔"

"تو......؟" اس نے سر اٹھایا۔

"خاموشی، بے بسی، مظلومیت انسان کو اکیلا کر دیتے ہیں۔" وہ دھیرے سے کھڑی ہو گئی۔ سر سے دوپٹا ڈھلک گیا۔ وہ شاید نہا کر آئی تھی۔ سوکھے بال شانوں پر بکھرے تھے۔

"وہ تم ہو، جو میرے بارے میں میرے بھتیجے سے پوچھتے ہو؟" خرم اسے دیکھے گیا۔

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں زبردستی بیمار بننا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتا اور نہ ہی آپ کوئی جانور ہیں کہ ریت میں منہ چھپا کر حالات سے بچ جائیں۔"

"کون ہوتے ہیں آپ میرے زندگی میں دخل دینے والے؟" وہ دبے انداز میں چیخی۔

"ایک ہمدرد، خیر خواہ۔"

"مر گئے سارے ہمدرد۔ یہ نیکی مت کرنا میرے ساتھ۔ مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔ آئندہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش مت کرنا۔" وہ جانے لگی۔

"آپ خود کو ایک نارمل زندگی میں لے آئیں۔ میں آپ کو بدنام نہیں کروں گا۔" خرم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔" وہ غرائی۔

"اتنی ہمت ہے کہ کسی کو جان سے مار سکو تو پہلے ان دیواروں کو گراؤ جو تم نے اپنے اردگرد کھڑی کر لی ہیں۔ مار دو اس تنہائی اور اس اکیلے پن کو۔"

"تم......تم کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اتنا کہ آپ خود کو نارمل کرلیں۔" خرم دھیرے سے مسکرایا۔ نشاط نے جھٹکے سے منہ پھیرلیا۔

پارک میں اندھیرا پھیلنے کو تھا وہ آگے بڑھی پھر بھاگتی ہوئی پارک سے نکل گئی خرم اُدھر ہی ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆☆

"وہ آپ کی دوست ہے اور دوست سے بڑھ کر کوئی ہمدرد، کوئی مہربان نہیں ہوتا میڈم زویا۔" وہ آج پھر اس کے آفس میں تھا۔

"وقت نے اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا ہے۔ قسمت تقدیر، حالات ......سب نے اسے توڑ پھوڑ دیا ہے۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہے۔"

"خاموشی ڈپریشن کو بڑھاتی ہے اور بے حسی انسان کو ماردیتی ہے۔ آپ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ آپ اسے مصروفیت دے کر ڈپریشن سے نکال سکتی تھیں۔ اگر وہ کم ہمت تھی تو آپ ایک اچھے دوست کی طرح اس کی طاقت بن سکتی تھیں۔" زویا سر جھکا کر پین سے آڑی ترچھی لکیریں بناتی رہی۔

"محبت ......محبت اس کی ضرورت بھی ہے اور طاقت بھی۔ محبت کے بغیر وہ ادھوری ہوگئی ہے۔ اپنوں کی عدم محبت اور عدم اپنائیت نے اسے توڑ دیا ہے۔ وہ مرنے کی خواہش کرتی ہے۔ دو دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کرچکی ہے۔"

"اوہ نو۔" خرم ساکت رہ گیا۔

"زندگی پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔" خرم، میڈم زویا کو دیکھے گیا۔ جو اپنی دوست کے دکھ پر نمناک تھیں ان کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"آپ کو علم ہے کہ دوست اچھے دنوں میں سرمایہ اور برے دنوں میں محافظ ہوتے ہیں۔" میڈم زویا اس کی بات پر چونک گئیں۔

"اس میں خود آپ کتنی قصوروار ہیں، آپ جانتی ہیں؟ آپ نے اسے مضبوط سہارا دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ سب نے اسے چھوڑ دیا تو آپ نے بھی چھوڑ دیا۔ اس کی ہمت نہیں بندھائی۔ اس کی طاقت نہیں بنیں۔ اسے راستہ نہیں دکھایا۔ اس کا خیال نہیں رکھا۔ اسے سمجھایا نہیں۔"

"اس کے گھر والے میرے خلاف ہیں۔ مجھے ملنے نہیں دیتے۔ وہ تو اکثر خود آجاتی ہے تو میں سمجھاتی ہوں مگر وہ ہر چیز سے شاکی ہے۔" وہ تڑپ کر بولیں۔

"میڈم زویا!" آفس میں گہری خاموشی چھا گئی۔ خرم نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا۔ "جو ہوگیا سو ہوگیا ہمیں اسے زندگی کی طرف لانا ہے، وہ پاگل ہے نہ نفسیاتی۔ دکھوں سے خوف زدہ ہوکر اس نے کمبل میں منہ چھپالیا ہے اس کے آگے ایک لمبی زندگی ہے۔ ہمیں اسے بچانا ہے اور ایک نارمل زندگی کی طرف واپس لانا ہے۔"

"خرم صاحب، آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" اس بار وہ چونکیں۔ خرم نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"اس لیے کہ یہ میرے پاپا کی خواہش ہے وہ ان کے دوست کی بیٹی ہے۔"

"بس ......یا؟" زویا کا انداز ذومعنی تھا۔

"ہاں، بس۔ بے لوث اور بے ریا ہوکر اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"خرم صاحب! اسے خالص جذبوں کی ضرورت ہے۔ اسے ایک ایسے محبت کرنے والے شخص کی ضرورت ہے جو اسے سمجھے اور زندگی کے بھنور سے نکال لائے۔ اس کی مثال اس آکاس بیل ایسی ہے جو اوپر چڑھنے، آگے بڑھنے کی خواہش میں کسی بھی مضبوط تنے سے لپٹ جاتی ہے اور جب جھٹکا لگا کر پھینک دی جاتی ہے تو وہ بالکل ٹوٹ جاتی ہے۔"

"ہمیں اسے مضبوط بنانا ہے۔ اس کے اندر خود اعتمادی، یقین اور قوتِ فیصلہ پیدا کرنا ہے۔ حالات نے اس کے اندر جو زہر بھر دیا ہے اس کا

تریاق کرنا ہے۔ اس کے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اپنی جنگ خود لڑ سکے۔ خود دوسروں کو سہارا دے سکے نہ کہ خود ہی کمزور سہارے تلاشتی پھرے۔" میڈم زویا اسے دیکھے گئیں۔

"ہم ساری دنیا کو نہیں سدھار سکتے مگر جو ہمارے اختیار میں ہے ہماری پہنچ میں ہے اس کے لیے تو اپنی توانائیاں صرف کرسکتے ہیں۔"

"اگر آپ بتا کر آتے تو میں اسے بلوالیتی۔" میڈم زویا اب اس کی بات سمجھ رہی تھیں۔

"وہ آج کل پارک نہیں آرہی، اور ریحان بھی نہیں آرہا۔ پتا کروائیں کہ کیوں نہیں آرہی کیا ہوا اسے۔" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ اس کے گھر جائیں۔"

"جی......"

"پھر ہم خود اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائیں گے۔" خرم سنجیدہ تھا۔

☆☆☆

اگلے دن زویا نے فون کرکے خرم کو بلوایا اور جو بتایا اس نے خرم کو ساکت کردیا۔

"اس نے ایک اور دفعہ خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس بار اسے مارنے کی کوشش میں سیڑھیوں سے دھکا دیا گیا ہے۔ اس کے پاؤں میں اور بازو میں چوٹ لگی ہے۔ بہت کمزور ہوگئی ہے وہ۔"

"ایسا کیوں ہوا، آپ ملیں اس سے جاکر؟"

"نہیں، میں ملنے گئی تھی مگر کہہ دیا گیا گھر میں کوئی نہیں ہے میں باہر کھڑی مالی، ماسی کا انتظار کرتی رہی تو پھر ماسی نے مجھے سب بتایا۔" خرم کو ملال ہوا۔

"کوئی جھگڑا ہوا تھا گھر میں؟"

"شاید۔"

"ہوں......تو آئندہ چند دن تک وہ پارک نہیں آئے گی۔ اس کی زندگی کو خطرہ بھی تو ہوسکتا ہے، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" میڈم زویا خاموش رہیں۔ خرم کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ خدا حافظ کہہ کر اٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ سیدھا پاپا کے اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر شہریار احمد ڈاکٹرز کے پینل کے ساتھ مصروف تھے۔ وہ گھر چلا آیا نشاط کا مسئلہ اسے اپنا مسئلہ لگ رہا تھا۔ دل سے بے حد قریب اسے جلد سے جلد حل ہونا چاہیے۔

ایک بے چینی، ایک اضطراب نے وجود کو حصار میں لے لیا تھا۔ دنیا کتنی بے حس ہوگئی ہے اپنوں کے خون کس قدر سفید ہوگئے ہیں۔ انسانیت مرگئی ہے کیا یا پھر قربِ قیامت کے آثار ہیں۔ وہ اپنے کلینک میں بیٹھا کتنی دیر تک سوچتا رہا۔

☆☆☆

"ہوں۔" رات پاپا سے نشاط کیس کو ڈسکس کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"اس وقت ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ آفندی دبئی گیا ہوا ہے۔"

"کیا......!" خرم کو جھٹکا لگا۔ "آپ کے دوست پاکستان میں نہیں ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تو اس کی زندگی کو اور خطرہ ہے پاپا۔ اس کے اپنے، اس کے بھائی اسے ماردیں گے یا پھر اسے اتنا ٹارچر کریں گے کہ وہ زہر کھالے اور ان پر الزام بھی نہ آئے۔ پاگل تو تھی ہی ہم کیا کرتے۔" ڈاکٹر شہریار احمد بھی ساکت ہوگئے۔

"ہاں، ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ میں آفندی سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے سیل فون اٹھایا مگر کال نہ مل سکی۔

☆☆☆

فضہ اور امی آگئی تھیں گھر کی رونقیں بحال ہوگئیں۔

"میں واپس آگئی ہوں اور تم مجھ سے ملنے نہیں آئے۔" علینہ کا فون آیا تو ناز سے کہا۔

"تو تم کون سا میرے کہنے پر آئی ہو۔ سارا فیصل آباد دیکھ کر ہی آئی ہوناں۔"

"تمہارے پُرزور اصرار پر ہی آئی ہوں۔ نکلس دیر سے ہوئیں تو میں کیا کرتی۔"

"پھر تم کب آرہے ہو؟"

"بہت مصروف ہوں۔" اس نے نخرہ دکھایا۔

"ناراض بھی ہو؟" وہ ہنسی۔

"پتا نہیں۔"

"مجھے پتا ہے، آئی ایم سوری۔ خرم میں کیا کرتی میں تو اڑ کر آنا چاہتی تھی مگر کیا کرتی میرے پر ہی نہیں ہیں۔"

"اللہ رے خوش فہمی۔" وہ زور سے ہنسا۔

"تم سے ہی ہے خوش فہمی۔"

"کہتی تم خود کو پری ہو۔"

"ہاں تو اور۔" اس کے انداز میں ناز تھا۔

"تمہاری پری۔" خرم ہنس دیا۔

☆☆☆

اور اس دن جب سخت سردی تھی ہر سو کہر کی چادر تھی۔ ایک دھند بھرا ٹھنڈا دن تھا جب میڈم زویا کا فون آیا اور ان کی دی ہوئی اطلاع نے خرم کو ساکت کردیا۔

نشاط کے بے رحم بھائیوں نے نشاط کو پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھجوادیا تھا۔ اس کے والد بیرون ملک تھے۔

"بھائیوں کی بے حسی، بھائی تو بہنوں کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ زویا یہ کیسے بھائی ہیں محض جائداد کے حصے کے لیے..... کتنے دن کھالیں گے، کتنا بڑھالیں گے۔" خرم کے لہجے میں ملال ہی ملال تھا۔

"نشاط کو ہماری ضرورت ہے، چلو تم پہنچو میں بھی آرہا ہوں۔" وہ فون بند کر کے بھاگا۔

"پاگل خانہ۔" خرم نے بھائیوں کی اس بے حسی پر کانوں کا ہاتھ لگایا۔ وہ دونوں ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے۔

ہنستے، روتے، ایک دوسرے کو مارتے، بال نوچتے، کونے میں بیٹھ کر سوچتے، درخت کے گرد گول گول چکر لگاتے۔ ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں بھاگتے لوگ..... یہ پاگل تھے۔ ایک عورت چیخ چیخ کر رو رہی تھی، بال نوچ رہی تھی۔ دوسری عورت ہنس رہی تھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر..... یہ پاگل خانہ تھا۔ ان سب کے درمیان وہ ڈری، سہمی، بھیگی ہوئی چڑیا جیسی لڑکی کونے میں دبکی فاختہ ایسا وجود اور کانپتا جسم۔

"نشاط.....!" زویا نے ایک دم پکارا۔ وہ جھٹکے سے پلٹی۔

"نشاط.....!" زویا آگے بڑھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ آگے بڑھی اور زویا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں پاگل نہیں ہوں۔ دیکھو..... دیکھو میں ٹھیک ہوں۔ میں بولتی ہوں، محسوس کرتی ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں زویا..... زویا ان لوگوں نے مجھے پاگل خانے بھجوادیا۔ زویا میں مرجاؤں گی۔" وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ خرم نے منہ پھیرلیا۔

"زویا وہ میرے بھائی تھے۔ زویا، وہ کہتے تو میں مرجاتی یا مجھے مار ہی ڈالتے مگر ایسی ذلت۔" وہ سسک رہی تھی۔

"میرا کوئی عمل ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ زویا میں مرجاؤں گی مجھے لے جاؤ یہاں سے۔" روتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑے۔ زویا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اسے چوما۔ آنسو تھے کہ دونوں کی آنکھوں سے امنڈ رہے تھے۔

"میں..... میں لے جاؤں گی تمہیں یہاں سے، چلو۔" اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر وہ پلٹی۔

"نہیں..... آپ ان کو کہیں نہیں لے جاسکتیں۔" تینوں پلٹے۔ کچھ فاصلے پر ایک عورت سفید گاؤن پہنے کھڑی تھی۔

"کیوں؟"

"یہ پاگل ہیں۔ ان کے گھر والوں نے کہا ہے خطرناک پاگل جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اذیت دیتے ہیں۔ گلا گھونٹ سکتے، مار سکتے ہیں، زخمی کرسکتے ہیں۔"

"زویا!" نشاط نے سہم کر زویا کے بازو دبوچ لیے۔

"نہ..... ہی..... نہیں..... میں پاگل نہیں ہوں زویا۔"

"ماروی..... ماروی، اسے اندر لے جاؤ۔" انہوں نے پیچھے مڑ کر آواز دی۔

"نہیں..... نہیں..... زویا مجھے بچالو۔" وہ مچل مچل کر رو رہی تھی۔ زویا کے آنسو بھی نہیں تھم رہے تھے وہ اسے سنبھال رہی تھی۔

"نشاط..... نشاط خود کو سنبھالو۔ ہم ہیں تمہارے ساتھ۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں بات کرتی ہوں ڈاکٹر سے۔" وہ ننھے بچے کی طرح زویا میں چھپ رہی تھی، سمٹ رہی تھی۔ خرم دل سنبھال کر باہر نکل گیا۔ ایسی بے حسی، ایسی بے اعتنائی، اپنوں کے دیے ایسے دکھ اور ایسی بے نیازی۔ خرم کا دل درد سے بوجھل تھا۔

پاپا کو فون کیا تو انہوں نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور بے ہوش، نیم جاں نشاط کو پاگل خانے سے منسلک نفسیاتی اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ آفندی صاحب کے آنے تک اسے اُدھر ہی رہنا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی مگر یہاں رہ کر ہوجاتی۔ سارا دن زویا اس کے پاس رہتی تھی۔ میڈیسن کے زیرِ اثر وہ غنودگی میں تھی۔ اس کے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ آنکھ کھولتی اور بند کرتی۔

وہ شام کو ماما اور فضہ کو لے آیا۔ فضہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔

"یہ تو نشاط آپی ہیں، آفندی صاحب کی بیٹی۔"

ماں اور باپ کی خودغرضی نے اس گھر کو بکھیر دیا۔ کوئی بھائی بہن ایک دوسرے کا نہیں تھا صرف اپنے مفاد کا سوچتے ہیں۔

ڈاکٹرز اسے چیک کرنے آئے تھے۔ نرس اسے انجکشن لگانے لگی۔

"یہ شدید ٹینشن اور خوف کے زیرِ اثر ہیں۔ نروس بریک ڈاؤن کا خدشہ تھا۔ انہیں سکون کی اشد ضرورت ہے۔" باہر نکلتے ہوئے ڈاکٹر واثق نے خرم سے بات کی۔

"انہیں خوف اور خدشوں سے باہر نکلنا ہے وگرنہ ان کا دل اچانک بند ہوسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ان کے سامنے ان لوگوں کو، ان حالات کو نہ لائیں جنہیں دیکھ کر یہ خوف زدہ ہوکر اذیت کا شکار ہوں۔" خرم سر جھکائے سنجیدگی سے سنتا رہا۔

"انہیں پُرسکون ماحول کی ضرورت ہے۔" جاتے جاتے تشفی بھرے انداز میں کہا اور آگے بڑھ گئے۔ خرم ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اپنوں کی بے حسی نے اسے بے حد ہرٹ کیا تھا بھلا کوئی اس حد تک بھی جاسکتا ہے۔

☆☆☆

آج نشاط کی آنکھ کھلی تھی تو وہ قدرے پُرسکون تھی۔ ادویات نے بہتر نتیجہ دیا تھا۔ کمرے میں صرف خرم تھا۔ وہ بھی ابھی آیا تھا۔ زویا پہنچنے والی تھی۔ اس کا فون آیا تھا اسے دیکھ کر نشاط چونک گئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ بیڈ کے قریب آگیا۔

"آ..... آپ؟" وہ پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں آپ کا معالج، خرم شہریار احمد۔ اب کیا محسوس کررہی ہیں آپ؟" وہ کیس شیٹ پڑھنے لگا۔

"ز..... زویا....."

"آئی ہوئی ہیں ابھی باہر گئی ہیں۔" اس نے تسلی دی۔ اس نے آنکھیں موندلیں۔ بند آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

"رونا، کمزوری اور بے بسی کی علامت ہے مس نشاط۔ خدا اپنے بندوں کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے۔ عقل و شعور، آگہی و ادراک اسی لیے اسے بخشا گیا ہے۔" جبھی زویا اندر آگئی۔

"اٹھی نہیں ابھی تک؟"

"جاگ گئی ہیں مگر آنکھیں نہیں کھولیں گی کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے نظریں چرا کر دامن بچانے کی۔ حالات کو فیس نہیں کرنا چاہتے یا پھر یہ کہ ہر دم کوئی ان کی انگلی پکڑ کر چلتا رہے۔" نشاط نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ خرم، زویا کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"زویا یہ بات انہیں سمجھانی ہے کہ انسان کو رہبر، رہنما کے مانند ہونا چاہیے۔ مضبوط قدموں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے کہ کوئی ہمارے قدموں سے زمین نہ کھینچ سکے اپنے ہوں یا غیر...... اپنے حق کے لیے لڑنا چاہیے۔" خرم کے لہجے کی مضبوطی نشاط کے دل کی زمین ہلا رہی تھی۔

زویا، نشاط کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ شام کو آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

"کیسی ہو تم؟" زویا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کون ہے جو یوں دیدہ دلیری سے مجھ سے مخاطب ہوتا ہے؟" نشاط پوچھنا چاہتی تھی مگر زبان گنگ تھی۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کل انکل آرہے ہیں ان لوگوں سے خود ہی نمٹ لیں گے۔"

"زویا، میں پاگل نہیں ہوں۔ میں ان کی خوشیوں کے لیے خاموش رہتی ہوں۔ یہ لوگ مجھے ٹارچر کرتے ہیں۔ بھابی نے مجھے دھکا دیا۔ ریحان نے میری ٹانگ پر بیڈ مار دیا۔ ان کی زندگی میں میری ضرورت نہیں ہے۔" دھیرے دھیرے بولتے وہ ہلکان ہوگئی تھی۔ اس کا گلا رندھ رہا تھا۔ آواز بھرا رہی تھی۔

"میں مرنا چاہتی ہوں، موت بھی نہیں آتی۔"

آنسو بھل بھل گرنے لگے۔

"زویا...... زویا مجھ پر میری موت آ[...] کیوں نہیں ہوجاتی اور کتنے امتحانوں سے [...] آزمائشوں سے گزرنا ہے۔" زویا نے اس کے [...] سہلاتے، آنسو پونچھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔

"خدا بندوں کو ان کی برداشت و ہمت سے بڑھ کر آزمائش نہیں دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آخری حد تھی، اب تمہارے سکھ کا سویرا طلوع ہوگا۔ اِک [...] زندگی تمہاری منتظر ہے۔" تبھی دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ دونوں ہڑبڑا گئیں۔ دہشت سے نشاط [...] آنکھیں پھٹنے لگیں، چہرے پر فرعونیت لیے اس [...] بھائی کاشف اس کی جانب بڑھا۔

"تم...... تم......؟" زویا کے قریب آرکا۔ "تمہاری یہ ہمت کہ تم اسے اِدھر لے آؤ۔ [...] تمہارا اسکول بند کروا دوں گا اور تم ......" اس نے جھٹکے سے نشاط کا ہاتھ کھینچ کر اٹھایا۔

"تم پاگل ہو اور پاگل رہو گی [...]"

"بھا...... ئی......" وہ سسکی۔ "نہیں...... نہیں۔"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔"

"مار دو، مجھے جان سے مار دو۔ میری زندگی [...] ہوجائے، میں مر جاؤں۔" وہ زور سے چیخی۔ پوری طاقت سے کاشف نے اسے گھما کر تھپڑ مارا۔ لڑکھڑا کر وہ بیڈ سے نیچے گری۔ لوہے کے بیڈ کا کونا اور سیٹ کا کونا ایک ساتھ وجود میں نشتر چبھو گیا۔ ماتھے سے اور آنکھ کے پاس سے خون نکلنے لگا۔

"بولتی ہے ہمارے آگے...... میں اسے لے کر جا رہا ہوں اب اگر اُدھر سے لانے کی جرأت کی [...] میں تجھے بھی اُدھر پاگل خانے میں پہنچا دوں گا۔" دانت پیستے ہوئے وہ فرعونیت سے گرجا۔

"جرأت...... میری جرأت اور بہادری [...] تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ میں نشاط نہیں زویا علی [...] ہوں۔" زویا غرائی۔ "تم بے غیرت بھائی ہو [...]

اس کے لیے ڈھال بنوں گی۔ لے جا سکتے ہو تو لے جا کر دکھاؤ۔" یہ کھلا چیلنج تھا۔

کاشف غراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ خون آلود چہرے کے ساتھ نشاط سسک رہی تھی۔

"مجھے چیلنج کر رہی ہے...... مجھے!" وہ غرایا۔

"ہاں...... غنڈے، اوباش تجھے کھلا چیلنج کر رہی ہوں۔" زویا ذرا نہیں ڈری۔ کاشف نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور نشاط کو کھینچتا ہوا باہر لے جانے لگا۔

"یہ پاگل ہے۔"

"نہیں...... نہیں میں پاگل نہیں ہوں بھائی۔ میں پاگل نہیں ہوں۔" دروازے سے باہر نکلتے ہوئے مڑ کر کاشف نے زویا کو دیکھا اور شیطانیت سے مسکرایا۔ یہ دیکھے بغیر کے باہر اسپتال کا عملہ کاریڈور میں کھڑا ہے۔

وہ اسٹریچر پر بے ہوش پڑی تھی۔ خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ کلائی کے پاس سے ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ وارڈ بوائے نے سختی سے پکڑ کر دبایا ہوا تھا۔ اسٹریچر کو وارڈ بوائے دھکیلتے ہوئے ایمرجنسی میں لے گئے۔

☆☆☆

ایک چپ تھی جس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک خاموشی تھی جو اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئی۔

ناخن کاٹتی، ہاتھ مسلتی رہتی یا پھر چپ چاپ ٹکٹکی چھت کو تکنے جاتی۔ زویا اٹھا کر بٹھاتی تو گھٹنوں پر سر گرا لیتی۔ خرم اس کے پاس آکر کھڑا ہوتا تو نگاہ نہ اٹھاتی۔ وہ اس کا کتھارسس کرنا چاہتا تھا شاید کوئی بول، کوئی لفظ، کوئی جملہ اسے جھنجوڑ دے، جگا دے اس کے اندر جینے کی امنگ پیدا کر دے۔

باپ نے بھی آکر ڈھیروں پیار کیا تھا۔ اپنے ہونے کا تحفظ دیا تھا، احساس دلایا تھا مگر اس کی شکست کی ٹوٹ پھوٹ دنوں میں نہیں سمٹ سکتی تھی۔

یوں آئینۂ خیال میں آنے لگا ہے چاند
پھر سے جمال یار دکھانے لگا ہے چاند
قلب و نظر میں آج سمانے لگا ہے چاند
آنچل میں میرے خواب سجانے لگا ہے چاند
بے تابیوں کا حال سنانے لگا ہے چاند
جو رازِ عشق ہم سے چھپانے لگا ہے چاند
اپنے حسیں وجود پر خوشبو کو اوڑھ کر
اس دل کے آسمان پر چھانے لگا ہے چاند
پہلے تو ہم سفر تھا اب چارہ گر ہوا
دیکھو قریب کتنا آنے لگا ہے چاند
بے چینیوں کے موسم نہ اشکبار کر دیں
یہ سوچ کر ہی جی کو جلانے لگا ہے چاند
چاہت، وفا، خلوص اور دوستی لیے
بنجر دلوں میں پیار کھلانے لگا ہے چاند
آئی ہے اب کے عید تو کتنا بدل گیا
روٹھے ہوؤں کو آج منانے لگا ہے چاند

مرسلہ: بشریٰ، دہاڑی

اس کے ظاہری زخم بھرنے لگے تھے مگر دل کے گھاؤ رِستے رہتے بس چپ چاپ کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر دیکھتی رہتی۔

☆☆☆

"دوسرے اگر ہمیں کمزور سمجھیں تو ہمیں بالکل کمزور نہیں پڑنا چاہیے۔ نشاط آپ نے خود کو کیوں ہار دیا ہے اپنوں کی خاطر...... آپ کیوں سینہ سپر نہیں ہوئیں، اس گھر پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کا۔ زندگی پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا دیگر لوگوں کا۔ آپ کیوں اللہ کی عطا سے ناشکری کرتی رہیں۔ اپنے آپ کو اتنا لاچار کیوں سمجھ لیا۔ دوسروں کو اتنا حق نہیں دینا چاہیے کہ وہ ہماری زندگی کے اچھے برے سب کے ذمے دار بن جائیں۔" خرم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا اسے سمجھا رہا تھا اور وہ سر جھکائے ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

"آپ اپنی زندگی میں ابھی تک اس ننھی بچی

کی طرح کھڑی ہیں جس کے والدین بھرے میلے میں بچھڑ جاتے ہیں اور وہ ان کے آنے کی منتظر ادھر ہی جم جاتی ہے۔'' خرم بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''والدین کے آپس کے ٹوٹے رشتے کبھی نہیں جڑتے۔ دونوں کی انا کی سزا بچے بھگتے ہیں اور بچوں کو اپنے لیے خود ہی فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ آپ پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہیں نشاط مگر آپ نے خود کو ہار دیا۔'' خرم کے لہجے میں تاسف تھا۔ نشاط نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں خوف ہلکورے لے رہا تھا۔

''والدین نے آپ کو چھوڑ دیا مگر باپ نے تعلیم کے زیور سے تو آراستہ کیا تھا ناں۔ آپ کے اندر ہمت تو تھی ناں...... خدا کے وجود کی طاقت تو تھی ناں۔ انسان کو انسان کی محبت کمزور کر دیتی ہے مگر خدا کی محبت تو انسان کو طاقت دیتی ہے۔ آپ مصروفیت کو اپنی ڈھال بنا لیتیں۔ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے خالی گھروں میں آسیب سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں اپنی شخصیت کو مسخ کر دیا۔ آپ ہمت تو کرتیں اپنی تنہائی سے لڑتیں، اب دیکھ لیا اپنے بے بس ہونے کا انجام۔ یہ یاد رکھیے انسان اگر خود کو کمزور و بے بس سمجھ لیتا ہے تو دنیا والے اسے مزید بے بس کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے انسان میں کتنی طاقت و صلاحیت ہے۔'' خرم رک گیا تھا۔ سسٹر کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے میڈیسن دینے اور بی پی وغیرہ چیک کرنے کے لیے۔ اس کے لیے مثبت سوچوں کے در وا کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

وہ آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لوٹنے لگی۔ اس کے وجود پر جما گلشیئر خرم کی باتوں نے پگھلا دیا۔ وہ بہت توجہ سے اسے سننے لگی تھی۔ وہ واقعی مسیحا تھا۔ اگرچہ وہ کافی ہمت کر رہی تھی مگر ماضی کسی فلم کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ اپنوں کے رویے، ان کے لہجے اور پھر نشتر چبھوتے جملے...... وہ کیسے ڈھیٹ بنی رہی کہ کسی کے جملوں کا اس پر اثر نہ ہوتا۔

ڈاکٹر شہریار نے اسے کہا تھا سو اسے ڈسچارج کروا کر اپنے گھر ہی لے آئے۔ آفندی صاحب شرمندہ تھے مگر دوسری بیوی کی وجہ سے بیٹی کو ساتھ نہیں رکھ پائے۔ ماما بھی اس کی دلجوئی کرتی رہتیں۔

☆☆☆

''سنا ہے تمہارے گھر نیا مہمان آیا ہے؟'' ہیلو کے جواب میں علینہ کا شرارت سے بھرپور جملہ اسے سننے کو ملا تو اس کی بھی رگ شرارت پھڑکی۔

''توبہ کرو لڑکی، مجھے اتنا لوز کریکٹر سمجھ لیا ہے۔'' اس کے آگے جو خرم نے کہا تو وہ خاموش ہو کر رہ گئی اور خرم عالم تصور میں اسے شرماتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''میں کتنی بدنصیب ہوں ناں۔'' اس روز وہ زویا سے کھل کر اپنے دل کی باتیں کر رہی تھی۔

''دیکھو میرا اپنا گھر ہے اور میں یہاں غیروں کے گھر پڑی ہوں۔''

''نہیں، ایسا نہیں سوچتے نشاط، جہاں محبت ملے وہ گھر...... وہ لوگ اپنے ہوتے ہیں۔ جہاں تحفظ، اپنائیت ہو گھر وہ ہوتے ہیں۔ تمہارے اپنے ذاتی گھر کو تمہارے گھر والوں نے مکان بنا دیا۔ وہاں محبت نہیں ہے، ضرورتیں ہیں، نفسا نفسی ہے، ریاکاری، منافقت ہے۔ جہاں بہن محفوظ نہیں بھلا گھر کیسے ہوا؟ خود کو بدقسمت مت کہو۔ رب ناراض ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈاکٹر شہریار احمد کی فیملی بہت اچھی لگی ہے ان کی مسز، ان کی بیٹی اور پھر ڈاکٹر خرم...... سب کتنے اچھے اور محبت کرنے والے ہیں۔ دیکھو دنیا اچھے انسانوں سے خالی نہیں۔ مجھے بھی ان لوگوں سے مل کر از حد خوشی ہوئی ہے۔ میرا بس چلے تو میں تمہارے ساتھ رہوں۔'' وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے خوشگوار باتیں کر رہی تھی۔

''آپ اسی گھر میں رہیں۔ اس گھر کو دوسرا میکا سمجھیں سسرال تو کہہ نہیں سکتا۔'' خرم جانے کب آ گیا تھا۔ زویا خفت زدہ سی ہو گئی۔

''اور نشاط صاحبہ آپ کیسی ہیں؟'' تبھی ملازم کے آگے فضہ چلتی آ گئی۔

''چائے۔'' خرم چائے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''آ جائیں بھئی، اپنا ہی گھر سمجھیں ہم تو آتے جاتے لوگ ہیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ زویا اٹھ کر چائے بنانے لگی اور نشاط سب کچھ دیکھتی رہی۔

''اس گھر میں کتنی اپنائیت اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔'' وہ سوچنے لگی۔

وہ تو اس کا غیر محسوس طریقے سے علاج کر رہا تھا۔ پاپا کے ساتھ نشاط کا کیس تفصیلی ڈسکس کرنے کے بعد اس نے نشاط کے لیے کچھ مصروفیات مرتب کیں۔ کبھی ادبی کتب اسے لا کر دیتا، اخبار پڑھنے کا ٹائم اور رات میں باقاعدہ روز کی خبروں پر ڈسکشن تا کہ اس کی دلچسپی جانچ سکے۔ ایک دن خرم نے اسے چند کوکنگ بکس لا کر دیں۔

''نشاط ایسا کرو فضہ کے ساتھ مل کر کوکنگ کرو ماما اور پاپا judge کریں گے کہ کس نے اچھا بنایا۔'' وہ صرف اسے مصروف رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ اپنے خود ساختہ خول سے باہر نکلے۔

خرم کا انداز، اس کا رویہ، اس کا لہجہ...... نشاط کے گرد خوشبو بکھیرنے لگا۔ کوئی ایسا ہو جو ہمیں اپنے، ہمارا دھیان رکھے، ہماری فکر میں مبتلا ہو کتنا اچھا لگتا ہے۔ آنکھیں موند کر اس نے ریلنگ سے سر ٹکا دیا۔

محبت...... ایک بار پھر محبت اس کے قریب آنے لگی۔ خوشبو پھیلانے لگی۔ اپنا آپ منوانے لگی۔

☆☆☆

صبح اس نے کلینک جاتے ہوئے دیکھا وہ کچن میں ماما کے ساتھ تھی۔ دوپہر میں فون کیا فضہ نے بتایا۔ ''لاؤنج میں بیٹھی کتابیں پڑھ رہی ہے پھر لان میں ہی بیڈمنٹن کھیلتے رہے۔ ماما کی مدد سے انہوں نے چکن شاشلک بھی بنایا۔''

''گڈ، فضہ اسے مصروف رکھا کرو۔ مصروفیت اس کے لیے بہت ضروری ہے خالی بیٹھے تو ہرٹ ہوتی رہے گی۔''

ڈاکٹر شہریار احمد کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تھا مگر رات میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھتے۔ رات میں شہریار ولا کے لاؤنج میں جمی گھریلو سی محفل اسے بڑی اچھی لگتی۔ شرارتیں، باتیں سارے دن کی روداد ایک دوسرے کو سنانا۔ آنٹی، انکل کی باتیں۔ فضہ کے لاڈ، آئسکریم کی فرمائش اور خرم کا ایک دم سے اٹھ جانا۔

''چلو کیا یاد کرو گی کس سخی سے پالا پڑا ہے۔''

یہ حقیقی دنیا اس کے خوابوں کی دنیا تھی۔ کاش، کاش...... یکایک احساس محرومی اس کے اندر ہلکورے لینے لگتا۔ آنکھیں بھیگنے لگتیں۔ نشاط کو پتا ہی نہیں چلا وہ رفتہ رفتہ بہتری کی جانب گامزن تھی۔

اس روز ڈیڈی اس سے ملنے چلے آئے۔ خرم، فضہ اور نشاط باہر گئے ہوئے تھے۔

''مجھے آپ سے بہت شکایت ہے بھائی۔ آپ نے اتنی اچھی بچی کی زندگی ختم کر دی۔'' بیگم شہریار کی آج پہلی بار سرمد آفندی سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے سر جھکا لیا اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

ہم اپنی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے بچوں کو کیوں بھول جاتے ہیں...... بچے جنہیں ہم ہی اپنی رضا سے اپنی زندگی میں لاتے ہیں اور پھر لاوارث بنا کر چھوڑ دیتے ہیں، ہمارے قصور کی سزا بچے سہتے ہیں۔ جو ہم بچوں کو دیتے ہیں جس طرح کی تربیت کرتے ہیں بچے ہمیں وہی تو لوٹاتے ہیں۔ آج انہیں اس بات کا احساس ہو رہا تھا مگر کیا فائدہ اس احساس

کا جب عمر کی نقدی ختم ہونے کو ہے۔
''بہت ترس آتا ہے مجھے نشاط پر۔''
''بس اپنے لیے اب میں اسے بچالینا چاہتا ہوں مجھے بھی اس کے دکھ کا احساس ہے۔ بس اب کسی کی زیادتی برداشت نہیں کروں گا۔''
''تجھے بھی بڈھے ہوکر عقل آئی ہے۔'' ڈاکٹر شہریار احمد ہنسے، وہ بھی ہنس دیے بیگم شہریار چائے بنانے کے لیے اٹھنے لگیں۔
''کاشف کو عقل آئی ہے یا نہیں؟''
''عقل آئے گی تو عاق کا فیصلہ واپس لے لوں گا۔ نشاط کی تباہی و بربادی کا وہی ذمّے دار ہے۔ اپنے پاگل، اپاہج سالے سے شادی کرنے لگا تھا۔'' سرمد آفندی نے غصے سے کہا۔
''میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری بیٹی کو ٹوٹنے، بکھرنے سے بچا کر ایک نئی زندگی دی۔ جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ کاشف نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بے حس بھائی۔''
''ہم بچوں کو بے حس کہتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں ہم نے تربیت میں کہاں کمی کی ہے۔ جو لوگ اپنے لیے جیتے ہیں ان کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر شہریار احمد صرف سوچ کر رہ گئے۔
چائے نشاط لے کر آئی تھی۔ ہر بار ملنے پر نشاط انہیں بہتر لگتی تھی۔
''کاش اس کی اچھی جگہ شادی ہوجائے۔'' ان کے دل سے دعا نکلی۔
خرم خوش تھا کہ اس میں مثبت تبدیلیاں آرہی ہیں۔ مصروفیت اس کے لیے خوش آئند تھی پھر فضہ نے اس کے ڈپریشن کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم یہ لوگ اس کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے اور یہی وقت اس کے لیے فیصلہ کرنے کا تھا۔

☆☆☆

نشاط کے ہاتھ میں وہ سارے پھول تھے جو اس نے ابھی ابھی سبز مخملی گھاس سے چنے تھے۔ صبح کے اس اجالے میں آج وہ خود کو بہت اچھا اور بہت خوش محسوس کررہی تھی اور ان پھولوں کو دیکھتے ہوئے اسے بے اختیار ارقم یاد آیا۔
''محبت...... اس کی پہلی محبت۔ کیسی جنونی اور نڈر تھی وہ...... ارقم اسے مل جاتا اگر...... اگر عریشہ اس کی محبت پر شب خون نہ مارتی۔ اگر ارقم کو اس سے واقعی محبت ہوتی تو اسے ضرور ملتی مگر وہ تو کرتی تھی ناں۔
ہمیں اس محبت کا سوگ نہیں منانا چاہیے جو ہماری نہیں ہوتی۔ اس نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا تھا ایک وہ جو اس کے بہت اپنے تھے، ایک وہ جو اپنے نہیں تھے۔
اکثر محبتیں اس لیے بھی ناکام ہوتی ہیں کہ ہم انہیں غلط ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں۔ کیا محبت کرنے کے لیے بہترین انتخاب ہونا چاہیے...... مگر محبت تو بس ہوجاتی ہے سوچے سمجھے بھی بھلا محبت ہوتی ہے۔ یہ تو انتخاب ہوا محبت تو نہ ہوئی۔ محبت تو لافانی جذبہ ہے جو دل کی زمین پر خود بخود ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی اچھائی یا برائی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ بقول اشفاق احمد کسی کا نہ اچھا لگنا بھی محبت ہوتی ہے یعنی اس میں کچھ ناپسندیدگی بھی ہے جو محبت میں ڈھل جاتی ہے۔
تبھی سیڑھیاں اترتا خرم اسے دیکھ کر رک گیا۔ وہ مسکرادی۔
''کیسی ہیں آپ؟''
''ٹھیک۔''
''صرف ٹھیک نہیں، انسان کو فٹ ہونا چاہیے۔''
''ہوں۔'' وہ آگے بڑھا۔
''پھر کیا سوچا آپ نے؟''
''کس بارے میں؟''
''اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں۔''
سر جھکا کر اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

''اس بارے میں ابھی میں نے سوچا نہیں ہے۔''
''کب سوچیں گی۔'' وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا نشاط لان چیئر پر بیٹھ گئی۔ خرم بھی ذرا فاصلے پر چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔
''صرف سوچنے اور خیالی پلاؤ پکانے سے کوئی کام نہیں چلے گا۔''
''تو......؟'' نشاط نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
''اس لیے تم نے اچھا نہیں کیا کہ صرف سوچتی رہیں...... عمل اور بس عمل کی ضرورت ہے۔ خود ترسی اور خود رحمی کے حصار سے نکل آؤ۔ ایک بہتر زندگی تمہاری منتظر ہے۔''
خرم ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھا رہا تھا۔
''کل میں آپ کو ایک سرپرائز دوں گا۔'' خرم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''کیا......؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
''بوجھو تو جانیں۔''
''میں بتاؤں؟'' فضہ آدھمکی۔
''اوئے۔'' خرم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔
''بھائی صرف اتنا سا بتانے دیں کہ نشاط یہ سرپرائز بھائی کی زندگی کا اہم فیصلہ ہے۔''
''فضہ......!'' اس نے گھورا وہ کھلکھلا کر ہنسا کئی دیپ نشاط کے اندر جلنے لگے۔
''خوشیاں، مکمل خوشیاں اس کی ہونے والی ...... محبت...... محبت اب وہ شادی کے بعد کرے ...... خوش خبری، سرپرائز، اہم فیصلہ۔'' نشاط سر جھکا کر مسکرادی۔
زندگی کا تھکا دینے والا سفر ختم ہوگیا تھا۔ اب تو نئے دیپ جلنے تھے ان دیپوں کی حفاظت تو وہ سب سے بڑھ کر کرے گی۔
اس کا سارا دن بہت خوشگوار گزرا۔ آنے ...... کا احساس اسے گدگداتا رہا۔ خرم بہت اچھا ...... سب سے مختلف، اچھے کردار کا، پڑھا لکھا، باشعور، اس کے خوابوں کے آئیڈیل جیسا۔ رات خوب ہنستے گزری۔
صبح زویا کو خواہ مخواہ فون کرکے ہنستی رہی۔ اسے آنے کا کہا۔ اس کا خوشگوار موڈ زویا کو مطمئن کرتا رہا۔
''بینک کی جابز آئی ہیں، تم اپنا سی وی دے دو۔'' زویا نے کہا۔
''ٹھیک ہے زویا تمہارے پاس ہی تو ہے تم دے دو۔'' اس کا موڈ خوشگوار تھا جو زویا کو مطمئن کرگیا۔
اس روز زویا نے صدق دل سے نشاط کے لیے خوشیوں کی دعا کی تھی مگر بعض اوقات دعائیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ زویا گھر آگئی تھی۔ نشاط کے موڈ کی خوشگواریت کو دیکھ رہی تھی۔
''آج کوئی خاص بات ہے کیا؟''
''نہیں تو۔'' کتابیں الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔
''لگتا ہے اپنی زندگی کے لیے سیریس ہوگئی ہو۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔''
''پھر کیا کرنا ہے؟''
''زویا......'' وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ خرم صاحب کے گھر والے، انکل، آنٹی مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے ان کے درمیان۔ فضہ کا رویّہ تو بالکل بہنوں جیسا ہے۔'' کتاب کے کنارے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سکون سے کہہ رہی تھی اس کی چمکتی آنکھوں اور چہرے کی الوہی چمک نے، ہونٹوں کی مسکراہٹ نے زویا کو چونکا دیا۔
''نشاط......!'' کسی خوف نے اسے پکارا۔
''زویا، میرے خوابوں میں ایسا ہی آئیڈیل گھر تھا۔ میں اپنے پیرنٹس کی آئیڈیل زندگی تو کبھی نہیں دیکھ سکی مگر میں اپنی زندگی کو آئیڈیل زندگی بناؤں

گی۔ آئیڈیل گھر، آئیڈیل شوہر، آئیڈیل بچے۔" جذب کے عالم میں وہ بولے جارہی تھی اور زویا خوف کی آہنی شکنجے میں کستی جارہی تھی۔

"نشاط!" زویا آگے بڑھی۔ بڑھ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی۔ "ایسے خواب مت دیکھو۔ مسیحا فرشتہ ہوتے ہیں اور فرشتے زندگیوں کو خوب صورت بناتے ہیں، ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہوش میں آؤ۔ حقیقت کی آنکھ سے زندگی کو دیکھو، نشاط۔" نشاط کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ کوئی چیز زویا کا دل چیرنے لگی۔

"آؤ زویا نیچے لان میں چلیں۔" زویا کا ہاتھ تھام کر وہ نیچے لان میں آگئی۔ نشاط کا دل دھک، دھک کررہا تھا۔ سرپرائز...... کون سا سرپرائز ہوگا، کیسا ہوگا۔ ہتھیلیاں پھیلا کر اپنے ہاتھ کی انگلیاں دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر دبیز مسکراہٹ تھی۔ تبھی گیٹ کھلا اور گاڑی اندر آگئی۔

فرنٹ سیٹ پر خرم بیٹھا تھا۔ نشاط مبہوت انداز میں اسے باہر نکلتے، ہنستے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک......! زویا نے نظریں چرالیں۔ فضہ اتری اور اس کے ساتھ ہی علینہ اتری۔

"نشاط، تمہارے لیے سرپرائز، بوجھو تو جانیں۔" علینہ کا ہاتھ تھام کر فضہ، نشاط کے سامنے کھڑی ہوئی۔ ذرا فاصلے پر ہاتھ سینے پر باندھے خرم بھی آرہا تھا۔ زویا دیکھ رہی تھی نشاط، خرم کو دیکھ رہی تھی۔

"میں بتاتا ہوں۔" وہ قریب آگیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کرواتی ہوں تعارف۔" فضہ نے منہ بنایا۔

"سنو ناں، میں بہت اچھا کرواؤں گا۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"اچھا چلیں آپ ہی کروالیں۔" فضہ نے ہتھیار ڈالے۔

"یہ پہلے پاگل تھیں، میں نے ان کا علاج کر کے ان کو نارمل کیا ہے۔ اب بھی اکثر چیختی چلاتی ہیں اور کبھی کبھی تو نیچے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔" خرم بول رہا تھا۔ علینہ سر گھما کر خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پہلے میں، میں، کرتی تھی اب ٹیں، ٹیں کرتی ہیں۔" فضہ اس تعارف پر کھلکھلا کر ہنسی۔ نشاط کے ہنستے ہوئے لب سمٹنے لگے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ زویا کا دل ڈوبنے لگا۔ علینہ اس پر جھپٹی، خرم بھاگا دونوں چیخ رہے تھے۔ فضہ ہنستے ہوئے ان سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھ لیجیے ماہر سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر خرم شہریار احمد کی سنجیدگی اور شرارتیں اور مستقبل کی ڈرماٹولوجسٹ کی شوخیاں۔" نشاط مکمل طور پر چونک گئی۔ مسکراتا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ زویا کا دل ڈوب گیا۔

"زویا، علینہ میری ہونے والی بھابی ہے۔ نکاح تو ان کا پچھلے سال ہوا تھا اب عید کے بعد رخصتی ہے۔ آؤ نشاط اندر چلیں کچھ خاص بناتے ہیں چائے کے لیے۔" فضہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔

نشاط پتھر کی ہوگئی۔ خواب، بجھارتیں اور حقیقتیں۔ زویا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

نشاط اندر بھاگتے ایک دوسرے کے پیچھے جاتے کھلکھلاتے خرم اور علینہ کو دیکھے گئی۔ سرپرائز کسی کے لیے خوشی اور کسی کے لیے موت تھا۔

ٹھنڈا یخ ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ چہرے کا چاند کملا گیا تھا۔ اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت تھی مگر زویا اس کے ساتھ تھی۔ وہ بہ مشکل مسکرائی تھی۔

"زویا تم کیا کہہ رہی تھیں؟" وائٹ کین کی کرسی پر وہ گرسی گئی۔

"ہمیں دوسروں سے امید نہیں باندھنی چاہیے امید کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں میں رہتا ہے اور......" نشاط اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"ہمیں خواب نہیں دیکھنے چاہیے حقیقت حال سے باخبر رہنا چاہیے۔" زویا سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ اس کے اندر نشاط کا بجھا ہوا چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

ایک بار پھر اس کی محبت مر رہی تھی۔ وہ محبت جس نے ابھی سر اٹھایا تھا۔ پہلے ارقم اب خرم......!

"میں چاہتی ہوں نشاط اب تم خود اپنی زندگی کا فیصلہ کرو پہلے مصروفیت ڈھونڈو، جاب کرو، خود کو ہر طرح کے ڈپریشن سے نکالو اور پھر شادی۔ اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کرو۔" زویا کا لہجہ بھیگ رہا تھا مگر اپنی قوتِ ارادی سے وہ آنسوؤں پر کنٹرول کررہی تھی کہ اسے نشاط کے سامنے مضبوط بنے رہنا تھا۔

نشاط کی آنکھوں کی سطح بھی بھیگ رہی تھی پلکیں بھی مگر ضبط شدت کا تھا۔ اس بار تو محبت کرنے کا انتخاب کیا تھا پھر ناکامی۔

"زویا زندگی ویسی کیوں نہیں ہوتی جیسی ہم سوچتے ہیں؟"

"زندگی ویسی ہوجاتی ہے جیسی ہم چاہتے ہیں اپنی قوتِ ارادی سے اپنے عمل سے، مثبت سوچ سے، شعورِ آگہی سے۔" نشاط اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"ہاں، اب میں اپنے ادھورے خوابوں کی تکمیل کروں گی۔ مثبت عمل سے خود اعتمادی سے اور مجھے خدا پر یقین ہے۔" زویا نے اسے بغور دیکھا اس کے اندر ایک نئی نشاط جنم لے رہی تھی۔

☆☆☆

اس روز سرمد آفندی آئے جو خبر انہوں نے سنائی اس نے سب کو شاک کردیا۔ نشاط نے انہیں کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔

"مگر...... میں وہ گھر تمہارے لیے محفوظ نہیں سمجھتا۔"

"ڈیڈی۔" اس نے سر جھکالیا۔

"یہ گھر تمہارا بھی ہے بیٹا جب تک چاہے یہاں رہو۔" شہریار احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "اور میں سمجھتا ہوں نشاط اپنی زندگی کے لیے جو فیصلہ کرے گی ٹھیک کرے گی۔ اب یہ بہتر اور نارمل ہے۔" خرم نے کہا۔

"اگلے جمعے کو میں نے نشاط کا نکاح طے کردیا ہے اپنے بھائی کے بیٹے طاہر کے ساتھ۔" انہوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ نشاط کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"طاہر...... زارا کی محبت۔ زارا مرگئی تو طاہر بھائی نے شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا تھا۔ کیسی لافانی محبت تھی ان کی۔ اب وہ...... اب وہ کیسے راضی ہوگئے۔" نشاط سوچ رہی تھی۔ خرم سب نوٹ کررہا تھا۔

"انکل اگر نشاط کی مرضی نہیں ہوگی تو یہ رشتہ نہیں ہوگا کیونکہ شادی زبردستی کا کھیل نہیں۔" خرم نے سنجیدگی سے کہا۔ سرمد آفندی، نشاط کو دیکھنے لگے اس نے سر جھکالیا۔

"طاہر بھائی میرے لیے کیسے راضی ہوگئے جبکہ ارقم...... پھر ارقم اور عریشہ......" اس نے سوچا تو مگر کچھ بولی نہیں۔

"وہ ایک اچھا اور بہترین لڑکا ہے میں اسے ساتھ لے کر آیا ہوں آپ سب سے ملوانا ضروری ہے۔ اصل وارث آپ ہیں نشاط کے۔" ڈاکٹر شہریار احمد کو دیکھتے ہوئے انہوں نے محبت سے کہا۔

"میں لے کر آتا ہوں۔" خرم باہر نکل گیا۔ خرم، طاہر کو اندر لے آیا تھا۔

اونچا، لمبا اچھی ڈیشنگ پرسنیلٹی تھی اس کی۔ بلیک جینز اور وائٹ شرٹ میں اس کا لمبا قد اور نمایاں ہورہا تھا۔ نشاط اسے دیکھے گئی۔ کتنے سالوں بعد دیکھ رہی تھی کس قدر بدل گئے تھے۔

"لڑکا پسند آیا؟" خرم اس کے برابر میں آبیٹھا۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکالیا۔ طاہر اس کی جانب متوجہ تھا۔ طاہر سب کو پسند آیا سب نے ہی اوکے کردیا۔ بس اِک گرہ نشاط کے دل میں تھی۔ طاہر اس کے لیے کیسے راضی ہوگیا؟

☆☆☆

اگلے دن خرم اسے سمجھا رہا تھا۔
''نشاط انتخاب ہم سب کا مگر رضا تمہاری ہوگی۔ تم صحت مند ہو ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔''
''میں ابھی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔'' وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی۔
''تم سب فیصلے کر سکتی ہو۔ اپنی قوتِ فیصلہ کو جگاؤ۔ شادی ہی تمہیں بہترین تحفظ دے سکتی ہے۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔
''مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنی زندگی کو بہتر انداز میں گزاروں۔''
''بالکل، انسان کو اسی قوتِ ارادی کا مظاہرہ کرنا چاہیے مگر نشاط...... میرا مشورہ ہے شادی تمہارے لیے ضروری ہے۔ وہ تحفظ دے گی تمہیں۔ تم اکیلے نہیں رہ سکتی۔ تنہائی انسان کو ماضی میں لے جاتی ہے اور ماضی تلخ ہو تو اعصاب، ذہنی صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ طاہر بہت اچھا اور ساتھ دینے والا ہے۔ مجھے یقین ہے تم اس کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو گی۔ من پسند، بالکل ویسی ہی جیسی تم چاہتی ہو۔'' نشاط خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''آپ میرے لیے کیسے راضی ہو گئے؟'' رات طاہر کے سامنے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔
''جیسے تم میرے لیے راضی ہو گئیں۔'' اس نے بھی بے ساختہ کہا۔
''میں تو پاگل، دیوانی، خبطی تھی۔''
''تھی کیا مطلب...... چلو ہو تو نہیں ناں؟'' وہ مسکرایا۔
''اور زارا......؟'' نشاط نے گہری سانس بھری۔
''مرنے والوں کے ساتھ کاش مرا جا سکتا۔ انتظار لا حاصل ہے اس لیے زندگی ان لوگوں کے لیے وقف کر دینی چاہیے جنہیں ہماری ضرورت ہو۔ ہم دونوں دو ٹوٹے، بکھرے لوگ ہیں۔ ٹوٹے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں، ان کا درد محسوس کر سکتے ہیں اور میرے خیال میں ایک بہتر زندگی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔'' نشاط اسے دیکھے گئی۔
''تم بھی یہی سوچ کر راضی ہوئی تھیں؟''
''نہیں...... میری زندگی کی کہانی آپ کے سامنے ہے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ بیچ راستے میں چھوڑیں گے تو نہیں؟'' خدشے نے سر اٹھایا۔
''میں چھوڑنے کے لیے تو نہیں اپنا رہا۔''
''مجھ سے لڑنا جھگڑنا بھی نہیں۔''
''سنو...... ہماری زندگی کو اپنے پیرنٹس کی زندگی سے مت ملانا۔ میرے خیال میں ہماری ذہنی ہم آہنگی اچھی رہے گی۔'' وہ شرارت سے ہنسا۔
''کیونکہ تم ......'' وہ آگے کہتے کہتے رک گیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اچھی لڑکی ہو۔'' نشاط ہنس دی، طاہر بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

''یہ لسٹ بنا دی ہے لے آیئے گا۔''
''یار آج زین کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے واپسی پر لیتے آئیں گے۔''
''کل کی پارٹی کی ساری تیاریاں مکمل ہیں ناں؟''
''جی ہاں۔''
''تمہاری تیاری کے ساتھ؟'' وہ اسے دیکھ کر شوخ ہوا۔
''جی ہاں، آپ کی تیاری کے ساتھ۔'' وہ شرارت سے ہنسی۔
''ویل ڈن۔'' قریب آتے ہوئے طاہر نے نشاط کے شانے پر ہاتھ پھیلا دیا۔ نشاط نے مصنوعی خفگی سے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ طاہر کھلکھلا کر ہنسا۔
گھر پیارا گھر...... مکمل گرہستی، مکمل ہم آہنگی......!
اس نے مکمل قوتِ ارادی سے اپنی زندگی کو ویسا بنا لیا تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔

راستے اور منزل

نیر شفقت

جس کسی نے بھی سنا اس نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی لیکن انہونی ہرگز نہیں تھی کہ بہر حال ہوتی 'انہونی' اسی دنیا میں ہی وقوع پزیر ہوتی ہیں لیکن وہی بات کہ ہمارا مزاج بن چکا ہے کہ جو بات بھی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ہو اس پر لوگ باتیں تو بناتے ہی ہیں اور یہ بات بھی گو کہ عام ڈگر سے ہٹ کر نہیں تھی مگر پھر بھی ہمارے عمومی مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔

"سعدیہ خاتون نے اپنے اکلوتے، انتہائی خوبرو، لائق فائق اور ایگزیکٹو پوسٹ پر بیٹھے بیٹے کی منگنی ایک طلاق یافتہ عورت سے کردی ہے اور جلد ہی شادی بھی متوقع ہے۔" یہ وہ عام ڈگر سے ہٹی ہوئی خبر تھی جو اُن کے پورے خاندان میں آگ کی طرح پھیلی تھی اور انتہائی ناگواری سے سنی گئی۔

"ہم کنواریاں مرگئی تھیں کیا جو سعدیہ آنٹی کو طلاق یافتہ سے شادی کرنی پڑ رہی ہے۔" یہ خاندان کی اور ملنے جلنے والی کنواری لڑکیوں کا پہلا تبصرہ تھا۔

"سعدیہ کو کیا سوجھی جو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے طلاق یافتہ لا رہی ہے۔ خاندان بھر میں لڑکیوں کی لائن لگی ہوئی ہے اور سب ہی پڑھی لکھی اور خوب صورت ہیں۔ ایسے میں سعدیہ کو باہر سے ہی کوئی لانی تھی تو کنواری تو لاتیں۔" یہ بڑی چچی کی رائے تھی جن کی دو بیٹیاں بیاہنے والی تھیں۔

"اور مجھے تو بھابی کئی مرتبہ باتوں، باتوں میں زارا کے لیے کہہ بھی چکی تھیں اور اب......! بہرحال ایک مرتبہ تو ان سے پوچھوں گی میں۔" منجھلی پھپھو نے انکشاف کیا تو چھوٹی چچی کے تن بدن میں آگ لگ گئی ویسے بھی دونوں نند بھاوج کی بہت لگتی تھی۔

"زارا کے لیے......؟" انہوں نے اداکاری کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے تو وہ صاف طور پر یسیٰ کے لیے کہہ چکی تھیں۔" انہوں نے راز اگلا...... (تصدیق کس نے کرنی تھی)

"ارے بھئی کیا تم اپنی لڑائی شروع کر بیٹھی ہو، کوئی سعدیہ سے بھی تو جا کر پوچھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔" بڑی پھپھو نے بات سمیٹنے کی کوشش کی۔ ویسے بھی ان کے تین بیٹے ہی تھے اور انہیں بیٹی کے حوالے سے بھتیجے میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ یہ الگ بات کہ بھتیجے سے انہیں محبت تو بہت تھی۔

"میرا تو خیال ہے کوئی فائدہ نہیں ہے پوچھنے کا...... بھابی نے صاف ٹال جانا ہے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ وہ لڑکی رضا کی پسند ہے اور بھابی نے یہی کچھ کہہ کر بات ختم کردینی ہے۔" یہ رائے رضا کی چھوٹی پھپھو کی تھی۔

اور تو اور رضا کی چاروں بہنیں بھی غصے سے پھوں پھاں کرتیں ماں کے سر ہوگئیں۔

"یہی ملی تھی آپ کو ہمارے اکلوتے بھائی کے لیے۔" یہ آفرین تھی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی۔

"ہم نے اتنی لڑکیاں دکھائی تھیں ان میں سے ہی کوئی پسند کرلی ہوتی۔ ہم میں سے کسی کی عزت تو رہ جاتی۔" نازنین نے کچھ تنک کر کہا۔

"آخر آپ کو ایسی کون سی خوبی نظر آئی تھی جو ایک طلاق یافتہ کو آپ بہو بنانے پر رضامند ہوگئیں؟" یاسمین اور رضا سب سے بڑے بچے اور جڑواں تھے۔

"ہمارے تو سارے ارمان مٹی ہوگئے۔" فرزین نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ سعدیہ خاتون بڑے سکون سے بیٹھی ان کے تبصرے سنتی رہیں۔

"بھئی ارمان تو تم اب بھی پورے کرسکتی ہو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر اب وہ بات کہاں ہوگی؟"

"کیوں نہیں ہوگی بھلا۔ ارے ابھی تاریخ لینے جانا ہے۔ شادی کی تیاریاں کرنی ہیں...... مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ، جی بھر کے اپنے ارمان نکالو...... آخر اکلوتا بھائی ہے۔" سعدیہ خاتون نے شفقت بھرے لہجے میں کہا مگر ان سب کے منہ پھولے ہی رہے۔

☆☆☆

پھر ایک دن سعدیہ خاتون اپنی چاروں بیٹیوں کو لے کر اقرا کے گھر اس سے ملوانے لے گئیں۔

وہاں بھی انہوں نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی حالانکہ دل ہی دل میں وہ سب اقرا کی خوب صورتی، معصومیت اور خوش اخلاقی سے بے حد متاثر ہوئی تھیں مگر انا بھی تو کوئی چیز تھی۔ سو اُن کے انداز و اطوار میں سرد مہری غالب رہی۔ سعدیہ بیگم البتہ بے حد خوش تھیں۔ بار بار اقرا کو پیار کرتیں۔ ان کی نظریں مسلسل اقرا کی بلائیں لیتی رہیں۔ اقرا کے گھر والے بھی ان کے آگے بچھے جا رہے تھے۔

اور پھر جلد ہی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہوگئی۔ اس موقع پر اقرا کے گھر والوں نے کافی بڑے پیمانے پر دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ سعدیہ بیگم اپنی چاروں بیٹیوں اور دامادوں کے علاوہ خاندان کے خاص خاص لوگوں کو بھی لے کر گئی تھیں۔ دعوت کا انتظام بے حد شاندار تھا۔ دل میں اسے سراہنے کے باوجود چاروں بہنیں لیے دیے انداز میں بیٹھی رہیں۔ دامادوں نے البتہ دل کھول کر تعریف کی۔ سعدیہ بیگم نے اس موقع پر انہیں اقرا سے بھی ملوایا اور وہ سب اس کی معصومیت اور خوب صورتی سے بے حد متاثر نظر آرہے تھے۔

شادی کی تاریخ کا مقرر ہونا گویا شادی کی تیاریوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ سعدیہ خاتون بری کی تیاریوں میں اپنی بیٹیوں کے مشوروں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہ رہی تھیں اور بیٹیاں تھیں کہ پلہ ہی نہ پکڑاتی تھیں۔

جیولر کی دکان پر جانے کے لیے فون کیا تو چاروں کو اپنی مصروفیات نظر آنے لگیں۔ ٹیلر کے ہاں جانا تھا تو ہزار بہانے تیار...... لہنگے کی خریداری کرنا تھی تو کہیں شادی کہیں فوتگی کا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔

جس دن سے یہ رشتہ طے ہوا تھا اس دن سے سعدیہ بیگم بیٹیوں کے رویے دیکھ رہی تھیں۔ اگرچہ باتیں تو لوگوں نے اور رشتے داروں نے بھی بہت بنائی تھیں مگر انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی مگر یہ اولاد کا معاملہ تھا...... رشتے دار ملیں تو ملیں، نہیں ملتے تو نہ سہی مگر ماں، باپ کی جب تک زندگی ہے اولاد سے کس طرح دور ہوسکتے ہیں...... پھر اکلوتا بھائی تھا ان کی بیٹیوں کا میکے کا مان تھا...... اس کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی تھا انہیں۔

اس دن صبح ہی انہوں نے چاروں کو فون کر کے بلوالیا۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی انہوں نے اپنی جان چھڑانا چاہی مگر سعدیہ بیگم کی سختی کی وجہ سے انہیں آنا ہی پڑا۔ سلام دعا اور حال احوال کے بعد وہ بیٹیوں کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔

"یہ میں نے کچھ شاپنگ کی ہے اقرا کے لیے، تم لوگوں کو تو بلا بلا کر تھک گئی مگر تم لوگوں نے بھی قسم کھائی ہوئی کہ کسی تیاری میں کوئی حصہ نہیں لینا۔" انہوں نے الماری سے کچھ ڈبے نکالتے ہوئے کہا۔

چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شرمندگی تو چاروں کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی مگر جواب کسی نے نہیں دیا۔

"مسئلہ کیا ہے آخر؟" وہ جانتی تو سب کچھ تھیں مگر چاہتی تھیں کہ وہ خود ہی کچھ بولیں۔ "کیا اکلوتے بھائی کی خوشی تمہیں عزیز نہیں ہے؟ ابھی تو میں نے بات سنبھالی ہوئی ہے لیکن رضا کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم لوگ اس کی خوشی میں خوش نہیں ہو تو وہ کیا سوچے گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی......" یاسمین نے کمزور لہجے میں اپنا اور بہنوں کا دفاع کرنا چاہا۔

"ایسی ویسی کوئی بھی بات ہو، تم کھل کر کہو۔" ماں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں آج یہ مسئلہ بھی حل کر رہی ہوں، کہہ دوں گی میں رضا سے کہ تمہاری بہنوں کو تمہاری خوشی عزیز نہیں ہے لہٰذا کوئی ضرورت نہیں ہے شادی کرنے کی۔ لوگ جو کچھ کہیں گے سہہ لوں گی میں۔" ساتھ ہی انہوں نے چند آنسو ٹپکائے تو وہ سب گھبرا گئیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی، ہم سب بہت خوش ہیں۔" یاسمین نے پھر بہنوں کی نمائندگی کی۔ "آپ کو پتا ہی ہے کہ گھر اور بچوں کی مصروفیات میں وقت ہی نہیں ملتا کہ کچھ کرسکیں۔"

"گھر اور بچوں کی مصروفیات اپنی جگہ مگر یہ موقع ایسا ہوتا ہے کہ بہنیں تو گویا پاگل ہوجاتی ہیں۔ تیاری کے ہر موقع پر مشورہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے اور تم لوگ ہو کہ اکلوتے بھائی کی شادی ہے اور......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا۔ اب آنسو آ ہی نہیں رہے ہوں تو کیا کرتیں۔

"آپ روئیں نہیں امی......" آفرین ماں کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ "ہمیں تو کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے، اقرا ہم سب کو بہت اچھی لگی ہے۔ اس کی خوب صورتی، معصومیت اور خوش اخلاقی نے ہمیں بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اس کا گھر بار بھی بہت اچھا ہے، گھر والے بھی بہت سلجھے ہوئے ہیں۔ بس......" وہ ایک ثانیے کو رکی...... "اس کا طلاق یافتہ ہونا ہمیں ہضم نہیں ہورہا ہے۔"

بلی آخر تھیلے سے باہر آ ہی گئی...... سعدیہ خاتون وجہ تو جانتی ہی تھیں، بس ان کے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔

"تو کیا طلاق یافتہ لڑکیوں کے لیے زندگی کے دروازے بند ہوجاتے ہیں؟"

"نہیں...... نہیں یہ بات نہیں ہے۔" نازنین نے بے اختیار کہا۔ "ہماری سسرالوں میں جس، جس کو لڑکی کے طلاق یافتہ ہونے کا پتا چل رہا ہے وہ باتیں بنا رہے ہیں۔"

"تو بیٹا تم لوگ چپ رہ کر انہیں باتیں بنانے کا موقع کیوں دے رہی ہو۔ ایک مرتبہ صاف، صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہماری ماں جو مرضی کرے، کسی کو بولنے یا اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ لوگ خود ہی چپ ہوجائیں گے۔"

"لیکن امی......" فرزین نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی کنواری لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی تھیں؟"

سعدیہ خاتون نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بات پھر وہیں کی وہیں تھی۔ جب تک وہ چاروں خود مطمئن نہ ہوتیں دوسروں کو قائل کس طرح کرسکتی تھیں۔

"اچھا اس موضوع کو چھوڑو...... میں تمہیں ایک کہانی سناتی ہوں، اسے سن کر شاید تمہارا ذہن کچھ بدل جائے۔"

☆☆☆

"ہر لڑکی کی طرح کنول بھی ماں، باپ، بہن، بھائیوں، سکھی، سہیلیوں کی دعائیں اور دل میں ہزاروں ارمان لے کر پیا دیس سدھاری تھی۔

شادی کے بعد کے دو ماہ تو گویا اس نے خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے پریوں کے دیس میں گزارے تھے۔ اس کے شوہر سلیم بیگ دلکش شخصیت کے مالک تھے اور نہایت ہی محبت کرنے والے...... ان کا سب سے اہم پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ امریکا میں سیٹل تھے اور وہاں پر کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کررہے تھے۔ کنول کے والدین نے ہر طرح کی چھان بین کروا کر ہی ہاں کی تھی۔ کنول کا بس چلتا تو وہ چھان بین کروائے بغیر ہی ہاں کردیتی۔ امریکا جانا اور وہاں سیٹل ہونا اس کا خواب تھا۔ اس خواب کی تعبیر اسے اتنی جلدی مل جائے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سلیم بیگ چار ماہ کی چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے تھے ان کی ماں بہنوں کا مصمم ارادہ تھا کہ اس بار ان کی شادی کر کے ہی واپس بھیجیں گی یوں تو ان کے آنے کی خبر پاتے ہی ماں اور تینوں بہنوں نے لڑکیاں دیکھنا شروع کردی تھیں مگر گوہر مقصود تھا کہ ہاتھ نہیں آرہا تھا بالآخر ان کی آمد کے ایک ماہ بعد ان کی نگاہِ انتخاب کنول پر پڑی۔ کنول حال ہی میں بی اے کر کے فارغ ہوئی تھی اور اب کسی اچھے رشتے کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے اسکول میں جاب کررہی تھی۔ صاف رنگ، موہنی سی صورت، لمبے بال، سلیم بیگ کی بہنوں کو وہ بے حد پسند آئی۔ ویسے بھی سلیم بیگ کی کوئی خاص ڈیمانڈ نہیں تھی۔ کنول کے والدین ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ اتنی دور وہ بیٹی کو بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ باقی دو بیٹیاں بھی اسی شہر میں بیاہی تھیں۔ کنول کے لیے بھی وہ کسی ایسے ہی رشتے کے متلاشی تھے مگر مقدر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ سو رشتہ طے ہوگیا۔" سعدیہ خاتون نے کچھ دیر توقف کر کے بیٹیوں کو دیکھا وہ بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ "دو ماہ بعد سلیم بیگ نے واپس چلے جانا تھا اور وہاں جا کر کنول کو بلانے کا بندوبست کرنا تھا۔ سو حسب پروگرام کنول کو وعدوں کے ہزاروں جگنو تھما کر اس کی آنکھوں میں آنسو بسا کر وہ امریکا فلائی کرگئے۔

کنول کے سسرال والے اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے نئی دلہن کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اس کا جب دل چاہتا ماں باپ کے ہاں چلی جاتی...... دل چاہتا تو سسرال آجاتی۔ موڈ ہوتا تو کام کرلیتی ورنہ وہاں بھی چل ہی رہا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ سلیم بیگ کا فون آتا تو اس کی ساس، سسر اور جس کسی نے بات کرنی ہوتی بات کر کے ریسیور کنول کو تھما کر ہٹ جاتے۔ کنول منٹوں بات کرتی یا گھنٹوں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا بلکہ ساس ہر دفعہ جب بھی فون آتا سلیم بیگ سے پُرزور اصرار کرتیں کہ کنول کو جلد از جلد بلوا لے تقریباً ایک سال بعد کنول کی دعائیں رنگ لائیں اور وہ اپنے خوابوں کی سرزمین امریکا کے شہر نیویارک پہنچ گئی۔ ائیرپورٹ پر سلیم بیگ اسے لینے آئے ہوئے تھے۔ امریکا کے معاشرتی دستور کے مطابق سلیم بیگ نے نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تو وہ لال سرخ

ہو کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''ہٹیں بھی...... کیا کر رہے ہیں آپ...... لوگ دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے شرمیلے کم بلکہ شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا تو وہ اسے پہلو سے لگاتے ہوئے دوسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''سو واٹ، یہاں یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں ہے۔'' بہرحال وہ اسے بانہوں کے حصار میں لیے ائرپورٹ سے باہر آئے۔ دو کمروں کا اپارٹمنٹ بہت خوب صورت تھا۔ بہت فخریہ انداز میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اپنے مقدر پر رشک آیا۔ لوگ سوچتے رہ جاتے ہیں اور اس نے سوچ بنا ہی سب کچھ پالیا تھا۔

''پسند آیا؟'' سلیم کی آواز پر وہ چونکی۔

''جی بہت...... بہت زیادہ......'' اس نے محبت بھری نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

''اداس ہوئیں میرے بنا؟'' سلیم بیگ نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا مگر جواب سننے کا ہوش کہاں تھا۔ محبت کا خمار سرچڑھ کر بول رہا تھا اور پھر محبت کا یہ خمار بہت جلد اتر گیا۔ یہ امریکا تھا جہاں قدم قدم پر ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ زاہدوں کے زہد لٹتے ہیں پھر سلیم بیگ تو بہت عام سے مرد تھے۔ وہ تو پہلے قدم پر ہی بہک گئے تھے۔ اب تو انہیں یہاں آئے پانچ سال ہو چکے تھے اور یہاں کی زندگی میں وہ رچ بس چکے تھے۔ شادی بھی انہوں نے محض ماں، باپ اور بہن بھائیوں کا دل رکھنے کے لیے کی تھی۔ سوچا یہی تھا کہ امریکا آکر بھی ایک کونے میں پڑی رہے گی اور وہ حسبِ سابق شراب و شباب کے مزے لوٹتے رہیں گے مگر کنول مشرقی بیوی تھی۔ اس کا دل اور ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ شوہر کھائی میں گرتا رہے اور وہ تماشا دیکھتی رہے۔ اس نے اس زندگی کو اپنی قسمت جان لیا تھا مگر قسمت ٹھیک بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے شوہر کو سدھارنے کا ارادہ کیا...... مگر برسوں کے بگڑے ہوئے دنوں میں کہاں سدھرتے ہیں۔ نوبت پہلے گالی گلوچ پھر مار پیٹ تک جا پہنچی۔ ایک تھپڑ سے جو بات شروع ہوئی تھی، وہ ٹھوکروں ٹھڈوں تک جا پہنچی۔ یہاں تک کہ اس کی کوکھ میں پلتے وجود کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ اس کی بزرگ پڑوسن لیڈی الزبتھ نے اس کی سسکیاں سن کر اسے اسپتال پہنچایا۔ جہاں پر پری میچور بچی پیدا ہوئی اور وہ خود مرتے مرتے بچی۔

چار دن وہ اسپتال میں رہی۔ لیڈی الزبتھ باقاعدہ اس کی مزاج پرسی کو آتی رہی۔ اسی نے سلیم بیگ کو بچی کی پیدائش کے بارے میں بھی بتایا مگر وہ سنگدل اپنی موج مستی میں مگن رہے۔ پانچویں دن وہ گھر آئی تو سارا گھر الٹا پڑا تھا۔ طبیعت خراب ہونے کے باوجود اس نے گھر کی حالت درست کی۔ کھانا بنایا۔ خود بھی نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے، سلیم بیگ جیسے بھی تھے اس کے شوہر تھے اور اس کی بچی کے باپ تھے پھر سب سے بڑھ کر اس پردیس میں جہاں وہ کسی کو بھی نہ جانتی تھی وہاں اس کا واحد سہارا تھے۔ وہ اس کی خبر گیری کو آئے یا نہیں یہ اُن کا اپنا فعل تھا۔ اس کا جو فرض تھا وہ تو اسے نبھانا ہی تھا۔

سارا دن انتظار میں گزر گیا۔ آدھی رات بھی گزر گئی مگر وہ ستی ساوتری اپنے شوہر کے انتظار میں جاگتی رہی۔ بالآخر کڑے انتظار کے بعد رات کے دو بجے اُن کی آمد ہوئی۔ وہ نشے میں تھے۔ کنول کو دیکھ کر سلیم کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''تو...... تو...... تم پھر آگئی ہو؟'' وہ لڑکھڑائے۔

''کیسے نہ آتی۔'' اس نے لپک کر شوہر کو پکڑا۔ ''میرا گھر ہے، آنا تو تھا ہی۔''

''تت...... تت...... تمہارا گھر تن...... نہیں ہے۔ یہ، یہ میرا گھر ہے۔ تت...... تم چلی جاؤ یہاں سے۔''

''کیسے چلی جاؤں اپنا گھر چھوڑ کر۔ میرا نہیں تو اس معصوم بچی کا ہی خیال کریں۔'' اس نے بیڈ پر لیٹی چند دن کی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ بچی......'' انہوں نے پُرخیال نظروں سے بچی کی طرف دیکھا۔ ''یہ کس کا بچہ اٹھا لائی ہو تم؟'' کنول کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ ہماری بچی ہے...... آپ کی اور میری بیٹی۔'' کنول نے جیسے کسی صدمے کے زیرِ اثر کہا۔

''میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔'' انہوں نے بیڈ پر گرتے ہوئے کہا۔ ''لے جاؤ اسے یہاں سے۔'' اور کنول نے یہ جان کر کہ وہ نشے میں ہیں اور اس کی کوئی بات نہیں مانیں گے اور نہ سنیں گے۔ چپ چاپ بچی کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے دن نشہ اترنے کے بعد پھر ایک زوردار معرکہ ہوا۔ کنول اپنا حق مانگنے پر بضد تھی اور سلیم ان دونوں کے وجود سے انکاری...... آخر نوبت پھر مار پیٹ تک جا پہنچی اور بالآخر سلیم بیگ نے کنول کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ چند دن کے معصوم وجود کو بھی کمرے سے اٹھا کر لائے اور گرتی ہوئی کنول کے اوپر پھینک دیا اگر کنول بے قراری سے اسے نہ پکڑتی تو شاید فرش پر گر کر اس کا سر ہی پھٹ جاتا۔ روتی بلکتی کنول کو لیڈی الزبتھ نے سنبھالا اور اپنے گھر لے آئیں پھر انہوں نے ہی سلیم بیگ کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کنول کو واپس اپنے گھر لے جائے۔ ورنہ کمیونٹی پولیس تک بات پہنچ جائے گی۔ کنول جانا تو نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس پردیس میں اس کا اور کون ساٹھکانا تھا پھر والدین کا خیال کہ انہیں پتا لگا تو وہ تو جیتے جی ہی مر جائیں گے۔

اب اس نے سلیم بیگ کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ شراب پی کر آتے لڑکیوں کو گھر لاتے۔ کنول لاتعلق ہی رہتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا یا ننھی گڑیا کو سنبھالنا ہی اس کی ذمے داری رہ گئی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ کہیں اسے جاب مل جائے تو وہ اپنا اور اپنی بچی کا ٹکٹ لے کر واپس چلی جائے لیکن گڑیا ابھی بہت چھوٹی تھی۔ وہ اسے گڑیا ہی کہہ کر بلاتی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ پری میچور بچی تھی لہٰذا اس کا خیال بھی زیادہ رکھنا پڑتا تھا۔ اکثر بیمار رہتی تھی وہ۔ اس دن بھی اسے بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی لیکن بخار کم ہونے کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ لیڈی الزبتھ بھی ویک اینڈ گزارنے اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی ورنہ وہ کنول اور گڑیا کا بے حد خیال رکھتی تھیں...اور کنول کو نہ تو باہر کے راستوں کا کوئی علم تھا اور نہ وہ کسی اسپتال کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید اسی کے دل میں محبت کی کوئی سوئی ہوئی رمق جاگ ہی پڑتی۔ شاید انسانیت کے ناتے ہی اس معصوم بچی پر جسے وہ اپنی اولاد ماننے سے انکاری تھے ترس آجاتا۔ اس آس اسی امید پر وہ شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

رات تین بجے وہ لڑکھڑاتے ہوئے گھر آئے۔ کنول یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس حالت میں وہ اس کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ ان کے پاس اپنا دکھ رونے چلی گئی۔ ماں تھی آخر کتنا صبر کرتی بچی کی حالت پر اور وہ انسان نہیں کوئی پتھر ہی تھا شاید۔ نہ صرف یہ کہ بچی سمیت ایک مرتبہ پھر گھر سے نکال دیا بلکہ مردوں کا ازلی طلاق کا حق بھی استعمال کرتے ہوئے طلاق کے بھی تین بول کہہ دیے۔ عورت اور بیوی تو ہار گئی تھی لیکن ماں کیسے ہارتی۔ رات کے چار بجے وہ گڑیا کو لے کر دیوانوں کی طرح باہر نکلی اور کسی نہ کسی طرح نزدیکی اسپتال پہنچی۔ وہیں اسپتال میں گڑیا کے علاج کے دوران اس کی ملاقات ڈاکٹر

صدیقی سے ہوئی۔ اس کڑے اور مشکل وقت میں انہوں نے کنول کو بہت حوصلہ دیا۔ ایک ہم وطن کو سامنے پاکر کنول رہ نہ سکی اور اس نے اپنے اوپر بیتنے والا ہر دکھ ڈاکٹر صدیقی کے آگے کھول دیا اگرچہ بعد میں وہ جی بھر کر شرمندہ بھی ہوئی مگر وہ کیا کرتی۔ اس کے دل کا بوجھ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ رہ نہ سکی اور ایک مہربان ہم وطن کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر صدیقی واقعی مہربان تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ کنول کا دکھ ہمدردی سے سنا بلکہ زندگی کی کڑی مسافت طے کرنے کے لیے سنبھالا بھی دیا۔ سب سے پہلے تو ایک اسپتال میں رہائش کا بندوبست کیا پھر اس کے لیے جاب بھی تلاش کی۔ گڑیا کے لیے انہوں نے ایک بے بی سٹنگ ہوم میں داخلے کا انتظام بھی کیا۔ کنول ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ وہ صرف کوشش میں تھی کہ واپس پاکستان جانے کا بندوبست ہو جائے۔ اس نے والدین کو ابھی تک خود پر گزرنے والے کسی سانحے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ انہوں نے تو بیٹی کے بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جانا تھا۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ پاکستان پہنچ کر اپنے حالات سے آگاہ کرے گی۔

گڑیا آٹھ ماہ کی تھی جب ڈاکٹر صدیقی نے اسے پروپوز کیا، وہ تو اس پروپوزل پر ششدر رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے لائق فائق اور ڈیسنٹ سے ڈاکٹر صدیقی ایک بچی کی ماں اور طلاق یافتہ عورت سے شادی کے خواہشمند ہوں گے...... لیکن وہ سنجیدہ تھے انہیں کنول کی صورت سے زیادہ اس کی سیرت نے متاثر کیا تھا اور وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ کچھ اپنی بچی کی وجہ سے وہ عدم تحفظ کا شکار تھی۔ پرائی اولاد کو کون اپناتا ہے پھر پاکستان میں ڈاکٹر صدیقی کے والدین اور بہن بھائی کیا ایک طلاق یافتہ بہو اور بھابی کو قبول کر لیں گے اور ایسے کتنے ہی سوالات تھے جو منہ پھاڑے اسے نگلنے کو بے تاب تھے مگر ڈاکٹر صدیقی کا مہربان وجود اس پر سایہ فگن تھا۔ انہوں نے کنول کے ذہن میں گونجتے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔ اس کے ہر خدشے کو اس کا واہمہ قرار دیا۔

ڈاکٹر صدیقی گھر کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ سفید پوش والدین نے پیٹ کاٹ کر انہیں جیسے تیسے ڈاکٹر تو بنا دیا مگر ان کے ڈاکٹر بنتے ہی خود ہمت ہار بیٹھے اور دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ذمے داری ان کے کندھوں پر ڈال کر خود یکے بعد دیگر قبر میں جا سوئے۔ ڈاکٹر صدیقی نے بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس ذمے داری کو نبھایا...... بہنوں کی شادیاں کیں...... بھائیوں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کیا اُن کی شادیاں کیں اور خود اپنا خواب پورا کرنے امریکا آگئے۔ وہ کنول کے سلسلے میں کسی کے آگے جواب دہ نہیں تھے اور انہیں کسی کو یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ کنول طلاق یافتہ اور ایک بچی کی ماں ہے۔ رہی گڑیا تو وہ اسے اپنا نام دینے کے لیے بخوشی تیار تھے۔ وطن سے دور رہتے ہوئے کسی کو کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ ویسے بھی وہ پری میچور بچی تھی بہت کمزور سی۔ لہٰذا ہر بات کو بڑی آسانی سے کور کیا جا سکتا تھا۔ جب ہر بات کا جواب موجود تھا سب سے بڑھ کر ڈاکٹر صدیقی اس کے ساتھ تھے پھر انکار کا کیا جواز رہ جاتا تھا۔ وہ تو خود وقت کی لہروں میں بہے جا رہی تھی، پردیس میں تو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ یہاں تو قدرت نے اتنے مضبوط سہارے کا بندوبست کیا تھا پھر وہ کیسے کفرانِ نعمت کر سکتی تھی۔ سو ایک حسین شام نیویارک کے ایک اسلامک سینٹر میں ان کے نکاح کی تقریب بخیر و خوبی انجام پائی۔“

☆☆☆

ایک گہری سانس لے کر سعدیہ خاتون خاموش

ہوئیں تو چاروں جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئیں اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہوں، کیسی لگی یہ کہانی؟“

”امی...... یہ تو بالکل ایسی ہی کوئی کہانی یا افسانہ لگ رہا ہے جیسے کہ رسائل میں اکثر چھپتا ہے یا ٹی وی، ڈراموں کی اسٹوری لگ رہی ہے۔“ یاسمین نے بہنوں کی ترجمانی کی۔

”ہاں...... وہ کہانیاں بھی تو اس زندگی سے کشید کی گئی ہوتی ہیں۔“

”اچھا تو یہ کہانی کس کی زندگی کے متعلق ہے؟ یہ بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟“ یاسمین نے پھر استفسار کیا۔

”ہوں......“ سعدیہ خاتون مسکرائیں۔ ”اب آئی ہو اصل پوائنٹ پر۔“

”کیا مطلب امی؟“ یاسمین نے بے ساختہ سوال کیا۔

”میرا مطلب ہے کہ میرا پورا نام سعدیہ کنول ہے اور تمہارے پاپا کا نام ڈاکٹر کامران صدیقی اور گڑیا کا نام ہم نے یاسمین رکھا تھا۔“

ان چاروں کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹ گئیں مگر سعدیہ خاتون نے دیکھنے کے باوجود بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ ”گول مٹول سا رضا پیدا ہوا تو ہم نے پاکستان میں سب کو یہی اطلاع دی کہ جڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں۔“ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ”یہاں پر اس راز سے کوئی واقف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد اب تم چاروں ہی ہو جن کے ہاتھ میری عزت ہے...... اور یاسمین بیٹے دل میں کوئی بھی سوتیلا خیال لانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی محبتوں کے بارے میں ضرور سوچ لینا اور ماں کی بے بسی کا خیال بھی کر لینا جسے تمہارے باپ نے دھکے دے کر گھر سے نکالا تھا اور جو تمہارے وجود سے بھی انکاری تھا۔“ سعدیہ خاتون کا لہجہ اب ملتجیانہ سا ہو گیا تھا۔ سچ ہی کہا ہے کسی نے کہ کوئی اپنا راز کسی کو دے کر اس کا غلام بن جاتا ہے۔

اور یاسمین جس کا وجود زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا، ایک دم ہی شانت ہو گئی۔

”آپ بہت عظیم ہیں امی!“ وہ ماں سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ”سمجھ لیں کہ آپ نے اپنا راز کسی کنویں پھینک دیا ہے۔ میں کسی سلیم بیگ سے واقف نہیں ہوں، میں آپ کی اور ابو کی بیٹی ہوں، رضا میرا جڑواں بھائی ہے اور یہ تینوں میری بہنیں۔“ اس نے محبت بھری نظروں سے بہنوں کی طرف دیکھا۔ اُن تینوں کی بھی آنکھیں نم تھیں اور اُن کے سر بہن کی تائید میں ہل رہے تھے۔

سعدیہ خاتون کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں...... پھر ایک دم وہ چونک کر بولیں۔

”ہاں...... اور اب اقرا کے بارے میں کیا خیال ہے، اسے تو رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہو گئی تھی۔“

”امی پلیز...... اب شرمندہ تو نہ کریں۔“ فرزین نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”امی اقرا تو ہمیں پہلے بھی بہت پسند آئی تھی۔“ آفرین نے کہا۔ ”جو اعتراض تھا اب تو وہ بھی نہیں ہے۔“

”ہاں امی...... ہم سب دل و جان سے اس رشتے پر راضی ہیں۔“ نازنین نے کہا۔ ”اور اب دیکھیے گا ہم کس طرح اپنے ارمان نکالتے ہیں۔“ وہ چاروں مختلف پروگراموں پر تبادلۂ خیال کرنے لگیں، کمرے میں جیسے شور گونجنے لگا تھا اور سعدیہ بیگم کو اس شور میں شہنائیوں کی گونج محسوس ہو رہی تھی اور ان کی جبیں رب کے حضور جھکنے کو بے چین تھی کہ کس آسانی سے اپنی زندگی کی کہانی اپنی بیٹیوں کو سنا ڈالی تھی۔

منی ناول

گمشدہ جنت

صائمہ اکرم



دوسرا حصہ



"پھر کیا ہوا بھئی......؟ آپ کی محبت کا کیا بنا؟"

اسود کا چہرہ تو دھواں دھواں تھا ہی مگر اس کے لہجے کا پھیکا پن شرزمہ کے ساتھ ساتھ ہانیہ کو بھی چونکا گیا۔ وہ سخت حیرت سے باری باری اسود اور شرزمہ کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"پھر کیا ہوا ناں؟ بتائیں ناں......؟" اسود بہ مشکل تھوک نگل کر بولا۔

"پھر یہ ہوا کہ......" ہانیہ سانس لینے کو رکیں

اوران دونوں کی سانس رک سی گئی۔
''پھر پتا ہے کیا ہوا......؟'' انہوں نے پُرجوش انداز میں ان دونوں کے تجسس کو ہوا دی۔
''بتائیں ناں......'' اسود زبردستی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔
''اس کے بعد ......'' انہوں نے ایک لمبی سانس لے کر بات ادھوری چھوڑی دونوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر مقناطیس کی طرح جمی ہوئی تھیں۔
''اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور باقی خواب ادھورا رہ گیا......'' ہانیہ کا شرارت میں ڈوبا لہجہ اور آنکھوں سے چھلکتی شوخی پر وہ دونوں ہی بھونچکا رہ گئے۔ وہ منہ کھول کر زور زور سے قہقہے لگانے لگیں۔ کچھ دیر کے لیے دونوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی۔
''مائی گاڈ، کتنے بڑے ''ڈفر'' اور ''احمق'' ہو تم لوگ......'' وہ اپنے مرمریں ہاتھوں کو ہونٹوں پر رکھے بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔
''بھئی ایسے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہانیہ مصطفیٰ کو کسی سے محبت ہو اور اگلا بندہ اپنے حواسوں میں رہ سکے۔ ہنی کو اگلے بندے کو اپنے عشق کی آگ میں جلانے کا ہنر آتا ہے......'' ان کی آنکھوں میں روشنیوں کے سوتے سے پھوٹ رہے تھے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ ہی احساس ہوا کہ وہ انہیں بہت عمدہ طریقے سے بے وقوف بنا چکی ہیں۔ اب وہ استہزائیہ انداز سے ان دونوں کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔
''اٹس ناٹ فیئر ہنی......'' اسود جھٹکے سے اٹھا۔ اس کا چہرہ خجالت کے احساس سے سرخ ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ بڑی سرعت کے ساتھ ان کے ٹی وی لاؤنج سے نکل گیا۔
''اسے کیا ہوا......؟'' ہنی کو اس قدر شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی تبھی وہ ہکا بکا انداز میں شرزمہ کو دیکھ رہی تھیں جو اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔
''ہنی ایسے مذاق بھی کوئی کرتا ہے بھلا......؟'' شیری کی آنکھوں میں بھی کئی شکوے مچلے۔
''کم آن شرزمہ...... کتنے اسٹوپڈ لوگ ہو تم، یہ کوئی مائنڈ کرنے والی بات ہے بھلا......؟'' ہانیہ کی جھنجلاہٹ میں ناگواری کا عنصر نمایاں ہوا۔
''کیا اب کوئی مذاق بھی نہیں کر سکتا۔ کتنے نان سینس ہو تم لوگ......'' انہیں زبردست غصہ آیا۔
''ہنسی مذاق کرنے اور کسی کی دل آزاری کرنے میں تھوڑا سا ہی فرق ہوتا ہے اور بہت سے لوگ اس چھوٹی سی لائن کو بڑی جلدی کراس کر جاتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔'' وہ بھی خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی آئی۔
اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن اسے علم تھا کہ ہانیہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنا وقت ضائع کرنے کی عادی نہیں تبھی ٹھیک دس منٹ بعد اس نے جھانک کر ٹی وی لاؤنج میں دیکھا تو وہ بڑے ذوق شوق سے کوئی انگلش مووی دیکھنے میں مگن تھیں۔ اس کا دل دکھ اور تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔
ایک دفعہ پھر اس نے اپنے دل میں ابھرتے اس سوال کو دبایا کہ وہ ایسی کیوں ہیں......؟
ہمیشہ کی طرح اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

''تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں کیا آملہ اور ریٹھا لگاتی ہو......؟'' شولڈر کٹ بالوں والی نازک سی لڑکی نے اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھتے ہوئے سخت حیرت سے پوچھا۔ اپنی فائل کو چہرے پر رکھے سستی سے ٹانگیں پھیلائے شرزمہ چونک گئی۔ اس نے ہلکی سی کوفت سے اپنے ساتھ بینچ پر بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو اس کی تنہائی میں مخل ہو چکی تھی حالانکہ اپنی طرف سے اس نے یونیورسٹی کا سب سے سنسان گوشہ ڈھونڈا تھا۔
''مجھ سے کچھ کہا آپ نے......؟'' وہ اب سنبھل کر بیٹھ گئی۔
''بھئی میں کہہ رہی ہوں کہ تمہارے بال بہت خوب صورت، گھنے اور سلکی ہیں، کون سے ٹوٹکے استعمال کرتی ہو......؟'' شرزمہ کو اس اجنبی لڑکی کی بے تکلفی نے کوفت میں مبتلا کیا۔
''جی، ایسا کچھ نہیں کرتی میں......'' اپنی طرف سے اس نے بڑا مختصر جواب دیا۔
''لو کچھ نہ کچھ تو کرتی ہو گی، ورنہ بغیر محنت کے بھلا بالوں میں اتنی چمک کیسے آ سکتی ہے......'' اس کا روکھا لہجہ بھی مدِمقابل کا حوصلہ پست نہیں کر سکا۔ وہ بڑی ستائشی نظروں سے اس کے بھورے بالوں کی پنڈولم کی طرح جھولتی پونی کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے آج پھر بے پروائی سے اونچی سی پونی بنا کر ہیر بینڈ میں جکڑ رکھا تھا۔
''میں نے بتایا ناں کہ میں ایسا کچھ نہیں کرتی......'' اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھنجلاہٹ کے رنگ ابھرے۔
''اٹس امیزنگ یار......'' وہ بھی اب ٹانگیں اٹھا کر بڑی فرصت سے بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ بے تکلفی کا یہ مظاہرہ شرزمہ کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اس لیے وہ قدرے رخ موڑ کر لاتعلقی سے بیٹھ گئی۔
''ویسے میں اس خوب صورت ''ڈول'' (گڑیا) کا نام پوچھ سکتی ہوں......'' اس لڑکی کی آنکھوں میں شرارت کے بھی رنگ تھے۔
''شرزمہ حسن......'' اس نے سامنے درخت پر چھلانگیں لگاتی گلہری کو دیکھ کر بے توجہی سے کہا۔
''کیا مطلب ہے شرزمہ کا......؟'' اس نے اشتیاق بھرے انداز سے پوچھا۔
''مجھے علم نہیں، میرے پاپا نے یہ نام رکھا تھا......'' وہ قدرے ناگواری سے بولی۔
''بھئی صبح ضرور پوچھ کر آنا، بہت خوب صورت نام ہے تمہارا، بالکل تمہارے جیسا۔'' اس کے شریر انداز پر شرزمہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی اور دل میں کرب کی ایک لہر سی اٹھی۔
''سوری، میں ان سے نہیں پوچھ سکتی......'' اس کے لہجے میں ایک فطری سا رنج جھلکا۔
''وہ کیوں بھئی......؟'' وہ چونکی۔ ''کیا وہ بھی میری ماما کی طرح ہٹلر جیسا مزاج رکھتے ہیں......'' اس لڑکی کے لبوں پر خاصی لطف لیتی ہوئی مسکان ابھری۔
''نہیں، ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے......'' اس کی اطلاع نے اگلے چند لمحوں کے لیے مدِمقابل کا منہ بند کر دیا تھا۔
''اوہ، آئی ایم سوری......'' وہ شرمندگی کے احساس سے مغلوب ہو کر اتنا ہی کہہ سکی۔ شرزمہ اس سے بے نیاز اب بھی آنکھیں بند کیے سستی اور بے پروائی سے بیٹھی رہی۔ جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ آج آخری کلاس نہیں ہوئی تھی اور پوائنٹ چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے وہ اس برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے نصب بینچ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔
''مجھے نویرہ ابراہیم کہتے ہیں، میں بی بی اے کی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' اس کی خاموشی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اپنے تعارف کا مرحلہ نبٹایا۔ شرزمہ نے محض ہلکا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس کا بالکل بھی بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم مجھے لفٹ نہیں کراؤ گی تو میں تمہاری جان چھوڑ دوں گی......'' اس کے شوخی سے لبریز انداز پر شرزمہ کو جھٹکا لگا۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے بیٹھی نازک سی خوب صورت لڑکی کو دیکھا جو بلیو جینز پر پنک ٹاپ پہنے شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''چلو شرافت سے اٹھو، دونوں کینٹین چل کر کافی

کے ساتھ سینڈوچ مزے سے کھاتے ہیں......'' اس کی بے تکلفی نے شرزمہ کو حیرت میں مبتلا کیا۔

''جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں' میں ان سے ایسے ہی زبردستی دوستی کر لیتی ہوں......'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے دوستانہ انداز میں اپنی انتہائی عجیب عادت بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ شرزمہ اب کوفت بھری جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے مجھے کہیں نہیں جانا......'' اس نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلی۔

''کیا ہوا......؟'' نویرہ نے فکرمندی سے اس کا ماتھا چھوتے ہوئے کہا۔ ''اوہ مائی گاڈ لڑکی تمہیں تو اچھا خاصا ٹمپریچر ہے، میں سمجھی کہ شاید میری باتوں کی وجہ سے غصے سے سرخ ہو رہی ہو یا پھر بلش آن کا استعمال میری طرح کچھ زیادہ کر لیا ہے۔ فوراً اٹھو، میڈیکل سینٹر چلتے ہیں۔ حد ہو گئی ہے بے پروائی کی۔'' وہ اب اس کا بیگ، فائل اور بازو پکڑے تشویش زدہ انداز میں اسے اٹھا رہی تھی۔

''کیا مصیبت ہے......'' شرزمہ نے یہ جملہ صرف سوچا تھا زبردستی لب بھینچے وہ مجبوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بھلا کوئی مجھ سے زیادہ بھی اپنی ذات کے معاملے میں بے پروا ہو سکتا ہے مگر تم تو مجھ سے بھی چار ہاتھ آگے ہو......'' اس باتونی لڑکی کی باتوں میں خلوص اور فکرمندی جھلک رہی تھی۔ شرزمہ نے بے بس نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں بہت ضدی، ہٹ دھرم اور انتہائی ڈھیٹ لڑکی واقع ہوئی ہوں' تم دل ہی دل میں چاہے مجھ سے جان چھڑانے کے جتنے مرضی طریقے سوچ لو، آج تمہاری ایک بھی نہیں چلے گی۔'' اس نے شرزمہ کے دل میں ابھرتی سوچوں کو بڑی تیزی سے پڑھا۔

''مجھے کچھ دنوں سے ملیریا کی شکایت ہے شاید اسی وجہ سے حرارت محسوس ہو رہی ہے......'' شرزمہ نے بالآخر اس کے سامنے ہتھیار پھینک ہی دیے تھے۔ وہ محترمہ بھی آج ''زبردستی'' اور ''ڈھٹائی'' کے تمام ریکارڈ توڑنے کے چکروں میں تھی۔ اسے میڈیسن دلوا کر اس کے نہ، نہ کرنے کے باوجود اپنے سبز رنگ کی ''رش'' کار میں انتہائی ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ اسے گھر تک چھوڑنے آئی۔

''میں نے آج تمہاری جتنی کیئر کی ہے کل تم مجھے یونیورسٹی کیفے میں قیمے والے سموسے اور ویجی ٹیبل رول کھلاؤ گی، میں ٹھیک گیارہ بجے کیفے پہنچ جاؤں گی۔'' اس کی آخری فرمائش پر وہ ہکا بکا رہ گئی جبکہ وہ اپنی گاڑی کسی میزائل کی طرح نکال کر لے گئی۔

''ان محترمہ کو اگر اتنی مہنگی ماچس کی ڈبی جتنی چھوٹی گاڑی لینی ہی تھی تو گاڑی کا رنگ تو ڈھنگ کا لے لیتیں، اب بندہ پوچھے کہ یہ طوطے جیسا سبز رنگ کتنا واہیات لگتا ہے۔'' اسود جو ہاتھ میں ٹوکری اٹھائے ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ شرزمہ اس کے بے تکلف تبصرے پر مسکرا دی۔

''ہنی آ گئیں......؟'' شرزمہ کے سوال پر وہ ہنسا۔

''خیر سے وہ ''ڈرامے باز'' خاتون پروفیسر صاحب کے ساتھ سیاست پر تبصرہ فرما رہی ہیں ہمارے پورشن میں۔'' اسود نے تھوڑا سا جھک کر راز داری سے کہا۔ ''اندر مینگو آئس کریم کا دور چل رہا ہے آپ بھی فوراً پہنچ جائیں۔''

''آپ کی ہنی سے صلح ہو گئی......؟'' شرزمہ کے منہ سے یک دم پھسلا اگلے ہی لمحے وہ اس کے جاندار قہقہے سے خفت کا شکار ہوئی۔

''صلح ہو گئی ہے۔ اسی لیے یہ ٹوکری لے کر مرکز میں کریلے لینے جا رہا ہوں کیونکہ عزت مآب فضلو صاحب نے اتنی دھوپ اور گرمی میں مارکیٹ جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔''

''اچھا تو آپ کا آج کریلے گوشت کھانے کا موڈ ہے......'' اس نے دھوپ کی شدت سے بچنے کے

لیے ہاتھوں کا چھجا سا بنا کر آنکھوں کے اوپر رکھا۔

''میرا نہیں، لیڈی ڈیانا کا موڈ ہے۔ جناب، ہم تو بس فرمائشیں پوری کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔'' وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔

''یہ ہنی بھی بعض دفعہ حد ہی کر دیتی ہیں......'' وہ ہلکا سا جھنجلائی۔

''آپ ہنی کو اندر جا کر کوس لیجیے گا، باہر بہت گرمی ہے......'' اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا۔ اس بات کا شرزمہ کو بھرپور احساس تھا لیکن وہ اس معاملے میں قطعی بے بس تھی اسی لیے جھنجلاہٹ کے گہرے احساس کے زیر اثر وہ اندر آئی اور نیچے جانے کے بجائے غصے سے اپنے پورشن کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆☆☆

''اس گھر میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے......'' الماس بیگم نے اندر آتے ہی اے سی کی کولنگ بڑھائی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے سب لوگوں کا......'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پرس سامنے صوفے پر اچھالا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔

''خیر سے اب کون سی بات آپ کے نازک مزاج پر گراں گزری ہے......!'' اسکواش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ابراہیم صاحب نے اپنی بیگم کو غلط موقع پر چھیڑا۔

''یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے ورنہ ان ملازموں کی کیا مجال کہ کوئی ہڈ حرامی کا مظاہرہ کر سکے۔'' ان کی آنکھوں سے شرارے نکلے۔

''بیٹا ذرا اے سی اور تیز کر دیں، آپ کی ماما کے دماغ کو گرمی لگ گئی ہے......'' ابراہیم صاحب نے قدرے فاصلے پر لیپ ٹاپ میں مصروف نویرہ کو ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ آج جمعے کی وجہ سے وہ جلدی گھر آ گئے تھے۔

''یہ تو روز کا معمول ہے، پاپا، دفع کریں اب تو ڈائریکٹ فائر بریگیڈ کو فون کھڑکا دیا کریں......'' نویرہ نے ہلکے گلابی رنگ کے بریزے چکن کے سوٹ میں انار کی طرح سرخ ہوتی ہوئی اپنی ماما کو دیکھ کر شرارتاً کہا۔

''بی ہیو یور سیلف نویرہ............'' ان کے لہجے میں برہمی جھلکی تو اس کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہو گیا۔ باپ کی موجودگی کا لحاظ کر کے وہ دانستہ خاموش رہی۔

''پورے پندرہ منٹ مجھے گیٹ پر کھڑے رہنا پڑا۔ وہ چوکیدار کا بچہ اوپر حاضری لگوانے گیا ہوا تھا' ہزار دفعہ اسے سمجھایا ہے کہ گیٹ خالی چھوڑ کر مت جایا کرو مگر ان جاہلوں کو ایک دفعہ کی کہی ہوئی بات سمجھ تھوڑی آتی ہے......'' ان کا توہین آمیز انداز ابراہیم کے ساتھ نویرہ کو بھی سخت ناگوار گزرا لیکن انہوں نے تبصرہ کرنے سے پرہیز کیا۔

''اُف، اندر باہر ہر جگہ آگ برس رہی ہے۔ پتا نہیں یہ گرمی کا عذاب کب ختم ہو گا۔'' انہوں نے ریموٹ کنٹرول سے اے سی مزید تیز کیا۔

''کیا ہے ماما......؟ کمرے کو برف کا کارخانہ بنائیں گی......؟'' نویرہ نے ناک چڑھا کر مسز الماس کو دیکھا جو پانی کا دوسرا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی تھیں۔

''آپ کو کوئی پرابلم ہے تو اپنے روم میں چلی جائیں......'' انہوں نے زور سے گلاس سائڈ میز پر رکھا تھوڑا سا پانی چھلک کر میز کی شفاف سطح پر پھیل گیا۔

''میں پوچھتا ہوں عبدالرشید سے کہ وہ گیٹ کو چھوڑ کو کیوں دائیں بائیں نکل جاتا ہے......'' ابراہیم صاحب نے بیگم کا پارہ نیچے لانے کے لیے یونہی کہا۔

''وہ دائیں بائیں نہیں آج کل ڈائریکٹ ''اوپر'' کے پھیرے لگا رہا ہے۔ پتا نہیں آپ کی والدہ محترمہ نواسے کی آمد پر کون سا ریڈ کارپٹ بچھوانا چاہ رہی ہیں۔ سارے گھر کے ملازموں کی دوڑیں

لگوا رکھی ہیں......'' الماس بیگم کی برہمی عروج پر تھی۔

''ماضی میں کبھی ایسے ''ریڈ کارپٹ'' آپ بھی بچھوایا کرتی تھیں ماما......'' نویرہ کے منہ سے پھسلا۔

''تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ اپنی زبان پر کنٹرول رکھا کرو، ورنہ کسی دن ایسا علاج کروں گی کہ بولنا ہی بھول جاؤ گی......'' اُن کا لہجہ غضب ناک ہوا، ابراہیم صاحب نے بھی تنبیہی نظروں سے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو دیکھا جو مزاج میں اپنی ماں کا پرتو تھی۔

''نویرہ، تمیز سے بات کیا کریں اپنی ماما سے، اٹھیں اور کچن میں جا کر صفیہ بی بی سے کہہ کر لنچ کی ٹیبل سیٹ کروائیں۔'' باپ کے سامنے بولنے کی جرأت وہ بہت کم کرتی تھی اس لیے مجبوراً اسے اٹھنا ہی پڑا۔

''میں کہتی ہوں عبیرہ کے ساتھ ساتھ اسے بھی رخصت کریں، بہت پر پُرزے نکالنے لگی ہے، اوپر سے آپ نے اس کی فرمائشیں پوری کر کر کے دماغ خراب کر رکھا ہے......'' الماس بیگم کے تلخ لہجے پر اس نے غصے سے مڑ کر انہیں دیکھا لیکن پاپا کی موجودگی کی وجہ سے مصلحتاً خاموش رہی۔

''ابھی بی بی اے کا فرسٹ سمسٹر ہے اس کا اور ایسے میں اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔'' ابراہیم صاحب کی قوتِ برداشت پر کبھی کبھی الماس بیگم کو رشک آتا تھا اب بھی وہ سخت حیرت سے اپنے مجازی خدا کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جو انتہائی پُرسکون انداز میں ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کی بات پر نویرہ نے سکون کی سانس لی۔

''اس نے ایکسیڈنٹ کر کے اپنی اچھی خاصی آلٹو کا ستیاناس کر دیا اور آپ نے اگلے ہی دن نئی گاڑی لا کر پورچ میں کھڑی کر دی، ایسے میں لاڈلی بیٹی کا دماغ ساتویں آسمان پر ہی پہنچے گا۔'' الماس بیگم کو بڑے موقع پر ابراہیم صاحب کی ایک اور کوتاہی یاد آئی کچھ ان دنوں وہ ویسے ہی نویرہ سے سخت تپی ہوئی تھیں۔

''آپ بھی کیا بچوں کی طرح ایک ہی بات کے پیچھے پڑ جاتی ہیں، میں نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ یونیورسٹی جائے گی تو اسے نئی گاڑی لے کر دوں گا۔'' انہوں نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ چینل تبدیل کیا۔

''ہاں، پہلے بڑی کا بھی ایسے ہی دماغ خراب کیا تھا آپ نے......'' ان کے تلخ لہجے پر ابراہیم صاحب نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا اور ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کرتے ہوئے انہوں نے بے اختیار سوچا کہ کاش کوئی ایسا ریموٹ کنٹرول بھی ایجاد ہو جاتا جس سے بیوی کی زبان کو بند کیا جا سکتا۔

''نویرہ، کھانا لگنے میں کتنی دیر ہے......؟'' وہ ڈائننگ روم کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولے۔

''بھائی جان کھانا لگ گیا ہے، کھانا کھا کر آپ اماں سے مل آیئے گا، انہیں آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' رومیصہ بڑی عجلت میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں۔

''تم نے یہ اوپر کی ''پیغام رسانی'' کب سے شروع کر دی ہے۔ اب ان سے نوالہ توڑنا بھی دشوار ہو جائے گا۔'' الماس بیگم کو اپنی چھوٹی بہن پر ایک دم ہی غصہ آیا ان کے طنزیہ انداز پر انہوں نے بیزاری سے پہلو بدلا۔

''میرا خیال ہے کہ میں کھانا بھی اوپر ہی کھا لیتا ہوں، ورنہ یہاں تو تلخ لفظوں کی بمباری ہی سننے کو ملے گی......'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھے اور اوپر کی طرف بڑھ گئے۔ رومیصہ نے خوفزدہ نظروں سے اپنی بہن کو دیکھا۔

''لو آ گیا سکون اب تمہیں بھی......'' ان کے طنزیہ انداز پر رومیصہ تھوڑا سا خائف ہوئیں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب سارا نزلہ انہی پر گرے گا۔

''رومی خالہ، اوپر انعم نے شور مچا رکھا ہے۔ اسے بھوک لگی ہوئی ہے پلیز اسے کھانا دے آئیں ورنہ وہ چیزیں توڑنا شروع کر دے گی......'' نویرہ کی بات پر وہ چونکیں، سر اٹھا کر اپنی بھانجی کو دیکھا جو آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اس منظر سے غائب ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے ماں کے پارے کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ وہ اب سارا غصہ اپنی چھوٹی بہن پر نکالیں گی جو ''اوپر'' والوں کا پیغام ''نیچے'' پہنچانے کی غلطی کر چکی تھیں۔

''ہاں، میں دیکھتی ہوں......'' وہ عجلت بھرے انداز میں کمرے سے نکلیں۔ انہیں معلوم تھا کہ نویرہ نے محض انہیں بچانے کے لیے جھوٹ بولا ہے ورنہ انعم کو تو وہ کھانا کھلا کے اور سوتا ہوا چھوڑ آئی ہیں۔ انہیں دل ہی دل میں اپنی اس منہ پھٹ سی بھانجی پر پیار آیا جو دل کی بہت اچھی تھی۔ الماس بیگم اب اپنا سارا غصہ صفیہ بی بی پر نکال رہی تھیں جنہوں نے قیمہ بھری بھنڈیاں بنائی تھیں۔ حالانکہ صبح کالج جاتے ہوئے وہ یہ مینیو خود بتا کر گئی تھیں لیکن ان کے اشتعال بھرے انداز پر کون انہیں یہ یاد دلانے کی غلطی کرتا۔ نویرہ بھی اپنے باپ کے پیچھے ہی اوپر کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''اوہ پوستی لڑکی......ذرا نیچے جا کر دیکھو کہ اپنی محنت سے لان میں جشنِ بہاراں آ چکا ہے......'' ہمنی مٹی سے بھرے ہاتھوں کے ساتھ اوپر آئی تھیں اور آتے ہی بڑے جوش کے ساتھ شرزمہ کو اطلاع دی۔ جو کارپٹ پر کتابوں کا ڈھیر پھیلائے مطالعے میں مصروف تھی۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا جن کے بال بھی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔

''بھئی مجھے پروفیسر صاحب نے چیلنج کیا تھا کہ

عید کا چاند

اب کے پھر عید کا دن آن پہنچا
نیلے آکاش پہ نکلا ہے ابھی عید کا چاند
بخت والوں کے لیے عید کا سندیس لیے
بجھتی آنکھوں کے لیے دید کا سندیس لیے
سارے چہروں سے تھکن دور ہو جاتی ہے
ہجر والوں کی چبھن دور ہو جاتی ہے
چاند نکلا ہے شبِ وصل کا سندیس لیے
کہکشاں بخت مسافر کے پلٹنے کی نوید
ہر کرن ہاتھ میں تھامے آئی
چاند نکلا ہے مگر حسرت سے
چاند کی سمت میری آنکھیں تکے جاتی ہیں
چاند آکاش سے تکتا ہے مگر آنکھ چرا لیتا ہے
میری آنکھوں کی نمی، سوالوں کی چبھن
اس سے دیکھی نہیں جاتی شاید
میری گویائی میرا ساتھ نہیں دے پاتی
کہ میں اس سے تیری بابت پوچھوں
اس سے پوچھوں کہ بتا میرے مقدر کے نجوم
کن اندھیروں میں ہوئے ٹوٹ کے ریزہ ریزہ
چاند آنکھوں کو چرا کر مجھ سے
نہ جانے کیوں ٹال رہا ہے یہ سوال
کیا میرے بخت میں اب کے بھی نہیں
عید کا لمحہ......وصال
کیا پلٹ کر نہیں آئے گا وہ جانے والا
کیا میری عید فقط اب کے بھی
اِک اور نیا دن ہو گئی
دن بھی ایسا جو قیامت سا گزرتا ہے سدا
درد کے رنگ میری آنکھوں میں بھرتا ہے سدا
بے کلی، درد، سلگتی یادیں
درد کو اور جگا دیتی ہیں
کرب کو اور بڑھا دیتی ہیں
میری بے رنگ ہتھیلی پہ دعا کی تتلی
آخری سانس کی حد پر پہنچی
میری امید کے سارے جگنو
بجھتی آنکھوں میں بجھے جاتے ہیں
ہونٹ ہنسنے کے ہنر سے عاری
دل دھڑکنے کی روایت سے جدا
آنکھوں سے خواب رنگ
مر گئے حرفِ دعا
ٹوٹتی سانسوں کے ہونٹوں پہ
فقط سرد سی آہ......!

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

میں ان کے لان کا حلیہ نہیں بدل سکتی اور تمہیں پتا ہے کہ ہانیہ مصطفیٰ کو کوئی چیلنج کر کے جائے گا کہاں......'' وہ ٹشو باکس سے گلابی ٹشو کافی سارے نکال کے ان سے ہاتھ اور منہ صاف کر رہی تھیں۔

''کسی اور کا تو مجھے پتا نہیں لیکن پلیز آپ واش روم ضرور چلی جائیں تاکہ شاور لے کر اپنا حلیہ درست کر سکیں......'' شرزمہ نے منہ بنا کر انہیں مشورہ دیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ پچھلے دو دن سے لان کے پیچھے ہاتھ منہ دھو کر پڑی ہوئی تھیں۔

''بہت خبیث چیز ہو تم......'' وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ ''کیا بہت بری لگ رہی ہوں میں......؟'' انہیں ایک نئی فکر نے گھیرا۔

''بہت بری کا تو پتا نہیں لیکن مٹی کی شہزادی ضرور لگ رہی ہیں......'' کیلکولیٹر پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''اوہ نو......!'' وہ جھٹکے سے اٹھیں اور فوراً اپنے بیڈروم کی طرف لپکیں، آدھے گھنٹے کے بعد وہ بالکل تروتازہ دو چائے کے کپ لیے اس کے سامنے تھیں۔

''یہ تو بہت نیکی کا کام کیا آپ نے ہنی......'' شرزمہ نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے انہیں تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔

''پروفیسر صاحب بھی مجھے یہی کہہ رہے تھے کہ ہانیہ آپ نے ہمارے لان کا حلیہ درست کر کے بڑی نیکی کا کام کیا ہے......'' ایک فخریہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر جگمگائی۔ شرزمہ نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''میں اور اسود صبح سے شہر کی ساری نرسریوں کی خاک چھان کر عشق پیچاں، گلِ داؤدی، گلِ بنفشہ، چمپا، چھوئی موئی، موگرا، چنبیلی اور رات کی رانی کے پودے لے کر آئے تھے۔ لان میں کیاریاں بنوائیں، اپنی نگرانی میں پودے لگوائے اور اب جا کر ذرا لان میں دیکھو کہ کیسی بہار آئی ہوئی ہے......'' ہانیہ نے بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔

''ہنی کیا پودوں، درختوں اور موسموں میں بہار آنے سے انسان کی زندگی میں بھی بہار آ جاتی ہے......؟'' وہ بال پوائنٹ اپنی تھوڑی پر رکھے بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں کیوں نہیں، باہر کے موسم انسان پر اثر انداز تو ہوتے ہیں سوئٹ ہارٹ......'' انہوں نے بڑے پیار سے اس کے گال پر جھولتی لٹ کو کھینچا۔

''ایسا نہیں ہوتا ہنی......'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''انسان کے اندر کے موسم باہر کی دنیا کے محتاج نہیں ہوتے، ایسا ہوتا تو خزاں میں کوئی بھی خوش نظر نہ آتا اور بہار کے موسم میں ہر دل خوشی کے گیت گاتا، رقص کرتا اور گنگناتا ہوا نظر آتا۔''

''تم بہت ہی مشکل باتیں کرتی ہو شیری......'' ہنی تھوڑا سا الجھیں۔

''کوئی چیز بھی مشکل نہیں ہوتی، بات صرف ایک نکتے کے سمجھ آنے کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ساری پہیلیاں حل ہو جاتی ہیں۔ کوئی معما، معما نہیں رہتا۔ ہر چیز کھلی کتاب بن جاتی ہے۔'' وہ تھوڑا سا ہنسی اور ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ سے ہنی کے گال پر اسٹار بنانے کے لیے آگے کو جھکی۔

''اوں ہوں؟ یہ بچوں والی عادت تمہاری ابھی ختم نہیں ہوئی......'' ہنی کے لہجے میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ انہیں شیری کی اس عادت سے الجھن تو ہوتی تھی لیکن انہوں نے اسے کبھی اسٹار بنانے سے روکا نہیں تھا۔

''ہم لوگ کتنے عجیب ہیں جو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ جن کو کرنے سے دل میں خوشی کا بے ساختہ سا احساس اٹھتا ہے۔ ہم ان پر ''بچکانہ'' کا لیبل لگا کر خود کو ان خوشیوں سے محروم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اچھی طرح پتا ہے کہ ان چھوٹی، چھوٹی چیزوں میں بڑی، بڑی خوشیاں چھپی

ہوتی ہیں جو ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہیں لیکن ہم ''بڑے'' ہونے کا تمغہ گلے میں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر فطری خوشی کے انمول احساس کو ترستے رہتے ہیں......'' اس کا انداز قدرے فلسفیانہ لیکن بظاہر بے پروائی کا عنصر لیے ہوا تھا۔

''تم ایسی باتیں کیسے کر لیتی ہو جانِ من......؟'' ہانیہ نے سخت تجسس سے اس کا پُرسکون چہرہ دیکھا۔

''کیسی باتیں ہنی......؟'' وہ اب ہنی کے چہرے پر بنے ستارے کو بڑی ستائش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہی اتنی بڑی، بڑی اور مشکل باتیں......''

''آپ کو مشکل لگتی ہیں لیکن یہ ہیں نہیں......'' اس نے ان کا ہاتھ دبا کر تسلی دی تو ایک پُرسکون سی سانس ان کے لبوں سے خارج ہوئی۔

''پروفیسر صاحب بتا رہے تھے کہ تم سارا دن یونیورسٹی میں اکیلے گھومتی رہتی ہو اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لان کے ایک بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے تنہا، سوچوں میں گم بیٹھی رہتی ہو۔'' انہیں اچانک ہی یاد آیا۔

''انہیں کیسے پتا چلا......؟'' شرزمہ کو جھٹکا سا لگا۔

''لو انہیں کیسے پتا نہیں چلے گا، تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں ہی تو وہ ہوتے ہیں۔ ان کے آفس کی کھڑکی اسی لان میں کھلتی ہے اور پھر اسود بھی آج کل وہیں سے اپنا پی ایچ ڈی کا تھیسس کرتے ہوئے ساتھ وزیٹنگ فیکلٹی کے طور پر کام کر رہا ہے۔'' ان کی معلومات بالکل اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔

''اچھا، مجھے علم نہیں اور نہ ہی میں نے ان دونوں کو کبھی کیمپس میں دیکھا......'' اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''تمہیں یونیورسٹی میں گئے ہوئے جمعہ، جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ابھی اور پھر تمہیں اپنے اردگرد کا ہوش بھی کب ہوتا ہے۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا تھا جو بُرے بُرے سے منہ بنا کر دوبارہ اپنے اسائنمنٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ویسے بھی پروفیسر صاحب تو شاید ایم بی اے اور ایم ایس کی کلاسز لیتے ہیں اور اسود اگلے سمسٹر میں شاید تمہیں کوئی سبجیکٹ پڑھائے۔'' ہنی نے ایک اور اطلاع دی لیکن وہ خاموش رہی۔

''پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ اسٹڈی میں کوئی پرابلم ہو تو تم ان کی مدد لے سکتی ہو......'' ہنی نے ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے اسے کہا۔

''تو تھینکس.........'' اس نے لٹکا سا جواب دیا اور اپنی فائل پر جھک گئی۔ سارے دن کی تھکی ہنی اب فلور کشن سر کے نیچے رکھے مزے سے لیٹ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار عروج پر تھا۔ اگلے ہی دس منٹ میں وہ گہری نیند میں تھیں اور شرزمہ ان کے سونے کے بعد سوچ رہی تھی کہ اس نے پروفیسر صاحب اور اسود کو ڈیپارٹمنٹ میں کیوں نہیں دیکھا۔ جبکہ اسے کیمپس جاتے ہوئے بھی ایک ماہ ہونے کو تھا۔

☆☆☆

''یہ خیر سے نیچے ''سونامی'' کس خوشی میں آیا ہوا ہے......؟'' وہ جو ماما کی نظروں سے چھپ کر ارسلان کے لیے کڑھی چاول لائی تھی۔ اس کی بات پر مسکرائی۔ جبکہ کچن میں رکھی چھوٹی میز اور کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھا وہ اب ابلے ہوئے سفید چاولوں پر کڑھی ڈال کر شروع ہو چکا تھا۔ ارسلان، ابراہیم صاحب کا بھتیجا اور نویرہ کا چچا زاد کزن تھا۔

''تمہیں پتا تو ہے کہ ماما کو ''شروع'' ہونے کے لیے کسی خاص ''وجہ'' کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' نویرہ کے لہجے میں اکتاہٹ اور بیزاری تھی۔ ''یہ سب لوگ کہاں غائب ہیں؟ بڑی خاموشی ہے آج یہاں......؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے

ہوئے حیرت سے دریافت کیا۔
''ماما اور حرا بھابی کچن کی خریداری کے لیے ''میٹرو'' گئی ہیں جبکہ دادو ظہر کی نماز پڑھ کر قیلولہ کر رہی ہیں، تم سناؤ کہ کہاں غائب تھیں، مجھے آئے ہوئے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے ہیں اور تمہیں اب خیال آیا ہے......؟'' وہ گہری نظروں کے حصار میں اسے لیے بڑے شکوہ کناں لہجے میں بولا۔ جبکہ وہ میدان صاف پا کر بڑی فرصت اور بے تکلفی سے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال چکی تھی۔
''یار ماما کا مزاج ویسے تو ہمیشہ ہی برہم رہتا ہے لیکن آج کل تو سوا نیزے پر ہے۔ سخت قسم کے آرڈرز آئے ہیں کہ کوئی اوپر نہیں جائے گا، ورنہ کورٹ مارشل ہو جائے گا۔'' وہ چمچ اٹھا کر اس کے ساتھ ہی پلیٹ میں کھانا شروع ہو گئی۔ دونوں میں کمال کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔
''یہ تائی اماں کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے......ان کو کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو کیوں نہیں دکھاتے تم لوگ......؟'' مفت مشورہ حاضر ہوا۔
''ہزار دفعہ کہا ہے کہ ان کو ''تائی اماں'' مت کہا کرو، سخت چڑتی ہیں وہ اس طرح مخاطب کیے جانے سے مگر تم بھی اپنے نام کے ایک ہی ڈھیٹ ہو......'' نویرہ نے ناگواری سے اسے دیکھا جو مزے سے چاول کھا رہا تھا۔
''اسی لیے تو انہیں تائی اماں ہی کہتا ہوں، جب وہ اپنے ماتھے کی تیوری چڑھا کر کھا جانے والی نظروں سے میرے سلام کا جواب دیتی ہیں، قسم سے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔'' ارسلان نے اچار کے مرتبان سے ایک ہری مرچ نکال کر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے شرارت سے کہا۔
''کسی دن سر توڑ دیں گی وہ کپتان صاحب کا، ویسے بھی تم جب سے لیفٹیننٹ سے کیپٹن بنے ہو، ماما کو تم پر ضرورت سے زیادہ ہی غصہ آنے لگا ہے......'' نویرہ نے ہنستے ہوئے اسے اطلاع دی تو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''کیوں، میں نے ان کی کون سی بھینس چرا لی ہے......؟''
''وہ کہتی ہیں کہ پہلے کم بدتمیز تھا جو کندھے پر تین خانوں والا بیج بھی لگ گیا۔ اب موصوف کی گردن میں مزید ''سریا'' لگ جائے گا......'' نویرہ نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
''اللہ پوچھے تائی اماں آپ کو، جو مجھ معصوم کے پیچھے ہاتھ منہ دھو کے پڑ گئی ہیں......'' اس نے بھی معصومیت کے سارے ریکارڈ توڑے۔
''تو تم بھی تو کون سا کسی سے کم ہو، ہزار دفعہ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے ''آنٹی'' کہا کرو مگر تم نے بھی دانت چبا چبا کر انہیں ''تائی'' کہہ کر ''تاؤ'' دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
''جس دن وہ چڑنا چھوڑ دیں گی، میں بھی انہیں آنٹی کہنا شروع کر دوں گا......'' اس نے شانِ استغنا سے جواب دے کر پاؤں پھیلائے۔ وہ اب بڑے غور سے اپنی اس پُرخلوص سی کزن کو دیکھ رہا تھا جس نے اس دوستی کو نبھانے کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ الماس بیگم سے کئی دفعہ بچپن میں اس کی پٹائی ہوئی، جیب خرچ پر پابندی لگی اور اسٹور میں بند کیا گیا لیکن اس نے ارسلان کے ساتھ کھیلنا بند نہیں کیا۔
''کیا ہوا......اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو......؟'' نویرہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔
''دیکھ رہا ہوں کزن تم روز بروز خوب صورت نہیں ہوتی جا رہی ہو......'' اس نے سراسر اسے چھیڑا تھا۔ وہ اس کی بات پر تھوڑا سا بلش ہوئی۔
''روز بروز سے کیا مراد ہے تمہاری؟ میں شروع ہی سے حسین و جمیل ہوں......'' اس نے بھی اپنے فرضی کالر کھڑے کیے۔
''حسین و جمیل کا تو پتا نہیں، ہاں خوش فہم تم شروع ہی سے ہو، خیر سے......'' اس نے چڑایا اور وہ چڑ بھی گئی۔
''جیسے تم فلرٹی تو پیدائشی تھے، آرمی میں جانے سے اس میں چار چاند لگ گئے۔''
''ارے لڑکی ہم پاک فوج کے جوانوں کی وجہ سے ہی تم لوگ بے فکری کی نیند سوتے ہو، قدر کیا کرو ہماری......''
''اپنے ملک کا ڈھیر سارا بجٹ تو دے دیا ہے تمہیں اور کیا قدر کریں مزید......؟'' اس نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا جو اس کے غصے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔
''مائی گاڈ، کتنا بغض رکھتے ہو تم لوگ، توبہ توبہ......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
''خیر بغض تو نہیں رکھتے، اپنی تمام فورسز سے ہمیں بے انتہا محبت ہے، سمجھے......'' اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔
''اچھا......؟ محبت ہے......بھلا کتنی......؟'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔ اس کے معنی خیز انداز پر نویرہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ اس نے بے ساختہ ہی اس سے نظریں چرائیں۔ جبکہ ارسلان نے اس کے رخساروں پر پھیلی سرخی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

''آپ نے کبھی محبت کا خوب صورت چہرہ دیکھا ہے......؟'' پروفیسر صاحب اچانک ہی اس کے پاس پڑی خالی کرسی پر آن بیٹھے۔ وہ جو سامنے ایک نازک سی پھولوں کی ٹہنی پر جھولتی نیلی چڑیا کو غور سے دیکھ رہی تھی چونک گئی۔ اس نے دائیں طرف کندھا موڑ کر ہلکے آسمانی رنگ کے کُرتہ شلوار میں ملبوس پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ جن کی شیو بڑھی ہوئی اور سرخ آنکھیں رتجگے کی غمازی کر رہی تھیں۔ بے چینی ان کے وجود سے مترشح تھی۔ وہ نہ جانے کیوں آج افسردہ افسردہ تھے۔
''کیا محبت کا کوئی بدصورت چہرہ بھی ہوتا ہے......؟'' اس کے چہرے پر حیرت دیکھ کر وہ افسردگی سے مسکرائے۔
''ہاں، محبت کا ایک چہرہ بدصورت بھی ہوتا ہے، جب محبت ''خود غرضی'' کی قبا اوڑھ لیتی ہے تو اس کی آنکھوں سے حیا غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے دل میں ''ذات'' کے بجائے ''وجود'' کی چاہ ''ہوس'' بن کر اس کے انگ انگ سے نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ایسی محبت کا لنگڑا پن ایک ہی جھٹکے میں سامنے آ جاتا ہے۔ وہ اپنے ''کبڑے پن'' کے ساتھ دیکھنے والے کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے ایسی محبت کو ہم بدصورت نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے......؟'' انہوں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ گڑبڑا سی گئی۔
''اس چیز کو ہم محبت کیسے کہہ سکتے ہیں......؟'' اسے تعجب ہوا تو وہ ایسے مسکرائے جیسے کوئی بڑا کسی بچے کے معصوم سوال پر مسکراتا ہو۔
''فی زمانہ ایسی ہی چیزوں کو محبت کا نام دیا جا رہا ہے......'' انہوں نے آسمان پر پھیلی سرخی کو غور سے دیکھا۔ ڈوبتا سورج دل کو عجیب سا احساس بخشتا تھا۔
''لیکن محبت کے نام سے تو ایک خوب صورت چیز کا خیال ہی ذہن میں آتا ہے جیسے ''نفرت'' جیسے جذبے کا خیال آتے ہی بدصورتی ذہن کی آماجگاہ بن جاتی ہے......'' وہ بے دھڑک انداز سے بولی تو انہوں نے فوراً کہا۔
''بعض ''محبتیں'' اتنی بدصورت ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلے میں ''نفرت'' کا جذبہ اچھا لگنے لگتا ہے کیونکہ اس میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ خالص ہوتا ہے جیسا ہوتا ہے ویسا ہی دکھائی [illegible] ہے۔ اپنے

چہرے پر کوئی اور نقاب اوڑھ کر دوسروں کو فریب نہیں دیتا۔ جبکہ محبت کے نام کے دھوکے سے تو کسی کے پیروں کے نیچے کی زمین بھی کھینچی جا سکتی ہے۔" ان کے لہجے میں ایک ان کہا دکھ ہلکورے کھا رہا تھا۔

"ہاں، یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......" شرزمہ نے ان کی نظروں کے تعاقب میں آسمان پر پھیلی سرخی کو دیکھا جس نے پورے آسمان پر ایک حشر برپا کر رکھا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول ایک قطار کی صورت میں واپسی کے سفر پر رواں دواں تھے۔ ان کے تھکن زدہ جسموں میں اپنے، اپنے گھروں کو لوٹنے کی ایک خوشی تھی جس نے ان میں توانائی کا ایک احساس بھر دیا تھا۔

"واپسی کا سفر لاکھ تھکا دینے والا ہو لیکن یہ احساس ہی زندگی کو خوب صورت اور آسان بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا منتظر ہوگا۔" پروفیسر صاحب نے پرندوں کو انہماک سے دیکھتے ہوئے اسے ایک دفعہ پھر مخاطب کیا۔ اس نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"آپ مصلحتاً اتنا کم بولتی ہیں یا عادتاً کم گو ہیں......؟" ان کی بات پر شرزمہ نے چونک کر ان کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"میں فطرتاً خاموش طبع ہوں، مجھے دوسروں کو سننا اچھا لگتا ہے......" اس نے سادگی کے ساتھ وضاحت کی۔

"جو لوگ کم گو ہوں یا مصلحتاً کم بولنے کے عادی ہوں ان لوگوں پر اپنے پیارے لوگوں کی سماعتوں کے بہت سے قرض واجب ہو جاتے ہیں اور قرض کی ادائیگی کہیں نہ کہیں تو کرنی پڑتی ہے ورنہ بہت سی غلط فہمیاں دلوں میں پنپنے لگتی ہیں۔" انہوں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مشورہ دیا۔ "آپ بولا کریں ورنہ سوچوں کو کائی لگنے لگتی ہے......"

"کیا بولوں......؟ میرے پاس کچھ بولنے کے لیے ہے ہی نہیں......" وہ شرمندگی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"پتا ہے شرزمہ، بعض لوگ صرف اس لیے کم بولتے ہیں کیونکہ انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ لوگ انہیں سمجھیں گے نہیں......" لان میں پھیلتی تیرگی کو غور سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"اچھا تو آپ کو سمجھدار ہونے کا دعویٰ ہے......" اس کی زبان پھسلی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"کسی اور کو تو نہیں، آپ کو سمجھنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں......" ان کی بات پر وہ سخت تحیر کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔

"جس لڑکی کا چہرہ اس کی خوب صورت سوچوں کی عکاسی کرتا ہو۔ جس کی سادگی اور دل کا خالص پن اس کی آنکھوں سے جھلکتا ہو۔ جس کی زبان جھوٹ کی تلخی سے نا آشنا ہو۔ جو فریب اور دھوکے کو گناہ سمجھتی ہو۔ جس کو انسانیت سے پیار ہو۔ اس لڑکی کو جاننے کا دعویٰ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔" ان کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔ پروفیسر صاحب نے بہ مشکل اس کے دائیں گال پر پڑنے والے گہرے ڈمپل سے نظریں چرائیں۔

"آپ کو کس نے کہا کہ میں ایسی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا۔ وہ زیر لب ایسے مسکرائے جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کے بچگانہ سوال پر مسکراتا ہے۔

"کیا آپ ایسی نہیں ہیں......؟" انہوں نے الٹا اسے لاجواب کیا۔ ان کی سحر انگیز نگاہیں شرزمہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"پتا نہیں......" وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے درخت کی کھوہ میں بیٹھی گلہری کو دیکھنے لگی جو آہستہ آہستہ نیلی چڑیا کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"آپ ایسی ہی ہیں، کبھی اکیلے میں بیٹھ کر اپنا احتساب کیجیے گا، یقین کریں آپ کو میری بات کا یقین آ جائے گا......" اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں فوراً اندر بڑھ گئے جبکہ شرزمہ سخت حیرت سے ان کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☆☆☆

"تمہاری شکل پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں، کیا کھیروں کے کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے......؟" وہ جو ابھی ابھی کارپٹ پر آ کر ڈھیر ہوا تھا ہنی کی بات پر چونکنے کی لاجواب اداکاری کرتے ہوئے خود ساختہ معصومیت سے بولا۔

"یہ کھیروں، گاجروں اور مولیوں کے کاروبار آپ خود کرتی رہی ہوں گی اسپین میں، مجھ معصوم کو کیا پتا ان چیزوں کا......"

"تم جیسے دو چار معصوم اور پاکستان میں آ جائیں تو ملک کا اللہ ہی حافظ ہے......" ہنی نے بال پوائنٹ اور کاپی ایک سائڈ پر رکھ کر اس کا رنجیدہ چہرہ دیکھا۔ شرزمہ اپنے اسائنمنٹ میں مصروف تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بے تکلف نہیں ہو پایا تھا۔

"خیر سے کیا ماجرا ہو گیا ہے......؟" انہوں نے کھوجتے لہجے میں استفسار کیا تو وہ منہ بنا کر بولا۔

"ایک تو یہاں آپ نے میری اچھی خاصی آرام دہ زندگی میں ہلچل مچا دی ہے۔ آپ کے بزنس نے میری رات کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا ہے اور اوپر سے ماما کو امریکا میں رہ رہ کر بارک اوباما کے لہجے میں بات کرنے کی عادت ہو گئی ہے......" اس کی ادھوری بات پر ہنی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے وضاحت کی۔

"ان پر آج کل میری شادی کروانے کی دھن سوار ہو گئی ہے۔ ویسے تو یہ دورہ ان کو ہر چھ ماہ بعد پڑتا ہے لیکن پچھلے کچھ عرصے سے ان دوروں کی شدت میں تیزی آ گئی ہے۔" اس نے انتہائی سنجیدہ بات بہت ہی غیر سنجیدہ انداز میں بتائی تو ہنی نے فوراً درمیان میں بات قطع کی۔

"وہ اپنے بھائی صاحب کی شادی تو پہلے کروائیں ناں۔"

"ان کے بھائی صاحب آج سے کچھ سال پہلے انہیں دو ٹوک، بے لچک اور قطعی انداز میں بتا چکے ہیں کہ ان کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش نہیں۔" اسود نے مزاحیہ انداز میں انکشاف کیا تو ہنی نے تحیر سے اسے دیکھا جو مزید کہہ رہا تھا۔ "ماما کی تمام تر جذباتی بلیک میلنگ ناکام رہی اور اب تو وہ بالکل ان سے مایوس ہو چکی ہیں۔"

"تو کیا ان کے والدین نے بھی کبھی نہیں کہا......؟" ان کی آنکھوں میں استعجاب کی لہر بہت تیزی سے ابھری۔

"والدین کا تو بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت موصوف پڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد ماما نے مجھے قربانی کا بکرا بنا کر پاکستان بھیج دیا کہ ماموں کے پاس رہو وہ اکیلے ہیں...... حالانکہ ان کو کسی کے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......" وہ شریر انداز میں گویا ہوا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا......؟"

"اصل میں ماما کو اپنے اکلوتے بھائی سے عشق ہے چنانچہ انہوں نے اپنی سب سے بڑی اولاد اس عشق پر قربان کر دی اور مجھے ماموں کی خدمت کے لیے پاکستان بھیج دیا جب میں نے اولیول کا ایگزام دیا تب سے یہاں ہوں۔" وہ اپنی داستان مزے سے سنا رہا تھا۔

"ہوں...... تو تمہاری ماما خود پاکستان کیوں نہیں شفٹ ہو جاتیں......؟" انہوں نے اپنی طرف سے ایک اچھا مشورہ دیا جو اسود کو بالکل پسند نہیں آیا۔

"کمال کرتی ہیں آپ بھی، ماما کیسے آ سکتی ہیں یہاں، امریکا میں ڈیڈ کا ایک اسٹیبلشڈ بزنس ہے اور پھر پاکستان میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں تو خود پروفیسر صاحب کی محبت میں یہاں ٹکا ہوا ہوں......" اس کے لہجے سے ہلکی سی برہمی جھلکی۔

”تو تم کسی خوشی میں یہاں ٹکے ہوئے ہو....؟“ ہنی نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

”میں تو خود ”کسی“ چکر میں یہاں ٹکا ہوا ہوں کہ ماموں کی خدمت کر کے جنت کما لوں......“ اس نے ایک آنکھ دبا کر ہانیہ کو اشارہ کیا جو شرزمہ کو سخت زہر لگا۔

”کہیں تم اس ”الجنت“ ہاؤس کے چکروں میں تو ماموں کی خدمتیں نہیں کر رہے، کروڑوں کی جائداد ہے آخر......“ ہنی بھی کون سا کسی سے کم تھیں ان کی بات پر وہ بلند آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”آپ تو بہت پہنچی ہوئی خاتون ہیں۔“ وہ اُن کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”ویسے صرف یہ الجنت ہی نہیں۔ ان کے دو پلاٹ اور پوری ایک مارکیٹ بھی ہے کمرشل..... میں۔“ وہ تھوڑا سا جھک کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ اس کی شرارت پر ہنی نے ایک جھانپڑ اس کے کندھے پر رسید کیا۔

”اس کروڑوں کی آسامی کو تو فوراً ہی شادی کر لینی چاہیے......“ ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہائے ہائے عشق نے غالب نکما کر دیا ماموں کو، ورنہ آدمی تھے وہ بھی کام کے......“ اس کی... غیر سنجیدہ بات میں کچھ تھا جو دونوں نے ہی چونک کر اسے دیکھا۔

”عشق......؟ اور پروفیسر صاحب کو......؟ واقعی...... کس سے......؟“ ہنی کو سخت تجسس ہوا جبکہ شرزمہ بھی اپنا اسائنمنٹ بنانا بھول گئی۔

”وہ ساحلوں کی ہوا جیسی لڑکی جو نیلے پانیوں کے لیے بنی تھی۔ اس لیے انجان سفروں پر جو نکلی تو پھر کبھی نہیں لوٹی۔“ اسود نے گول مول انداز میں امجد اسلام امجد کی ایک نظم کے مصرعے پر ہاتھ صاف کیا۔

”اوہ، کوئی بے وفائی کا سین ہے...... ہوں......“ ہنی کے سخت تجسس بھرے انداز پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”تو پروفیسر صاحب بھی ایسی بے وفا اور سرپھری لڑکی پر مٹی ڈال کر نئے جہان تسخیر کریں، وہ کیوں یادوں کا مقبرہ بنائے سوگ منا رہے ہیں۔“ ہانیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

”یہ معرفت اور عشق کی باتیں ہیں، آپ کی اور میری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ بس میرے لیے ایک خوب صورت لڑکی تلاش کریں جس کے بال لمبے اور گھنے ہوں۔“ اسود نے... کن انکھیوں سے شرزمہ کو دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا تو اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

”تم جیسے کنگلے کو کون احمق لڑکی دے گا......؟“ ان کے طنزیہ انداز پر وہ تڑپ کر بولا۔

”یہ کنگلا امریکن نیشنلٹی ہولڈر ہے۔ پڑھا لکھا، ہینڈسم اور اپنے ڈیڈ کے کروڑوں کے بزنس کا حصے دار، یہاں پاکستان میں ڈیڈ نے ساری پراپرٹی میرے نام پر خریدی ہے......“

”جو خصوصیات تم بتا رہے ہو اسے سن کر کسی بھی لڑکی کو تم میں کم اور تمہارے ڈیڈ میں انٹرسٹ زیادہ پیدا ہوگا......“ ہانیہ کے شرارت بھرے لہجے پر اسے سخت صدمہ ہوا۔

”اُف......!“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”آپ لڑکیاں کتنی مادہ پرست ہوتی ہیں۔ انسان سے کم اور اس کی جیب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

”تم لڑکے بھی تو کتنے خود غرض ہوتے ہو، لڑکی کی سیرت اور کردار کے بجائے اس کی شکل صورت پر مرتے ہو، پھر اچھی صورت والی تم جیسے سے شادی کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ تو دیکھے گی ناں......؟“ ہنی نے صاف اسے چڑایا تھا اور وہ چڑ بھی گیا۔

”یہ تم جیسے سے آپ کی کیا مراد ہے......؟“

”تم جیسے سے میری وہ ہی مراد ہے جو تم بجھے ہو......“ ہنی نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔ ”اب

ڈرامے بازی بند کرواور یہ بل چیک کرو، پتا نہیں کہاں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ سمجھ ہی نہیں آرہی۔“

”سمجھ آنے کے لیے دماغ کا ہونا ضروری ہے......“ اس نے فوراً ہی حساب برابر کیا تو ہنی اس کی بات پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ شرزمہ اس کی بات پر دل ہی دل میں محظوظ ہوتے ہوئے اپنے اسائنمنٹ پر جھک گئی۔ اس کے بعد دونوں جو حساب کتاب میں مگن ہوئے تو اگلے کئی گھنٹوں تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔

☆☆☆

شرزمہ دم بخود اپنے ساتھ بینچ پر بیٹھی نویرہ کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر تلخی کا دھواں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باہر بنے لان میں تھیں۔ آج کافی دنوں کے بعد موسم خوشگوار ہوا تھا۔

”اتنی بے یقینی سے کیوں گھور رہی ہو......؟“ نویرہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اپنی ماما کے لیے اتنے سخت اور سنگین الفاظ استعمال کر رہی ہو......“ شرزمہ نے برجستگی سے کہا۔ اب دونوں کے درمیان دوستی کا تعلق خاصا گہرا ہو گیا تھا۔ نویرہ کی محبت اور خلوص کے آگے اس نے ہتھیار پھینک ہی دیے۔ اس کی بات پر نویرہ کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”تم سوچ نہیں سکتیں کہ ان کی وجہ سے کتنی لڑکیاں ڈسٹربڈ ہیں لیکن انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں......“

”یار یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟“ شرزمہ نے ادھر اُدھر اڑتے بادلوں کو دیکھ کر جرح کا آغاز کیا تو نویرہ لاچاری سے بولی۔

”یہ کیوں نہیں ہو سکتا......؟“

”بھئی وہ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں اور شہر کے ایک مشہور کالج کی پرنسپل کے فرائض انجام دے رہی ہیں......“

”کاش وہ پڑھی لکھی نہ ہوتیں لیکن سمجھدار ہوتیں......“ اس کا انداز ہنوز تلخ تھا۔ ”ان تعلیمی ڈگریوں اور عہدے نے ان کی گردن میں سریا ڈال دیا ہے۔ وہ خود کو عقلِ کل اور باقی ساری دنیا کو احمق سمجھتی ہیں۔ کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو آپ کو شعور ہی نہ دے سکے۔“ اس کے نروٹھے انداز پر شرزمہ مسکرا دی۔

”یقین مانو مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے، وہ کسی سے بھی خوش نہیں......“

”تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے جو تم صبح سے اپنی ماما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہو......“ شرزمہ نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

”سویرے سویرے ان کے ساتھ ارسلان کے بچے کی وجہ سے لڑائی ہو گئی......“ اس نے جل کر اصل بات بتائی تو شرزمہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ ارسلان کا بچہ کون ہے......؟“ اسے واقعی سمجھ نہیں آئی۔

”میرا چچا زاد ہے یار، ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن میری ماما کو محبت کی ہر کہانی میں بس ”ولن“ بننے کا شوق ہے۔“ اس کی صاف گوئی پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

”تو تم اس بچے والے شخص کو پسند کرتی ہو، حد ہو گئی ہے نامعقولیت کی......“ شرزمہ کے ناگوار انداز پر وہ چونکی اور اگلے ہی پل اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”بہت ہی کوئی اسٹوپڈ چیز ہو تم......“ اس کے مذاق اڑانے والے انداز پر شرزمہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ ”گدھی وہ شادی شدہ تھوڑا ہے میں تو ویسے ہی اسے پیار سے ارسلان کا بچہ کہتی ہوں......“ اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”بہت ہی واہیات قسم کا پیار ہے یہ......“ وہ تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بارش کی کن من شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر موجود

کالی بدلیاں شرارت سے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"اُف......! اتنا رومینٹک موسم ہے اور ارسلان کا بچہ آج ہی کھاریاں کینٹ چلا گیا......" نویرہ دنوں بازو پھیلا کر بارش کو انجوائے کرنے لگی۔ جبکہ شرزمہ نے سخت تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کتنی فضول لڑکی ہو تم، شرم و حیا نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے تم میں......" شرزمہ نے بازو سے پکڑ کر زبردستی اسے سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھایا۔ "آرام سے بیٹھو، کوئی فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی جو تم بازو لہرا لہرا کر مجمع اکھٹا کرو گی یہاں۔" نویرہ کا لاابالی پن اسے بری طرح کھٹکا لیکن ہنی کی طرح وہ اس کو بھی سدھارنے کے معاملے میں بے بس تھی۔

"شرزمہ موسم خاصا خراب ہے، میں گھر جا رہا ہوں اگر آپ چلنا چاہیں......" پروفیسر آفاق کی آواز پر وہ دونوں اچھل کر رہ گئیں اور سخت حیرانی سے اپنے پیچھے کھڑے مسکراتے ہوئے پروفیسر آفاق کو دیکھ کر گھبرا گئیں وہ پتا نہیں کب روش سے گزرتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔

"نو سر تھینک یو......" شرزمہ نے فوراً ہی انکار کیا جبکہ نویرہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"اٹس اوکے......" وہ بڑے پُر وقار انداز سے آگے بڑھ گئے۔

"اوئے...... یہ کیا فلم ہے......؟" نویرہ نے شرارت سے اس کا گال چھو کر نرمی سے پوچھا تو شرزمہ کے پسینے چھوٹ گئے۔

"کچھ نہیں ہے یار......؟" اس نے ماتھے پر آیا نادیدہ پسینہ صاف کرتے ہوئے وضاحت دی لیکن آگے بھی نویرہ ابراہیم تھی جس کو بہلانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"تم اس فیکلٹی کے سب سے اسمارٹ، ہینڈسم، کنوارے ڈیشنگ بندے کو جانتی ہو اور مجھے کانوں کان خبر نہیں......" نویرہ چہکی۔

"اب کیا میں گلے میں یہ تختی ڈال کر پھرتی کہ میں پروفیسر آفاق کو جانتی ہوں......" شرزمہ نے جھلا کر کہا۔

"کم از کم مجھے تو بتاتیں ظالم لڑکی......" نویرہ نے دہائی دی تو اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں پتا نہیں ہے کہ میں نے اس ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن صرف اور صرف اسی ایک بندے کی وجہ سے لیا ہے......" نویرہ نے ایک آنکھ میچ کر شوخی سے کہا تو اس کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"پورے کیمپس کی آدھی لڑکیاں ان پر مرتی ہیں لیکن ایک نمبر کے کم گو، روکھے اور مغرور قسم کے واقع ہوئے ہیں موصوف......" اس نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تم نے ان کی وجہ سے اس ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا ہے لیکن وہ تو ہمیں پڑھاتے نہیں......" شرزمہ حیران ہوئی۔

"بھئی اگلے سمسٹر میں ایک سبجیکٹ پڑھائیں گے ناں، ساری معلومات اکھٹی کر کے مابدولت نے یہاں ایڈمیشن لیا تھا۔" اس کے انکشاف پر شرزمہ نے خاصی خفگی بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ "اگر ان کے چکر میں آئی ہو تو پھر وہ ارسلان والا ڈراما کیا ہے......؟"

"ارسلان تو اپنا دل ہے اور پروفیسر صاحب جگر......" اس کی جگر جگر کرتی آنکھوں میں موجود شوخی سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے عمدہ طریقے سے بیوقوف بنا رہی ہے۔

"فضول باتیں مت کرو......" شرزمہ نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے کندھے پر ماری تو وہ بلبلا اٹھی۔

"بتاؤ ناں یار تم انہیں کیسے جانتی ہو......؟" وہ اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے پاس آئی۔ اس کے لہجے

میں تجسس ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"کیسے جانتی ہوں سے کیا مراد ہے......؟" وہ جھلاتی ہوئی اپنا بیگ اٹھا کر چل پڑی تو نویرہ نے بھی اس کی پیروی کی۔

"بتاؤ ناں یار......؟" نویرہ نے بے تابی سے اس کا کندھا ہلایا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شرزمہ کے حلق میں انگلی ڈال کر اصل بات اگلوا لے۔

"بس جانتی ہوں، تمہیں کیوں بتاؤں......" شرزمہ اب اس کے الجھن بھرے انداز سے لطف اندوز ہوئی۔ وہ دونوں پوائنٹ کی طرف چل پڑیں۔

"بتاتی ہو یا......؟" نویرہ بھاگ کر اس کے آگے آن کھڑی ہوئی اس نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔ ارد گرد سے گزرتے اسٹوڈنٹس دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے وہ سٹپٹا گئی۔

"یہ کیا احمقانہ پن ہے یار، بتاتی ہوں......" وہ پراگندگی سے بولی تو نویرہ اب شرافت سے اس کے برابر میں چلنے لگی لیکن تجسس اور بے قراری اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"یار میں اور ہنی دونوں ان کے گھر کے اوپر والے پورشن میں رینٹ پر رہتے ہیں......" اصل بات سنتے ہی نویرہ کے چہرے پر جوش کا ایک اور سمندر امنڈ آیا۔

"تم پروفیسر صاحب کے گھر میں رہتی ہو، اوہ مائی گاڈ......" حیرت کی زیادتی سے اس کی آواز بلند ہوئی تو لڑکیوں کے ایک گروپ نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نویرہ نے دانتوں تلے زبان داب لی۔

"بس سوری یار......" وہ دانت نکالتے ہوئے بولی تو شرزمہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور سنجیدگی سے چلتی رہی۔

"ویسے یار، ان کے ساتھ تو ان کا ایک ہینڈسم سا شونا سا بھانجا بھی تو رہتا ہے......" نویرہ کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ شرزمہ کمر پر ہاتھ رکھ کر مڑی اور کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جو کان کھجاتے ہوئے شوخی سے کہہ رہی تھی۔ "ویسے یار وہ بھی کسی سے کم نہیں......"

"دفع ہو جاؤ تم، مجھ سے گھر میں ایک ہنی برداشت نہیں ہوتی تھیں اوپر سے تمہاری صورت میں ایک اور نمونہ میرے سر پر سوار ہو گیا ہے......" وہ تپ کر بولی تو اس کی بات پر نویرہ کے حلق سے نکلنے والی بے ساختہ ہنسی پر بہت سے لوگوں نے مڑ کر پھر دیکھا۔ شرزمہ سخت کوفت کا شکار ہوئی اور جھنجلاہٹ بھرے انداز میں پوائنٹ پر سوار ہو گئی۔

☆☆☆

وہ مرکز میں بنے اسٹور سے کچھ چیزیں خرید کر ہانپتی کانپتی گھر پہنچی تو سیاہ اور سرمئی رنگ کے ڈھیر سارے بادل ایک دم ہی برس گئے۔ چھاتا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی زیادہ بھیگ گئی۔ وہ دل ہی دل میں ہنی کو کوستی ہوئی گیٹ عبور کر کے پورچ تک پہنچی تو سامنے ہی برآمدے میں پروفیسر صاحب کرسی پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کی گود میں رکھی کتاب کے کھلے صفحات اس بات کے غماز تھے کہ وہ ذہنی طور پر یہاں موجود نہیں۔ شہتوت کے پتوں کے جھونکوں میں موتیے کے پھولوں کی بڑی دلفریب سی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بوگن ویلیا کے پتے بارش کے پانی میں بہتے پھر رہے تھے۔

"السلام علیکم......" اسے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں مخاطب کرنا پڑا۔ بارش کی بوندوں سے دھلا اس کا چہرہ دیکھ کر وہ ایک دم چونکے۔ ہاتھ میں پکڑا بلیک کافی کا کپ سرد ہو چکا تھا اور انہیں احساس تک نہیں ہوا۔

"آپ بارش میں مارکیٹ کیوں گئی تھیں، اتنا خراب موسم تھا......" وہ فکر مند ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر زدیکھ کر انہوں نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔

"میں کون سا مٹی کی ڈلی ہوں جو ان ساون کی

بارشوں میں گھل مل جاؤں گی......'' وہیں سیڑھیوں کی گرل کے پاس کھڑے ہو کر اس نے بڑا الٹا سا جواب دیا۔ اس کی بات پر پروفیسر صاحب کے چہرے کے تاثرات بڑی سرعت سے تبدیل ہوئے۔

''کچن کی چیزوں کی خریداری کرنی تھی تو فضلو کو کہہ دیتیں یا پھر ہانیہ خود لے آتیں، آپ کیوں اکیلے جاتی ہیں......؟'' ان کا تشویش زدہ انداز شرزمہ کی سمجھ سے باہر تھا۔

''ہنی بہت دنوں سے مصروف تھیں، انہیں روزانہ بھول جاتا تھا جبکہ فضلو کا میرے ذہن میں آیا ہی نہیں......'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ اچانک اس کی نظر بارش کے پانی میں بہتے ہوئے پھول پر پڑی تو وہ انتہائی شوق سے اس کی جانب لپکی اور فوراً اٹھا کر گملے میں رکھ دیا۔

''آپ کو پھول بہت اچھے لگتے ہیں کیا......؟'' وہ کسی خواب کی سی کیفیت میں اسے دیکھ کر بولے۔

''میرا بس چلے تو پوری زمین پر پھولوں کی چادر بچھا دوں......'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارش کے ننھے قطروں کو سمیٹنا چاہا۔ بارش اسے بالکل بے قابو کر دیتی تھی۔

''لگتا ہے کہ آپ فطری حسن کی دیوانی ہیں......'' پروفیسر صاحب نے انتہائی دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر بارش کی بوندیں موتیوں کی طرح اٹکی ہوئی تھیں۔

''میں......'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تو انہیں لگا جیسے ایک ساتھ بارش کی جلترنگ کسی ٹین کی چھت پر برسی ہو۔

''پتا نہیں لیکن میرا دل کرتا ہے کہ ایک ایسی وادی میں اپنا گھر بناؤں جہاں خوب صورت نیلی جھیل کے پانیوں میں راج ہنس تیرتے ہوں۔ جہاں کی فضا میں چنبیلی کی خوشبو ہو، جہاں اجلے سفید کبوتر گھروں کی منڈیر پر آ کر بیٹھ جائیں اور چاندنی راتوں کو الوہی سا حسن دیکھنے والوں کو مبہوت کر دے۔ جہاں امن و آشتی کی فضا ہو اور ہر دل میں جینے کی امنگ ہو......'' وہ پلٹی اور پروفیسر صاحب کو انتہائی محویت سے اپنی طرف دیکھتا پا کر شپٹا گئی۔ اس بے خودی کی کیفیت نے اسے آج جی بھر کر شرمندہ کیا۔

''سوری...... پتا نہیں بارش دیکھ کر مجھے کچھ ہو جاتا ہے......'' انتہائی خفت زدہ لہجے میں اس نے بتایا تو وہ مسکرا دیے۔

''کیا آپ کو بھی بوڑھے درخت، قدیم حویلیاں، ویران جزیرے، پرانے گیت، پکھیروں کے رین بسیرے، کونجوں کی ڈاریں اور بوسیدہ تصویروں والے البم اچھے لگتے ہیں......؟'' ان کی آنکھوں میں بے حد دلچسپی تھی۔

''جی مجھے تو کچے صحن میں لگا نیم کا درخت، ڈوبتا سورج، پرانی یادیں اور عمر رسیدہ لوگوں کے جھریوں والے چہرے بھی بہت اچھے لگتے ہیں......'' اس کے لہجے میں اب ٹھہراؤ تھا۔

''عمر رسیدہ لوگوں کے چہرے......؟'' انہیں اس بات نے چونکا دیا۔

''تھکن گزیدہ بوڑھے چہروں کی جھریوں میں زندگی کا تجربہ بول رہا ہوتا ہے، ہر چہرے کی اپنی ایک کتھا اور بھاشا ہوتی ہے مگر ہم جوانی کے زعم میں ان چہروں پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتے۔'' وہ میز پر سے اپنا شاپر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''میں نے آپ کے لیے چائے بنوائی ہے، فضلو لے کر آتا ہی ہوگا۔'' انہوں نے اسے اوپر والے پورشن میں جانے سے روکا تو وہ رک بھی گئی۔ دونوں خاموش تھے۔

''یونیورسٹی میں کوئی مسئلہ تو نہیں......؟'' انہوں نے بات کو بڑھانے کے لیے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

''مسئلے مسائل بھی کمپیوٹر میں اچانک آ جانے والے وائرس کی طرح ہوتے ہیں، ایک لمحے میں سب کچھ ہلا دیتے ہیں لیکن پھر سنجیدگی سے سوچنے پر کوئی نہ کوئی اینٹی وائرس مل ہی جاتا ہے......'' شرزمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو بھی کوئی اینٹی وائرس مل گیا ہے......؟'' پروفیسر صاحب کے لہجے میں شوخی در آئی۔

''جی، آپ ہیں ناں......'' اس کی بے ساختگی پر وہ محظوظ ہوئے۔

''جی ضرور جب چاہیں، میرے گھر اور آفس کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔'' ان کی بات پر شرزمہ مسکرا کر چپ رہی۔ بارش کے تسلسل میں کمی آ گئی تھی۔

''آپ نے اس گھر کا نام ''الجھت'' کیوں رکھا؟'' کئی دنوں سے سوال جو وہ پوچھنا چاہ رہی تھی آج زباں پر آ ہی گیا۔

''یہ نام میں نے نہیں رکھا......'' ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی لیکن انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ ''آپ چائے لیں ناں......'' شرزمہ نے چونک کر ان کا سپاٹ چہرہ دیکھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے پوچھ نہیں پائی کہ اگر یہ نام آپ نے نہیں رکھا تو کس نے رکھا ہے۔ ایک وقفہ سا دونوں کے درمیان آیا۔

''ہانیہ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے......؟'' پروفیسر صاحب کی بات پر وہ چونکی۔

''کس بارے میں......؟''

''اپنی شادی اور مستقبل کے بارے میں......'' ان کے دو ٹوک انداز پر وہ تھوڑا سا تعجب کا شکار ہوئی۔

''یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس محتاط انداز پر وہ مسکرائے۔

''انہیں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔''

''آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے......؟'' اس کی زبان پھسلی اور پروفیسر آفاق کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی۔

''میں بہت عرصے پہلے اپنی جنت کھو چکا ہوں۔ اس کے بعد بھی اس گمشدہ جنت کی تلاش میں سات سمندروں تک پھر آیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ جو چیزیں ایک دفعہ کھو جائیں وہ کبھی نہیں ملتیں تو میں نے اپنے دل کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ بعض دفعہ دشت کی سیاحی اکیلے ہی کاٹنا پڑتی ہے۔ اب میں اپنی زندگی کی کتاب کے ورق بس پلٹتا جا رہا ہوں۔'' ان کے لہجے میں ایک ان کہا سا دکھ ہلکورے کھا رہا تھا۔ شرزمہ حیرت سے ان کا سوچ میں گم چہرہ دیکھنے لگی جس پر ایک داستان رقم تھی۔

☆☆☆

احتشام نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کافی سالوں کے بعد ''ارجمند ولا'' میں قدم رکھا۔ وہ

میں ہوں پاکیزہ

میں ہوں پاکیزہ مدیرِ اعلیٰ میرے معراج رسول
مجھے سنوارنے والی ہیں عذرا رسول
میرے بناؤ سنگھار کی موتی انجم انصار
رضوانہ پرنس بھی ہیں ان میں شمار
نزہت اصغر کا خوب صورت بیاں ہیں
عظمیٰ آفاق کی تحریریں بھی عیاں ہیں
آمنہ حماد بھی ہیں میری محسن
صغریٰ زیدی بھی سب کا دل لبھاتی ہیں یقیناً
عنیزہ سید رفعت سراج شیریں حیدر
ان کی تحریروں کو سینے سے لگایا میں نے جھوم کر
جلترنگ سی بجنے لگی ہے میرے دل میں
فائزہ افتخار رخسانہ نگار آگئی ہیں محفل میں
دعائیں ہر اک کی سمیٹتا ہوں کہ ہوں پاکیزہ
ہاتھ ملاتا ہوں دوست دشمن سے کہ ہوں پاکیزہ
شاعرہ: ناہید قاضی، رسال پور، کینٹ

یہاں آنا نہیں چاہتا تھا لیکن آچکا تھا۔ اس کی فلائٹ میں کوئی مسئلہ ہونے کی وجہ سے سب کی بکنگ کینسل کر کے سب مسافروں کو دوسری فلائیٹس میں... ایڈجسٹ کیا گیا تھا۔ اس لیے وہ وقت سے کافی پہلے آ گیا۔ اس نے مصلحتاً کسی کو بھی اس پروگرام کی تبدیلی سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، کچھ سب کو حیران کرنے کی عادت بھی پرانی تھی۔

ارجمند ولا میں اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے کافی گہما گہمی تھی۔ ابراہیم صاحب چائے کے ساتھ تازہ اخبار میں محو تھے۔ الماس بیگم اور نویرہ ٹی وی پر آنے والی کسی انگلش مووی میں انجیلینا جولی کے دلکش خدوخال دیکھنے میں مگن تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر سنجیدہ سی عبیرہ بڑی توجہ سے کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ صبح کے دس بج چکے تھے لیکن احتشام کو اچانک سامنے پاکر سب کے چہروں کی سوئیاں بارہ پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اس کی آمد نے مسز الماس کا سارا سکون غارت کر دیا۔

بلیک پینٹ اور میرون شرٹ میں اس کی شخصیت خاصی متاثر کُن لگ رہی تھی۔ ہینڈسم تو وہ پہلے ہی سے تھا لیکن اب اس کی شخصیت میں محسوس کی جانے والی سنجیدگی نے متانت کے سارے رنگ بھر دیے تھے۔ اچانک اسے بڑا سا ٹرالی اٹیچی کیس اندر لاتے دیکھ کر الماس بیگم بوکھلا کر کھڑی ہوئیں۔

"السلام علیکم......" اس کی بھاری آواز پورے لاؤنج میں گونجی اور سب کا سکون درہم برہم کر گئی۔ الماس بیگم کا خیال تھا کہ اس دفعہ وہ یہاں آنے کے بجائے پورچ کی سیڑھیوں سے سیدھا اوپر ہی جائے گا لیکن ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ نہ صرف آچکا تھا بلکہ بڑے پُراعتماد انداز میں ابراہیم صاحب سے مل کر نشست بھی سنبھال چکا تھا۔ عبیرہ اور نویرہ نے خوفزدہ نظروں سے اپنی ماں کا ہراساں چہرہ دیکھا۔ جبکہ ان سب کے احساسات سے بے خبر وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ آنکھیں وہ آنکھیں نہیں تھیں جہاں کبھی اس کی آمد کا سنتے ہی خوشی کے جگنو چمکنے لگتے اب ان آنکھوں سے چھلکتا اضطراب اور پھیکا پن اسے خفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ آج ارجمند ولا کے مکینوں کے چہروں پر سجی مصنوعی مسکراہٹوں سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ سبھی لوگ زبردستی مسکرانے کی رسم جبراً انجام دے رہے تھے۔

"کیسے ہو ینگ مین ......؟ سفر کیسا رہا......؟" ابراہیم صاحب کی محبت پر اسے کبھی کوئی شک نہیں رہا تھا اور اب بھی وہ ان کی دل آزاری کے خوف سے سیدھا اِدھر ہی آیا تھا۔ ورنہ اس کا گھر سے نکلتے ہوئے قطعاً ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی سارے ارادے مٹی کی طرح ڈھیر ہو گئے تھے۔

"یہ شامی بھائی پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی ڈیشنگ نہیں ہو گئے......" نویرہ نے اپنی بڑی بہن کے کانوں میں سرگوشی کی جواب تنبیہی نظروں سے اسے گھور کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی اس کا تمام تر دھیان ماما کی طرف تھا جو انتہائی مضطرب انداز میں اپنی جگہ ایسے جم کر کھڑی تھیں جیسے کسی نے انہیں وہاں گاڑ دیا ہو۔

"ارے بھئی الماس کن سوچوں میں گم ہیں، اپنے شامی کے لیے کوئی ناشتا واشتا بنوائیں......" ابراہیم صاحب کے بشاشت بھرے انداز پر وہ چونکیں۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا جو فدا ہو جانے والے انداز میں اپنے بھانجے سے حال احوال پوچھ رہے تھے۔

"ارے نہیں ماموں، میں بریک فاسٹ جہاز میں کر چکا ہوں......" اس نے فوراً ہی منع کیا۔ الماس ابراہیم کا دھواں دھواں سا چہرہ اس کی نگاہوں کے

سامنے تھا اور وہ کوئی بچہ نہیں تھا جو مدِمقابل کے تاثرات نہ پڑھ سکتا ہو۔ ویسے بھی اس کا اس دفعہ الماس بیگم کا "ضبط" آزمانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"نویرہ تم کسی سے کہہ کر بھائی کا سامان گیسٹ روم میں سیٹ کرواؤ......" ان کے نئے آرڈر نے الماس بیگم کو بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیا۔

"نہیں ماموں، اس دفعہ تو میرا حرا کے ساتھ پہلے سے ہی پروگرام سیٹ ہے۔ میں وہیں اس کے پورشن میں اسے تنگ کروں گا۔ وہ ہر دفعہ ناراض ہوتی ہے کہ میں اس کے پاس نہیں آتا۔" وہ بہت سلیقے سے انکار کر رہا تھا۔ اس کے جواب پر الماس بیگم کے حلق سے بڑی پُرسکون سی سانس خارج ہوئی۔ جبکہ ابراہیم صاحب کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑا۔

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا تم ہمیشہ ہماری طرف قیام کرتے ہو......" انہوں نے ہلکا سا برا منا کر محبت بھرے انداز میں کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماموں، وہ بھی تو آپ کا ہی گھر ہے......" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"یہی بات تو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ "یہ" بھی تمہارا ہی گھر ہے اور رہی بات حرا کی تو میں اس سے خود بات کر لیتا ہوں۔" ابراہیم صاحب کی بات نے الماس بیگم کو سخت جھنجلاہٹ میں جلا کیا۔

"بھئی آپ کیوں اس بیچارے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اوپر رہے یا نیچے بات تو ایک ہی ہے......" الماس بیگم کے جتلاتے انداز پر وہ دونوں چونکے اور ابراہیم صاحب کو اپنی بیگم کے سارے انداز ازبر تھے اس لیے وہ کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

"اچھا بھئی مرضی ہے آپ کی......" وہ تھوڑا سا مایوس ہوئے تو شامی نے فوراً اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھا۔

"ماموں آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں، صبح شام حاضری دوں گا اور رات کا کھانا بھی ہم مل کر کھائیں گے......" اس کی بات پر مسز الماس جی بھر کر بدمزہ ہوئیں اور ایسی نظروں سے میاں کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اب تو خوش ہو جائیں۔

"ٹھیک ہے بھئی......" وہ مسکرائے۔ "ہاں بھئی الماس بیگم ناشتا تو وہ کر آیا ہے اس کے لیے چائے تو بنوائیں ناں......" انہوں نے دانستہ خوشگوار انداز میں کہا۔

"ہاں بھئی احتشام چائے کے ساتھ کیا لو گے......؟" الماس بیگم نے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر کر پوچھا۔

"ممانی آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں چائے نہیں پیتا......" اس کے لہجے میں چھپے طنز پر انہیں جھٹکا لگا۔ انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے دیکھا جس کی نگاہوں میں غضب کی کاٹ تھی۔ وہ تھوڑا سا بدحواس ہوئیں ماحول میں ایک چبھنے والی خاموشی نے تیزی سے جگہ بنائی۔ جبکہ وہ اب بڑے مطمئن انداز سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے انگلش مووی "دی ٹورسٹ" میں جونی ڈیپ کی ایکٹنگ دیکھنے میں مگن تھا اس کے محو انداز سے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کام کے لیے پاکستان آیا ہو۔

☆☆☆

شرزمہ بڑی بے تکلفی سے پروفیسر صاحب کے کچن میں "فرائیڈ فش ود ٹارٹر ساس" بنانے میں مگن تھی۔ ان کے کچن میں سوئی گیس کے پائپ میں کوئی مسئلہ تھا۔ جس کی وجہ سے اوپر کے پورشن میں گیس کی سپلائی عارضی طور پر بند تھی۔ اسود کو معلوم ہوا تو اس نے فوراً آفر کی کہ وہ کھانا نیچے کے کچن میں بنا لے۔

سفید رنگ کے ایپرن کو باندھے وہ بڑے سلیقے اور مہارت سے اپنے کام میں مگن تھی۔ اس کے لمبے بال سبز رنگ کی پونی میں جکڑے حسبِ معمول دائیں بائیں جھول رہے تھے۔ ٹی وی لاؤنج میں پروفیسر

صاحب کے ساتھ ٹی وی دیکھنے میں مگن اسود کی نگاہ بھٹک بھٹک کر اس کی لمبی پونی کی طرف جا رہی تھی۔ ہانیہ ابھی تک اپنے بوتیک سے نہیں لوٹی تھیں۔ اس لیے شرزمہ کو سارا کام اکیلے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ اب تو شرزمہ کی بھی نیچے والوں کے ساتھ کافی بے تکلفی ہو گئی تھی اس لیے وہ کسی بھی کام کے لیے بلا جھجک نیچے آجاتی۔

وہ مچھلی کے قتلوں پر نمک، سفید مرچ، لہسن، مسٹرڈ پاؤڈر اور سرکہ لگا کر ٹرے میں رکھ رہی تھی جب ہانیہ شور مچاتی وہاں داخل ہوئیں۔ اندر کا منظر ان کے لیے حیران کن تھا اس لیے وہ جھجک کر دروازے میں کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت شرزمہ کی یہاں موجودگی ان کے لیے حیران کن تھی۔

''ارے واہ......! لگتا ہے کہ آج شرزمہ آپ لوگوں کے لیے کوئی خاص ڈش ٹرائی کر رہی ہے......'' ان کا جتلاتا ہوا انداز بیک وقت تینوں کو ہی چونکا گیا۔ وہ اب سنجیدگی سے آگے بڑھ آئیں۔

''ہمارے ایسے اچھے نصیب کہاں......'' اسود کا انداز معنی خیزی لیے ہوئے تھا۔ ''یہ تو اوپر گیس کے کنکشن میں کوئی فالٹ آگیا ہے اس لیے محترمہ یہاں مزے مزے کی ڈشز آپ کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ شام تک مسئلہ حل ہو جائے گا اس وقت تک ہم خوشبوؤں سے گزارہ کر لیتے ہیں۔'' اسود کے چہرے پر شرارت رقصاں تھی۔ اس کی بات پر ہنی نے اطمینان بھری سانس لی۔

''ہاں بھئی کیا بنا رہی ہو لنچ میں......؟'' ہانیہ نے ابرو چڑھا کر شیلف پر رکھی مچھلی کو دیکھا۔ ''مائی گاڈ اتنی گرمی میں فش کون پاگل کھاتا ہے......''

''وہی پاگل جو اتنی گرمی میں کریلے گوشت کھاتا ہے......'' اسود کے طنز پر وہ تھوڑا سا کھسیا گئیں۔

''بھئی شیری ساتھ میں فرنچ فرائز بھی بنا لینا......'' انہوں نے بے تکلفی سے فرمائش کی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سبحان اللہ آتے ہی فرمائشی پروگرام جاری کر دیا۔ لیڈی ڈیانا صاحبہ کچھ خود بھی ہاتھ پیر ہلا لیا کریں......'' اسود نے انہیں چھیڑا جو شرزمہ کو دیکھ رہی تھیں کہ وہ کتنی نفاست سے مچھلی کے ٹکڑے پر میدے کی تہ لگا کر انڈے میں ڈبو رہی تھی۔

''توبہ کرو توبہ...... یہ میرے بس کا کام نہیں......'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''یہ شیری کا ہی شوق ہے وہ جو کچھ بنا لیتی ہے میں صبر شکر کر کے کھا لیتی ہوں۔'' انہوں نے بھی آج عاجزی کی انتہا کر دی۔ وہ اب بڑی دلچسپی سے پروفیسر صاحب کو دیکھ رہی تھیں جو اس ساری گفتگو میں بالکل خاموش تھے۔

''ماشاء اللہ پہلی بندی دیکھی ہے جو رات اسٹیم چکن، کل چکن جلفریزی اور پرسوں افغانی پلاؤ بھی صبر شکر کر کے کھا رہی ہے۔ اللہ ایسا صبر و شکر کرنے کا موقع ہمیں بھی دے۔'' اسود نے جل کر کہا۔ اس کی بات پر ہنی کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا جاندار تھا جبکہ شرزمہ اور پروفیسر صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔

''اس کا تو بہت آسان سا حل ہے......'' وہ شیلف پر رکھی سلاد کی پلیٹ اٹھا کر لے آئیں۔

''اچھا، وہ کیا......؟'' اسود مارے تجسس کے اٹھ کر ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

''فوراً سے بیشتر شادی کر لو......'' انہوں نے کھیرے کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے مفت مشورہ دیا تو اس نے برا سا منہ بنایا۔

''ایسے مہنگے مشورے آپ ہی دے سکتی ہیں......''

''مشورہ تو ہانیہ نے بالکل درست دیا ہے......'' پروفیسر آفاق نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''آپ دونوں کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ نیک فریضہ آپ لوگ کیوں نہیں انجام دے لیتے، ماشاء اللہ مالدار آسامیاں ہیں......'' وہ کون سا کسی سے کم تھا۔

''بھئی ہمیں تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں، تم ہی دوسروں کے کھانوں پر ''نظر'' رکھتے ہو۔ اس لیے کہا ہے کہ جلنے اور کڑھنے سے بہتر ہے کہ کوئی گھر والی لے آؤ۔'' ہانیہ بے تکلفی سے سلاد کھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''آج کل کی لڑکیوں کو کہاں کوکنگ آتی ہے......'' اس کے انداز میں بیزاری کا عنصر غالب تھا۔ ''کچھ ریڈی میڈ کھانوں کی کمپنیوں نے لڑکیوں کی قوم کو مزید سست اور کاہل بنا دیا ہے۔''

''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں......'' ہانیہ نے بڑا اختلاف کیا۔ ''ساری لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں اب ہماری شیری بھی تو ہے اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود سمیعہ آپی نے اسے بہت چھوٹی عمر میں ہی سب کچھ سکھا دیا تھا۔''

''ہاں جی بس بہن کو ہی کچھ نہ سکھا سکیں، سارا زور اپنی معصوم بیٹی پر ہی ان کا چلا......'' اسود ہنستے ہوئے ان پر چوٹ کر گیا۔ وہ اب شرزمہ کے پاس آن کھڑا ہوا جو خاموشی سے ان کی گفتگو سنتے ہوئے ایک پیالی میں میونیز نکال رہی تھی۔ مچھلی کے فرائی ہونے کی اشتہا انگیز مہک چاروں طرف پھیل گئی۔

''بھئی میں نے تو تمہیں پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ ہانیہ اپنا ٹیلنٹ کچن میں نہیں جھونک سکتی۔ اب کون گھریلو خواتین کی طرح گھنٹوں مغز ماری کر کے لنچ اور ڈنر بنائے جب ہر چیز ریڈی میڈ بازار سے مل جاتا ہے تو پھر ایسے چونچلے کرنے کی کیا ضرورت ہے......'' ان کی اپنی ایک فلاسفی تھی۔ جس سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ انتہائی من موجی خاتون تھیں۔

''اللہ رحم کرے آپ کی زندگی کے ساتھی پر......'' اسود کی بات پر شرزمہ مسکرائی۔ اس نے شیشے کے جار سے سیاہ زیتون نکالتے ہوئے ہانیہ کا پُراعتماد چہرہ دیکھا۔

''بھئی میری زندگی کا ساتھی تم جیسا کنگلا تھوڑی ہوگا، گھر میں دو دو کک افورڈ کر سکتا ہوگا......'' انہوں نے کن انکھیوں سے پروفیسر آفاق کا چہرہ دیکھا جو اُن کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''میری تمام تر ہمدردیاں اس معصوم بندے کے ساتھ ہیں......'' وہ فرنچ فرائز بنانے میں شرزمہ کی مدد کرتے ہوئے شوخ انداز میں بولا۔

''تم باتیں کم کرو اور کام پر نظر رکھو، سخت بھوک لگ رہی ہے......'' وہ شیلف کے پاس آ کر جار سے زیتون نکال کر کھانے لگیں۔ اسی لمحے اسود اور پروفیسر صاحب نے بیک وقت نظر اٹھا کر شرزمہ کو دیکھا جو ٹرے میں ساری چیزیں بڑے مگن انداز میں سیٹ کر رہی تھی۔ اس کے سادہ سے انداز میں کوئی خاص بات تھی جو دیکھنے والوں کو چونکا دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔

☆☆☆

''شامی بھائی کیسے ہیں آپ......؟ پھپھو کیسی تھیں؟'' نویرہ کو آج اپنی ماما سے نظر بچا کر اوپر آنے کا موقع مل ہی گیا تھا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس موقع کی تلاش میں تھی لیکن ماما نے سخت قسم کا مارشل لا نافذ کیا ہوا تھا۔

''خیال آگیا تمہیں آج بھائی کا......؟'' شامی کی گلہ آمیز نظروں سے وہ ایک دم شرمندہ ہو گئی۔

''آپ کو پتا تو ہے ماما کا، آج کل تو ویسے ہی ان کا مزاج سوا نیزے پر ہے۔'' نویرہ نے گھبرا کر اپنی طرف سے صفائی دی۔

''ان کا مزاج کب سوا نیزے پر نہیں ہوتا......'' شامی بیزار ہوا۔ ''تم سناؤ اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں......؟''

''اسٹڈیز تو اے ون ہیں......'' وہ پُرجوش ہوئی۔ ''آپ ویسے کتنے عرصے کے لیے آئے

ہیں......‘‘ نویرہ نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔

’’یہ سوال کیا تمہاری ماما نے پوچھا ہے......؟‘‘ شامی کے طنزیہ لہجے پر وہ خفت کا شکار ہوئی۔

’’آپ بھی شامی بھائی حد کرتے ہیں کم از کم مجھے تو ایک ہی لائن میں سب کے ساتھ مت کھڑا کیا کریں۔‘‘ نویرہ روہانسی ہوئی تو احتشام کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

’’سوری سسٹر، اصل میں تمہاری ماما کا شر ہی چاروں طرف اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہر کسی کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔‘‘ احتشام کو اندازہ تھا کہ وہ سب لوگ نویرہ سے زیادتی کر جاتے تھے۔ وہ تھی بھی تو اپنے سارے گھر میں مختلف۔ حد درجہ مخلص اور صاف گو۔

’’ہوں۔ تو تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں کتنے عرصے کے لیے آیا ہوں......؟‘‘ شامی نے محظوظ ہوتی نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا جو خفت زدہ انداز سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

’’ظاہر ہے کہ آپ ہی اس وقت یہاں موجود ہیں......‘‘ اس نے بھی جتاتی نگاہ سے دیکھا۔

’’پتا ہے نویرہ، اس موقع پر مجھے ایک چھوٹی سی نظم یاد آ رہی ہے۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’اچھا وہ کون سی؟‘‘ نویرہ بے تاب ہوئی۔

’’سنا دوں......؟‘‘ انہوں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا جواب ہلکی سی خفا خفا لگ رہی تھی۔

’’سنا بھی دیں اب۔‘‘ نویرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

’’نظم کچھ یوں ہے۔‘‘ وہ دھیمے سُروں میں گویا ہوا... تو نویرہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

’’مسافر ہوں
تیرے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر بیٹھوں گا
چلا جاؤں گا اپنے راستے پر
زندگی کی رات ڈھلنے دے، بدن کو مات ہونے دے
رکی ہے جو لبوں پر، وہ بات ہونے دے۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘ نویرہ نے کھلے دل سے سراہا۔ ’’بہت عرصے کے بعد کوئی اچھی چیز سنی ہے، سچ بتاؤں تو پورے گھر میں جیا آپی کو ہی شوق تھا۔‘‘ وہ روانی میں بولی۔ ’’اور یاد ہے ہم رات گئے کتنی بیت بازی کیا کرتے تھے۔‘‘ نویرہ انجانے میں ان کے کئی زخموں کو ادھیڑتی گئی اور اسے اس وقت احساس ہوا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

’’آئی ایم سوری...... مجھے کچھ یاد نہیں۔ ویسے بھی میں ماضی میں نہیں حال میں جینے والا بندہ ہوں۔‘‘ انہوں نے مزید اضافہ کیا۔

’’سوری بھائی۔‘‘ نویرہ سخت شرمندہ ہو کر اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے ان کا پھیکا سا چہرہ دیکھنے لگی۔

’’لفظ سوری، انگریزوں کی بہترین ایجاد ہے۔ ان کی ڈکشنری میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ، چاہے کسی کے دل پر جتنی چھریاں چلا لو، اس کی ذات کی دھجیاں اڑا دو یا کسی کی پوری زندگی سے کھیل جاؤ اور اس کے بعد ہاتھ جھاڑ کر سوری کہہ دو۔ کتنا آسان کام ہے یہ، ہے ناں؟‘‘ شامی کا زہریلا لہجہ نویرہ پر گھڑوں پانی ڈال گیا۔

’’آئی ایم رئیلی سوری بھائی۔‘‘ وہ روانی میں ایک دفعہ پھر بولی اور یک لخت اس نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ شامی استہزائیہ انداز میں ہنسا تو نویرہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے جنہیں دیکھ کر اسے اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا۔

’’آئی ایم سوری، اچھی لڑکی۔‘‘ اس نے بھی بلا ارادہ ہی کہا۔ نویرہ کے چونکنے پر اسے بھی احساس ہوا کہ وہ خود بھی وہی حرکت کر چکا ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی خفت سے محظوظ ہوتے ہوئے نویرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اسے ہنستا دیکھ کر شامی خود بھی نہ

چاہتے ہوئے ہنس دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بالکل پرانے اسٹائل میں گپ شپ میں مگن ہو گئے۔

☆☆☆

’’دیکھو شیری، تم میری بھانجی ہو لیکن میں نے تمہیں بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھا ہے۔‘‘ اس دن ہنی ایک دم ہی اس کے کمرے میں آ کر بولیں۔ وہ جو اپنے لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مگن تھی ہنی کی انتہائی سنجیدہ کہی ہوئی بات پر چونک گئی۔

’’دیکھو میری جان!‘‘ یہ ہنی کا مخصوص اسٹائل تھا جب وہ کوئی اہم بات کرنے لگتیں تو میری جان ان کا تکیہ کلام بن جاتا۔ وہ اس کے ساتھ فلور کشن پر آ کر بیٹھ گئیں۔

’’تمہیں مجھ پر اعتبار ہے ناں......؟‘‘ انہوں نے انتہائی محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ شرزمہ اُن کی آنکھوں میں آئی ہلکی ہلکی نمی پر تعجب میں مبتلا ہوئی۔

’’کیسی باتیں کرتی ہیں ہنی۔‘‘ اس نے ان کی گود میں سر رکھا اور کارپٹ پر نیم دراز ہو گئی۔ یہ اس کا لاڈ دکھانے کا مخصوص انداز تھا۔

’’میں بہت ڈرتے ڈرتے تم سے آج یہ بات کر رہی ہوں۔‘‘ ان کی تمہید شرزمہ کو الجھن میں مبتلا کر گئی۔

’’کم آن ہنی، آپ بلا جھجک بات کریں، کیوں نینس ہیں؟‘‘

’’تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔‘‘ ان کی صاف گوئی پر وہ حیران ہوئی اور آنکھیں پھیلا کر اُن کا سنجیدہ انداز دیکھنے لگی۔ وہ تو بہت خاص چیزوں کو بھی بہت عام انداز سے دیکھنے کی عادی تھیں لیکن آج نہ جانے کون سی چیز ان کو مضطرب کر رہی تھی۔

’’تم میری زندگی کا سرمایہ ہو اور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ تم سے محبت ہے۔‘‘ انہوں نے رنجیدہ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ ’’میں نے اسپین سے تمہاری وجہ سے ہی پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تھا۔‘‘ ان کی سو فیصد درست بات پر شرزمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’مجھے تمہارے معاملے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں۔‘‘ انہوں نے شرزمہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انتہائی محبت سے کہا۔

’’مجھے پتا ہے ہنی۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ان کی پُرخلوص محبت تو شرزمہ کے لیے ساری دنیا سے قیمتی اثاثہ تھی۔

’’یہاں آنا ہماری مجبوری ہے اور انشاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہم بارسلونا واپس چلے جائیں گے۔‘‘ انہوں نے آج ایک نئی بات کہہ کر اسے حیران کیا وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ اب وہ لوگ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہیں گے۔

’’میں اس گھر میں کبھی نہ رہتی اگر فاروق بھائی نے مجھے اپنی شخصی ضمانت نہ دی ہوتی۔ اس گھر میں ہم دو خواتین کے علاوہ اب ایک ملازمہ کا اضافہ ہو چکا ہے اور وہ بھی میں نے پروفسر صاحب سے کہہ کر کروایا ہے۔‘‘ انہوں نے مزید حیران کیا۔

’’ہنی ہمیں یہاں کوئی خطرہ ہے کیا؟‘‘ وہ فوراً ہی پریشان ہوئی۔ چڑیا جیسا نازک تو اس کا دل تھا۔ اس کی بات پر وہ مسکرائیں۔

’’نہیں چندا بظاہر تو ایسی کوئی بات نہیں...... لیکن تم میری ذمے داری ہو اور میں اپنے نئے شروع کیے ہوئے بزنس کی وجہ سے سخت مصروف ہوں لیکن اس کے باوجود میرا سارا دھیان تمہاری طرف رہتا ہے۔‘‘ ہنی کی محبت پر اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

’’بس تھوڑا سا میرا بزنس سیٹ ہو جائے تو ہم اپنا علیحدہ سے فلیٹ لے کر رہ لیں گے۔‘‘ انہوں نے سنجیدگی سے اسے مزید حیران کیا۔ ’’بس تم تھوڑی سی احتیاط کیا کرو، اسود اور پروفیسر لاکھ بہت اچھے اور شریف انسان ہوں لیکن مرد پر شیطان آنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب ہنی؟‘‘ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھی اور خوفزدہ نظروں سے اُن کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگی وہ کچھ

متذبذب تھیں۔ ”ہنی آپ مجھ سے کھل کر بات کریں ناں۔“

”بس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ سوئٹ ہارٹ تم میری غیر موجودگی میں نیچے جانے سے ذرا احتیاط ہی کیا کرو۔ میں فل ٹائم ملازمہ کا بندوبست کر رہی ہوں وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد سارا وقت تمہارے ساتھ رہا کرے گی۔“

”ہنی کیا کچھ ہوا ہے؟“ شرزمہ کافی زیادہ پریشان ہوئی۔

”میری جان کچھ بھی غلط ہونے کے لیے کون سا صدیاں لگتی ہیں بس سارا ایک لمحے کا کھیل ہوتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم اس ایک لمحے کو خود ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے آئیں۔“ ہنی کی بات پر وہ شرمندہ ہوئی۔ اسے ابھی تک سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہنی کو آخر کس چیز نے پریشان کیا ہے۔

”تم کل دوپہر اُن کے گھر میں اکیلے کھانا بنانے چلی گئیں، مجھے اچھا نہیں لگا۔“ انہوں نے اِک لمبی چوڑی تمہید کے بعد اصل بات اگل ہی دی۔

”لیکن ہنی میں اکیلی تو نہیں تھی، ان کے گھر میں بوا، اسود اور پروفیسر صاحب خود تھے۔“ شرزمہ نے گھبرا کر وضاحت دی۔

”کیا وہ سارے لوگ تمہارے لیے اپنی ہنی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں؟“ ان کے ناراض لہجے پر وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

”ہنی میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا.....“

”مائی سوئٹ ہارٹ، تم بہت معصوم، سادہ اور بے وقوف ہو اور اسی چیز سے مجھے خوف آتا ہے کہ کوئی تمہاری اس سادگی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا لے۔“ ہانیہ کی پریشانی کسی صورت کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہنی۔“ شرزمہ نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے برا سا منہ بنایا جو ہنی کو بالکل اچھا نہیں لگا تبھی اس دفعہ وہ بولیں تو ان کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

”یہ مرد ذات بہت عجیب ہے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے اور خواتین جو اُن کو سمجھنے کا دعویٰ کرتی ہیں بالکل غلط کرتی ہیں کیونکہ عورت جہاں سوچنا ختم کرتی ہے، مرد وہیں سے سوچنا شروع کرتا ہے۔“ ہنی نے آج بڑی عجیب سی تھیوری اسے پڑھائی۔

”اُف ہنی، میرا تو خیال تھا کہ آپ ہینڈسم مردوں سے بہت امپریس ہوتی ہیں لیکن مجھے تو آج پہلی دفعہ پتا چلا ہے کہ آپ تو اُن سے بہت خار کھاتی ہیں۔“ شرزمہ کی سادگی میں کہی ہوئی بات پر اُن کے چہرے کا رنگ اڑا۔

”اس لیے کہ میں نے اُن کے بہت عجیب اور چبھنے والے رنگ بہت قریب سے دیکھے ہیں۔“ وہ اب ذرا دھیمے لہجے میں بولیں۔

”پھر آپ کی ان سے اتنی جلدی دوستی کیسے ہو جاتی ہے؟“ استعجاب کی ایک لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تو وہ ہنس دیں۔

”تم نے دوست نما دشمن دیکھے ہیں کبھی شرزمہ؟“

”نہیں۔“ اس نے عجلت میں نفی میں سر ہلایا۔

”تمہارے سامنے ہیں۔“ ہنی کا لہجہ عجیب اور آنکھوں میں ایک چبھنے والا تاثر نمایاں تھا۔ شرزمہ ان کا یہ نیا روپ دیکھ کر حیران ہوئی۔

”کون ہنی، آپ......؟“

”ہاں میں۔“ انہوں نے اپنے نادیدہ کالر بڑے فخر سے کھڑے کیے۔

”جانے دیں ہنی۔“ شرزمہ نے ناک سے مکھی یوں اڑائی جیسے اُن کی بات اڑا رہی ہو۔

”اوہ یس ڈارلنگ!“ وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ ”ہنی کو دنیا میں بس ایک ہی بندی سے پیار ہے اور وہ اس کی شیری ہے۔ باقی سب کے لیے تو وہ ایک جنونی شیرنی ہے شیرنی۔“ ہنی اب انتہائی غیر سنجیدہ انداز

میں اس کی ناک سے ناک ٹکرا کے شرارت کر رہی تھیں۔ ان کا یہ شوخ اسٹائل شرزمہ کو بہت بھاتا تھا اس لیے وہ خود بھی سب کچھ بھول بھال کر اُن کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگی۔

☆☆☆

''رومی خالہ......'' نویرہ بڑی خاموشی کے ساتھ ان کے پاس سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے چونک کر اپنی سب سے چھوٹی بھانجی کو دیکھا جس کے اندر کوئی بے چین روح سمائی تھی وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔

''رومی خالہ!'' اس نے ایک دفعہ پھر پکارا تو انہوں نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اداس کیوں ہیں؟'' نویرہ نے وہ سوال کیا جو صبح سے کسی نے بھی اُن سے نہیں کیا حالانکہ سب کو پتا تھا کہ اگست کے یہ دن ان پر بہت بھاری گزرتے تھے۔

''آپ کو خالو یاد آ رہے ہیں ناں!'' اس نے سو فیصد درست اندازہ لگایا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

''میرے پاس ان کو یاد کرنے کے لیے کوئی بھی اچھی یاد نہیں۔''

''آپ نے ان سے شادی کیوں کی تھی؟ اتنے غیر ذمے دار اور بے حس انسان تھے وہ جنہوں نے کبھی مڑ کر بھی آپ کی طرف نہیں دیکھا۔'' نویرہ نے بڑے محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''بس میری قسمت میں تھا ایسا۔'' انہوں نے زمین پر چلنے والی چیونٹیوں کی قطار کو دیکھا جس میں ایک چیونٹی اپنی لائن سے نکل کر اب دائیں بائیں بوکھلائی ہوئی پھر رہی تھی رومیصہ کو اپنا وجود بھی بالکل اس چیونٹی کی طرح لگا۔

''وہ سارے لوگ جو قسمت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں مجھے ان پر بہت غصہ آتا ہے۔ کیا قسمت آپ کے گھر میں آ کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اندھے کنوئیں میں دھکیل دیتی ہے۔ سارے فساد کی جڑ ہمارا دل اور دماغ ہوتا ہے جو درست موقع پر درست فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور ہمیں بدقسمتی کے دائرے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس کے بعد ساری زندگی ہم قسمت کو کوستے ہوئے خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔'' نویرہ کے اندر اتنی سی عمر میں نہ جانے کہاں سے اتنی تلخی آ گئی تھی۔

''تمہارا خیال ہے کہ قسمت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی؟'' رومی خالہ نے اداسی سے اپنی بھانجی کا پُرخلوص چہرہ دیکھا۔

''قسمت کے کردار سے میں انکار نہیں کر رہی لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ برا کرتا ہوگا۔ وہ تو ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ اس نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا۔ اسے سوچنے سمجھنے کی بہترین صلاحیت دی۔ انسان اپنے فیصلوں کے معاملے میں با اختیار ہے۔'' نویرہ کے اپنے نظریات تھے۔

''لیکن یہ اللہ کی کوئی آزمائش بھی تو ہو سکتی ہے۔'' رومی کو اپنی اس بھانجی سے بات کرنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

''فارگاڈ سیک خالہ......'' اس نے باقاعدہ ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ''مجھے اس بات سے اختلاف نہیں لیکن آپ کے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا ہے جیسے آپ اس آزمائش کو خود ہاتھ پکڑ کر اپنی زندگی میں لے آئی ہوں۔'' وہ تھوڑا سا خفا ہوئی۔

''آج تک اس گھر میں آپ کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے بھلا؟'' اس کی بات پر وہ چونکیں اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ شادی سے پہلے بھی ماما کی بہن تھیں اور بعد میں بھی آپ کی یہ حیثیت رہی۔ آپ کو کس نے اس گھر کی بہو تسلیم کیا......؟'' وہ بہت سفاک

انداز میں بولی۔ ''یہ دادو جن کی خدمت میں آپ دن رات ایک کر دیتی ہیں وہ آج بھی کوئی بات کرتی ہیں تو یہی کہتی ہیں کہ تمہاری خالہ کہاں ہے؟ الماس کی بہن، انعم کی ماں، مجھے بتائیں کبھی انہوں نے آپ کو اپنے بیٹے کے حوالے سے پکارا؟ کبھی ہم بچوں کو ٹوکا کہ یہ تمہاری خالہ ہی نہیں چچی بھی ہیں۔ چلیں خالہ تو آپ ہماری ٹھہریں لیکن ارسلان لوگ آپ کو کس خوشی میں رومی خالہ کہتے ہیں؟'' نویرہ ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔

''مجھے ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' انہوں نے افسردگی سے نظریں چرائیں۔

''حالانکہ آپ کو ان چیزوں سے فرق پڑنا چاہیے تھا۔'' وہ تھوڑی بلند آواز میں گویا ہوئی۔

''جب آپ اپنے خلاف ہونے والی پہلی زیادتی یا ظلم پر احتجاج نہیں کرتے تو پھر آپ کو بعد میں ہونے والی زیادتیوں پر بھی واویلا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ اپنی خاموشی سے خود ظالم کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اگلا وار کر سکتا ہے۔'' غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

''یہ تم رومی کو کون سی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو؟'' ماما کی سلگتی ہوئی آواز نویرہ کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی جبکہ رومی خالہ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ بہن کے غصے سے تو ان کی جان جاتی تھی۔

''میں کون سی غلط بات کر رہی ہوں۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔

''تم فضول باتیں کم کیا کرو۔'' ماما کے ساتھ کھڑی عبیرہ نے بھی برہم نظروں سے اپنی چھوٹی بہن کا باغی چہرہ دیکھا۔

''میں آپ کی طرح ماما کی چمچی نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اچھی بیٹی ہونے کا کوئی میڈل لینا ہے۔ مجھے جہاں بھی کوئی غلط بات نظر آئے گی تو میں احتجاج ضرور کروں گی۔'' نویرہ کے اندر کی باغی لڑکی پوری قوت سے بیدار ہوئی۔

''شٹ اپ نویرہ'' الماس بیگم نے بھڑک کر کہا۔

''ماما یہ آپ مجھے ہر وقت شٹ اپ کال مت دیا کریں۔'' اس نے انگلی اٹھا کر بڑی بے خوفی سے کہا۔ ''یہ ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھا کریں کہ میں آپ کی ہی بیٹی ہوں اور جیا آپ کی بہن ہوں۔ میرے ساتھ جو جس لہجے میں بات کرے گا میں بھی اسی لہجے میں جواب دوں گی۔'' نویرہ کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کب خودسری میں تبدیل ہوئی اس چیز کا اندازہ گھر میں کسی کو بھی نہیں ہوا۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح اب ہر وقت پھٹنے کو تیار رہتی۔ اس وقت بھی وہ الماس بیگم کو تپا کر دھپ دھپ کر کے اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔

''اور یہ تم کیا اس کے فضول قسم کے فتوے ہر وقت سنتی رہتی ہو؟'' الماس بیگم نے ہمیشہ کی طرح اپنا باقی غصہ اپنی بہن رومیصہ پر اتارا۔

''آپی میں تو اسے سمجھا رہی تھی۔'' انہوں نے بوکھلا کر انہیں صفائی دی۔

''تم اسے سمجھا رہی تھیں یا وہ سقراط کی بھتیجی بن کر تمہیں بغاوت کے سبق سکھا رہی تھی؟'' انہوں نے اپنی بہن کی کلاس لی۔

''آپی درگزر کریں، بچی ہے، اسے عقل کہاں۔'' رومی خالہ نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ اتنے سالوں میں انہیں اپنی بہن کو ٹھنڈا کرنے کا ہنر آ ہی گیا تھا۔

''یہ بچی ہے......؟'' ان کی طنزیہ نگاہوں سے وہ خائف ہوئیں۔ ''کچھ یاد ہے کہ اسی عمر میں تم اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں اور ایک بچی کی ماں بن گئی تھیں۔'' ان کے تلخ لہجے پر رومیصہ کے زخموں کے کئی ٹانکے ادھڑتے گئے۔ وہ نگاہیں جھکائے اپنے پیر کے انگوٹھے پر نظریں جمائے شرمندہ شرمندہ کھڑی تھیں۔ الماس بیگم نے ایک کڑی نظر ان پر ڈالی اور

اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئیں وہ عبیرہ کے ساتھ مارکیٹ جا رہی تھیں۔

"رومی خالہ آپ بھی کچھ احتیاط کیا کریں۔" عبیرہ نے بھی دبے دبے لہجے میں کہا۔ "ماما نے آپ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔" وہ بھی شروع ہوئی رومیصہ کا سر اور جھک گیا۔ "ابھی تک میرے ددھیال والوں نے ان کا یہ قصور معاف نہیں کیا، اوپر سے آپ بھی بچوں والی حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔" عبیرہ کو اپنی ماں سے بے تحاشا محبت تھی اور ان کے حق میں تو وہ صبح سے شام تک ایک لمبی تقریر جھاڑ سکتی تھی لیکن اچھا ہوا کہ ماما نے اسے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پکار لیا اور وہ خود بھی ناراضی سے ان کی جانب بڑھ گئی جبکہ اپنی جگہ پر جمی کھڑی رومیصہ بس اپنا قصور سوچتی رہ گئیں۔

☆☆☆

"خیریت ......؟ آپ ٹھیک تو ہیں ناں.؟" اسود بہت دیر سے لان میں بیٹھا اسے ٹیرس کے چکر لگاتے دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ شام کو ایک چکر لان کا ضرور لگاتی تھی لیکن کچھ دنوں سے اس کی اس روٹین میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار رات کو ہانیہ کے ساتھ باہر سڑک پر واک کرتی دکھائی دیتی۔ اس وقت بھی وہ بے چینی سے کئی چکر نہ جانے کیوں ٹیرس کے لگا چکی تھی جبکہ نیچے بیٹھے اسود نے اس کی بے تابی کو بطورِ خاص محسوس کیا۔ اس لیے دبے پاؤں اوپر چلا آیا۔ اس کے پیچھے سے اچانک بولنے پر وہ ڈر سی گئی۔

"آپ کا تو بہت چھوٹا دل ہے فوراً ڈر جاتی ہیں۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" اس نے فوراً تردید کی اور گرل پر ہاتھ رکھ کر نیچے جھک کر خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"کس کا انتظار کر رہی ہیں آپ؟" اسود نے اس کی نظروں کے تعاقب میں سامنے سڑک پر دیکھا جو دور دور تک بالکل خالی تھی۔

"چکن بروسٹ کی ایک ڈیل منگوائی تھی اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔" اس کے معصومانہ انداز پر اس نے ماتھے پر ہاتھ مار کر جو ہنسا تو پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

"مائی گاڈ، بہت معصوم ہیں آپ!"

"اس میں معصومیت والی کیا بات ہے؟" شرزمہ کو اس کا ہنسنا برا لگا۔

"آپ کے انداز کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔ "جس طرح آپ نے چکر لگا لگا کر ٹیرس گھسا دیا ہے میں تو سمجھا کہ شاید کوئی خاص ہستی تشریف لا رہی ہے۔"

"جس ٹائم پر آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وقت سب سے خاص ہی ہوتی ہے۔" شرزمہ کے منہ سے نکلنے والے غیر متوقع جملے نے اسود کو حیران کیا۔

"آپ بہت حیران کُن بھی ہیں۔" اسود نے اپنی رائے میں فوراً ترمیم کی۔ وہ چپ رہی۔ نیچے اسے ڈیل لیے بندہ نظر آ چکا تھا۔ وہ نیچے جانے لگی۔

"ایک منٹ، آپ یہاں ٹھہریں۔" اسود نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں لے کر آتا ہوں۔" وہ فوراً ہی سیڑھیاں اترنے لگا۔

"مجھ سے پیسے تو لے جائیں۔" شرزمہ نے ہلکی سی ناگواری سے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹھیک تین منٹ کے بعد وہ دوبارہ اوپر تھا۔

"بل کہاں ہے؟" شرزمہ کی بات پر وہ حیران ہوا۔

"کون سا بل؟"

"ان سب چیزوں کا۔" شرزمہ کو اس کی بے نیازی پر غصہ آیا۔

"بھئی میں خود آپ کے ساتھ مل کر کھاؤں گا مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ اس لیے کوئی بل

نہیں۔" اس کی بے تکلفی اس لمحے شرزمہ کو زہر لگی۔

"ایسا کریں کہ پھر یہ آپ ہی کھا لیں۔ میں اپنے لیے اور آرڈر کر دوں گی۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا تو اسود کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہوا۔

"سوری۔" اسود نے ہاتھ میں پکڑا شاپر میز پر رکھا سنجیدگی سے نیچے سیڑھیاں اترتا گیا جبکہ اس ناراضی کے مظاہرے پر شرزمہ ہکا بکا رہ گئی۔ اسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی بات کا اتنا برا منا سکتا ہے۔ کئی لمحوں تک تو وہ وہیں کھڑی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مسلتی رہی اور اس کے بعد اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہ سامنے لان میں بڑی سنجیدگی سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

وہ کچھ سوچ کر کچن میں گئی اور تمام چیزوں کو ٹرے میں سیٹ کیا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے آ گئی۔ اس نے ٹرے لان میں رکھی میز پر رکھی تو اسود نے چونک کر اسے دیکھا جو بڑے خفت زدہ انداز میں سر جھکائے سامنے کھڑی دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل روکا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" اس نے بھی معصوم بن کر پوچھا۔

"آئی ایم سوری، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" اس کی معذرت نے اسود کے دل میں کئی پھول کھلا دیے۔ اس لیے اس نے بھی زیادہ نخرہ دکھانا مناسب نہیں سمجھا۔

"آئیں پھر جلدی جلدی شروع ہو جائیں قسم سے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ فضلو کے بچے نے ابھی تک کچھ نہیں بنایا۔" وہ بڑی عجلت میں بولا تو شرزمہ بھی جھجکتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کل یونیورسٹی میں آپ کی وہ طوطا رنگ گاڑی والی دوست ملی تھی۔" اسود کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

"کون......نویرہ؟"

"پتا نہیں نویرہ یا سویرہ لیکن بڑی پٹاخہ سی جو ہے۔ جس کے ساتھ آپ سارا دن یونیورسٹی کی سڑکوں کی خاک چھانتی ہیں۔" اسود کے خوشگوار انداز پر وہ مسکرائی۔

"ہاں میری وہ ایک ہی دوست ہے۔"

"اس کی بہن بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھی ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی۔" اسود نے ایک اور انکشاف کیا۔

"نویرہ کی بہن......؟" وہ نوالہ منہ میں لے جانا بھول گئی۔

"آپ کو نہیں بتایا اس نے؟" اپنی پلیٹ میں ڈھیروں کیچپ انڈیلتا اسود کا ہاتھ ساکت ہوا۔

"نہیں۔" شرزمہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"اسے یاد نہیں رہا ہوگا۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو شرزمہ نے بھی سر ہلا دیا۔

"بہت برائٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ زبردست ڈیبیٹر، بہت خوب صورت شاعرہ اور مصورہ۔ ہمیشہ ٹاپ کرتی تھی۔" اسود نے اسے مزید حیران کیا۔

"لیکن نویرہ تو ایسی نہیں ہے۔" شرزمہ کی بات پر اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہاں وہ تو ایوریج اسٹوڈنٹ ہے۔"

"آپ کیسے جانتے ہیں؟" وہ متجسس انداز میں بولی تو وہ مسکرا دیا۔

"بھئی پروفیسر صاحب اس ڈیپارٹمنٹ میں کافی عرصے سے پڑھا رہے ہیں اور میں بھی وزیٹنگ فیکلٹی میں ہوں اس لیے اپنے کولیگز سے بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ پتا چلتا رہتا ہے کہ کس اسٹوڈنٹ کی کیسی کارکردگی ہے۔" اس نے روسٹ کا ایک اور بڑا پیس اپنی پلیٹ میں ڈال کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا میرے بارے میں کیا رائے ہے؟" شرزمہ کی بے تابی پر وہ ایک دفعہ پھر مسکرایا۔ آج

پہلی دفعہ وہ اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔

''ابھی تک تو کوئی رائے نہیں، فرسٹ سمسٹر کے رزلٹ کے بعد ہی اندازہ ہوگا اور ویسے بھی آپ کلاس میں ہونے والے ڈسکشن میں حصہ بھی تو نہیں لیتیں اور ایسے اسٹوڈنٹس بہت کم اپنے استادوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔'' اسود کی بات پر اس کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''وہ لوگ تو مجھے بہت ڈل سمجھتے ہوں گے؟'' اسے ایک نئی فکر نے گھیر لیا۔

''نہیں، خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ انسان کا رزلٹ بتا دیتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔'' اسود نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ مطمئن تو نہیں ہوئی لیکن یونہی سر جھکا دیا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور اندر داخل ہوتی ہنی نے لان کا یہ منظر بڑی ناگواری سے دیکھا۔ شرزمہ کے چہرے کی اڑتی رنگت اسود کی زیرک نگاہوں سے چھپ نہیں سکی۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی اور اب ہنی کی آنکھوں سے عیاں ناراضی اس کے ہاتھ پیر پھلا رہی تھی۔

☆☆☆

''دادو یہ اوپر کون سی خلائی مخلوق دورہ کر گئی ہے جو اتنا سناٹا چھایا ہوا ہے؟'' وہ کھیر کا پیالہ لیے چھپ چھپا کر اوپر پہنچی اور کھڑے ہو کر سانس بحال کی پھر دائیں بائیں دیکھا۔ عطیہ آنٹی، حرا بھابی، احمر بھائی، شامی بھائی سب غائب تھے صرف والان میں دادو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے تسبیح کرنے میں مگن تھیں نویرہ کو دبے پاؤں اوپر آتے دیکھ کر وہ زیر لب مسکرائیں انہیں اپنی یہ باغی پوتی بہت عزیز تھی کیونکہ وہ واحد تھی جو اُن کی بڑی بہو الماس بیگم کے منہ پر حق بات کہنے کی جرأت رکھتی تھی۔

''آجاؤ نویرہ، لگتا ہے کہ تمہاری ہٹلر ماں نیچے نہیں ہے؟'' ارجمند خاتون نے ہنستے ہوئے بڑا درست اندازہ لگایا۔

''ہٹلر ماما اپنے ظلم و ستم کے تیر چلا کر ابھی کمرے سے نہیں لوٹیں اسی لیے تو نیچے ابھی سکون ہے۔ ورنہ کسی نہ کسی کی شامت آئی رہتی۔'' نویرہ برا سا منہ بنا کر ان کے ساتھ ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

''سب سے زیادہ زیر عتاب تو تم اور تمہاری رومی خالہ رہتی ہیں۔'' دادو نے پلیٹ اٹھا کر چیک کیا کہ وہ کیا اڑا کر لائی ہے۔

''نہیں۔'' اس نے فوراً ہی تردید کی۔ ''سوائے عابی کے سبھی ان کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ وہ ہر وقت ماما کو مسکا لگا کر قابو میں رکھتی ہے۔'' نویرہ نے اپنی بڑی بہن عبیرہ کا ذکر کیا جو اس کی ماما کی سب سے پسندیدہ اولاد تھی اور اسے سب گھر میں عابی کہتے تھے۔

''تو تم بھی یہ تھوڑی بہت مسکا بازی اس سے سیکھ لو۔'' ارجمند خاتون نے اسے چھیڑا جس کے چہرے کے زاویے بڑی تیزی سے بگڑے۔

''سوری دادو، کیا کروں یہ منافقت والی باتیں کم از کم میری زبان پر تو نہیں آتیں اور غلط بات کو میں درست نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''تو پھر وہ جو ٹرکوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے ناں کہ پاس کر یا برداشت کر اس پر عمل کرو۔'' دادو کی مزاح والی حس بھی کبھی بڑا کام کرتی تھی۔

''بھئی میں تو اکثر ہی ان کو پاس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ لوگ ہیں ناں برداشت کرنے کے لیے۔'' نویرہ نے بھی شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

''بری بات ہے بیٹا پھر بھی ماں ہے تمہاری... بدتمیزی نہ کیا کرو۔'' ارجمند خاتون کے اپنی بہو سے لاکھوں اختلافات تھے لیکن وہ دل کی بہت اچھی خاتون تھیں اس لیے کبھی دوسروں کو غلط سبق نہیں دیتی تھیں۔

''ایک بات تو بتائیں دادو؟'' نویرہ نے بڑے پُرجوش انداز میں ان کا جھریوں سے بھرا مہربان چہرہ دیکھا۔

''آپ کو پورے ملک میں میرے اتنے سوٹ اور شریف سے بابا کے لیے یہی ماما ملی تھیں لڑاکا سی آخر یہ رشتہ کروایا کس نے تھا؟'' نویرہ نے آج بے تکلفی سے پوچھ ہی لیا۔

''بس بیٹا اللہ نے قسمت میں میرے بیٹے کا یہی جوڑ لکھا تھا۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''بڑا ہی خطرناک جوڑ تھا یہ......'' نویرہ طنزیہ ہنسی۔

''تمہاری ماں یتیم بچی تھی مجھے رشتہ کروانے والی نے بتایا کہ صرف دو بہنیں ہیں۔ لڑکی لیکچرار اور باپ کا سایہ سر پر نہیں اور ماں لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرتی ہے۔'' انہوں نے آج اصل بات اگل ہی دی۔

''یہ کہیں ناں کہ ہمدردی میں کیا یہ رشتہ۔'' نویرہ روٹھے پن سے بولی۔ ''اور یہ ہمدردی آپ کو خاصی مہنگی پڑی، ہے ناں؟''

''خیر ہمدردی تو ہوئی لیکن تمہاری ماں جوانی میں بالکل مغرور شہزادیوں جیسا حسن رکھتی تھی۔ بس اسی حسن پر ابراہیم تصویر دیکھتے ہی فدا ہو گیا۔'' انہوں نے ماضی کی یادوں کو کھنگالا۔ ''اور لڑکی پڑھی لکھی خوب صورت تھی، بس تعلق غریب خاندان سے تھا اور امیری غریبی تو انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے میں نے بھی زیادہ نہیں سوچا۔'' ارجمند خاتون نے تکیے سے ٹیک لگا کر ایک اور ٹھنڈی آہ بھری۔

''اور سونے پر سہاگا، نانی کے انتقال پر رومی خالہ کو بھی خدا خوفی کے چکر میں لے آئیں۔'' نویرہ نے برا سا منہ بنا کر انہیں یاد دلایا۔ ''اس کے بعد ماما نے پورے گھر میں قبضہ کرتے ہی زبردستی اپنی بہن کو بھی رضا چچا کے سر منڈھ دیا۔''

''میں تو رومی اور رضا کے رشتے پر رضامند ہو ہی جاتی لیکن رضا کی بالکل مرضی نہیں تھی۔'' انہوں نے فوراً وضاحت دی۔

''اسی لیے وہ شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس گھر کو غصے میں چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے اور دوبارہ کبھی نہیں آئے۔'' نویرہ نے باقی کہانی مکمل کی۔ اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کے ذکر سے دادو کے چہرے پر نمودار ہونے والی رنج کی لہر بڑی فطری تھی۔

''اچھا چھوڑیں، اب زیادہ دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' نویرہ کو اس گھر میں سبھی سے گلے تھے۔ ''اگر اس وقت آپ اسٹینڈ لے لیتیں تو کافی زندگیاں خراب ہونے سے بچ جاتیں۔'' نویرہ کسی کو بھی آئینہ دکھانے سے باز نہیں آتی تھی۔

''بلکہ اس کے بعد بھی کئی موقع آئے لیکن آپ اور بابا نہیں بولے۔'' نویرہ کو کچھ اور بھی یاد آیا۔ ارجمند خاتون نے اپنی سب سے چھوٹی پوتی سے نظریں چرائیں۔ جو ہر وقت ہی شیشہ اٹھائے سب کو آئینہ دکھانے کا کارنامہ انجام دیتی تھی۔ دل کو بوجھل کر دینے والی خاموشی چاروں طرف پھیل گئی۔

''یہ عطیہ آنٹی اور حرا بھابی کہاں گئیں؟'' نویرہ نے یونہی بات بدلنے کو پوچھا۔

''ارسلان کے لیے کوئی رشتہ دیکھنے گئی ہیں۔'' دادو کے منہ سے بے اختیار نکلا ان کے اس جواب نے نویرہ کے دل پر زوردار گھونسا مارا۔ کئی لمحوں تک تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ روانی میں کیا کہہ گئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں کس قدر دکھ، بے یقینی اور صدمے کی کیفیت در آئی اِدھر ارجمند خاتون فوراً ہی وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ نویرہ کے پیروں کے نیچے سے گویا کسی نے زمین ہی کھینچ لی۔ وہ اب بھی تحیر کے عالم میں ان کی پشت کو گھور رہی تھی اسے لگا جیسے دادو کے روپ میں کوئی روح کو قبض کرنے والا فرشتہ اس نے دیکھ لیا ہو۔

☆☆☆

کمرے میں سیاہ گھپ اندھیرا تھا۔ تاریکی میں وحشت اور خاموشی کسی بے چین روح کی طرح گول گول چکر لگا رہی تھی۔ اس لڑکی نے سورج کی ایک ہفتے سے شکل نہیں دیکھی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ مون سون کا مہینہ تھا لیکن سورج پھر بھی روز نکل رہا تھا چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔

وہ تکیے میں منہ چھپائے پوری دنیا سے بیزار اور خوفزدہ تھی۔ اسے لوگوں سے ملنے سے نفرت تھی اس لیے اس نے خود کو ایک کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ وہ کئی کئی ماہ تک اپنے کمرے سے نکل کر باہر نہیں جھانکتی تھی۔

وہ کئی کئی گھنٹوں تک پیٹ کے بل لیٹی رہتی اور جب تھک جاتی تو اٹھ کر پاگلوں کی طرح چکر لگانے لگتی۔ اس کا بیڈ روم کافی بڑا تھا اور اس میں ایک بیڈ اور صوفے کے علاوہ تھوڑی بہت چیزیں تھیں جن میں سے ایک فریج اور ٹی وی بھی تھا لیکن وہ اس کا استعمال کئی کئی دن تک نہیں کرتی تھی۔ اسے اپنے خاندان کا کوئی بھی فرد اچھا نہیں لگتا تھا سبھی سے بری طرح چڑ تھی۔ ویسے تو دیکھنے میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور اچھی شکل صورت کی حامل، دراز قد لڑکی تھی لیکن اس کے دماغ میں بچپن سے پلنے والی منفی سوچوں نے اسے پوری دنیا سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ وہ ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھتی۔ اس لیے کسی سے بھی بات نہ کرتی۔

اس وقت بھی وہ کارپٹ پر بیٹھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے ہاتھ کے ناخن دانتوں سے کترنے میں مشغول تھی۔ یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کی شیپ بری طرح بگڑ چکی تھی۔

اس کام سے تھکنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سستی سے ایک انگڑائی لے کر اپنے بیڈ روم کی کھڑکیوں کی طرف بڑھی جن پر میرون ویلوٹ کے بھاری بھرکم پردے لٹک رہے تھے۔ آج بہت دن کے بعد اس کے دل میں دھوپ اور سورج کو دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ اس نے جیسے ہی پردہ ہٹایا۔ اسے گویا کرنٹ لگا۔ سامنے نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ روئی جیسے بادل جن میں گہرا سرمئی رنگ نمایاں تھا اس وقت اس کے لیے عذاب بنے کھڑے تھے۔ اس نے بہت دور بادلوں کے بیچ میں ہلکی سی بجلی چمکتے دیکھی تو اس کے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر بڑی سرعت سے دوڑی۔ اس نے گھبرا کر پردے کھڑکیوں کے آگے کر دیے۔

باہر زور سے بادل گرجا اور اس لڑکی کے چہرے کا رنگ خوف کی زیادتی سے سپید پڑ گیا۔ وہ گھبرا کر اپنے بیڈ کی طرف دوڑی اور کمرے کی تاریکی میں اس کا گھٹنا بیڈ کے کونے سے ٹکرایا۔

''ماما......!'' اس نے درد کی زیادتی سے گھبرا کر لاشعوری طور پر اپنی ماں کو پکارا۔ اسی لمحے بادلوں کی گڑگڑاہٹ کمرے کی تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے اس کی سماعتوں تک پہنچی اور اس لڑکی کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی۔

باہر تیز بارش کے ساتھ بادلوں کی گرج کی آواز نے گویا اس لڑکی کی زندگی میں بھونچال برپا کر دیا اور وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے بے اختیار دل دہلا دینے والی چیخیں مارنے لگی۔ اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑک رہا تھا اور پورے کمرے میں بادل بھوت بن کر اسے ڈرا رہے تھے۔

''ہاہاہا...... ہاہاہا...... ہی ہی ہی...... ہی ہی ہی۔''

بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی یہ آوازیں اس لڑکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ آنکھیں سختی سے بھینچے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھوں سے ڈھانپے بس روئے جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔

(باقی آئندہ)

چاند اور محبت

نوشین طاہر

حجاب پچھلے آدھے گھنٹے سے اِدھر سے اُدھر ٹہلتی پھر رہی تھی...... بے بے کو اس کا یوں چکر کاٹنا ناگوار گزر رہا تھا۔ آخر وہ منہ میں پان رکھتے ہوئے بول ہی پڑیں۔

''ارے کیوں جلے پاؤں کی بلی کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر کاٹ رہی ہو اور ہمیں بھی چکر دے رہی ہو...... ہزار بار سمجھایا ہے کہ لڑکیوں کو یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں...... پر میری تو اس گھر میں سنتا ہی کون ہے۔'' انہوں نے ناگواری سے عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اسے یوں ٹہلتا دیکھ کر کہا۔ وہ ان کی بات سن کر مسکرا دی اور اگلے ہی لمحے قریب آ کر لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

''بے بے آپ ناراض مت ہوا کریں، آپ تو جانتی ہیں جب مجھے کوئی ٹینشن ہو تو میں ایسے ہی الٹی سیدھی حرکتیں کر جاتی ہوں۔ مجھے فکر ہے اگر اماں نے...... اور تایا جی کی رائے سے اتفاق کر لیا تو کیا ہوگا،



بے بے مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟“

”میری بچی تو پریشان کیوں ہوتی ہے، رب پر بھروسا رکھ اور میں نے تجھے کہا ہے ناں کہ میں تیری ذات کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دوں گی تو پھر کیوں سوچ، سوچ کر خود کو ہلکان کررہی ہے۔“ انہوں نے پوتی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہ ان کے تسلی بھرے انداز سے مطمئن ہو کر کچن میں آگئی اور افطار و کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ سحری کے لیے بھی کچھ اسپیشل مینو سوچنے لگی۔

اماں اپنے بڑے بھائی سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھیں...... اور وہ گھر کی تمام ذمے داریاں بڑی خوش اسلوبی سے نبھارہی تھی جیسے اماں نبھایا کرتی تھیں۔ حجاب کو اپنی ماں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ایک طرف اس کے اماں، بابا اور تایا کی خوشی تھی تو دوسری طرف اس کی اپنی محبت تھی جس سے آشنا ہوئے اسے خود بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اب اسے محسوس ہورہا تھا کہ محبت کا یہ خوب صورت احساس اس کے لیے زیادہ دیرپا نہیں ہے، اسے ڈر تھا کہ اس کی آنکھوں میں سجے سنہرے خواب ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہ ہوجائیں۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی طوفان آنے والا ہے مگر طوفان کا رخ موڑنے کا اطمینان اس کی بے بے نے اسے دلایا تھا۔ وہ شروع سے بے بے کے قریب رہی تھی اور اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک انہیں بتادیا کرتی تھی اور اس بار بھی وہ پوتی کے حالِ دل سے انجان نہیں تھیں۔

حجاب ان کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھی جبکہ ان کے بڑے بیٹے وہاب احمد کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹی ثنا اور ایک بیٹا جواد...... ثنا کی دو سال قبل شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے سسرال میں خوشحال زندگی بسر کررہی تھی جبکہ جواد ایم بی اے کرنے کے بعد اپنے دوست کے والد کے توسط سے امریکا چلا گیا تھا اور اب وہاں ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کررہا تھا، حجاب کی اماں کچھ سال قبل خالقِ حقیقی سے جاملی تھیں جبکہ تایا وہاب احمد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ان کے بزنس میں ان کو ساتھ دے اور اسے آگے بڑھائے لیکن جواد کو شروع سے ہی ملک سے باہر جانے کا جنون تھا اور اس کی ضد کی وجہ سے کوئی اسے نہیں روک سکا تھا۔ اس وقت تو وہاب احمد نے اسے جانے دیا تھا مگر اب پانچ سال بیت گئے تھے وہ واپس آنے کی صرف تسلیاں ہی دے رہا تھا اور وہاب احمد اور حجاب کے والدین نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جیسے ہی جواد وطن واپس آئے اس کی شادی حجاب سے کردی جائے۔ ابراہیم احمد اور عائشہ بیگم اس فیصلے سے خوش اور مطمئن تھے کہ چلو بیٹی تایا کے گھر جائے گی تو اچھا رہے گا۔ جبکہ حجاب کو جواد شروع سے ہی ناپسند تھا اور اب جبکہ اس کے دل کی بستی پر احمر براجمان تھا تو وہ جواد کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔

احمر بھی ان کا دور پار کا رشتے دار تھا، وہ ایک سوبر شخصیت کا مالک تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کررہا تھا...... احمر سے حجاب کی پہلی ملاقات بہت سرسری انداز میں ہوئی تھی......

بے بے احمر کی بڑی بہن کی شادی میں گئی ہوئی تھیں اور انہیں واپسی پر گھر تک ڈراپ کرنے احمر ہی آیا تھا اور چند منٹ ٹھہرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا تھا مگر حجاب اس کے جانے کے بعد اسے بھلا نہیں پائی تھی۔ احمر سے چند منٹ کی ملاقات اسے اپنی زندگی کا حاصل لگنے لگی تھی۔ وہ جب بھی اپنی آنکھوں کو بند کرتی چھم سے اس کی آنکھوں میں احمر کی وجیہہ صورت آکر ٹھہر جاتی۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کو کوئی نام نہیں دے پارہی تھی کہ چند دن بعد ہی جب احمر کے گھر والے اس کے لیے باقاعدہ اس کا پرپوزل لے کر آئے اور احمر کی بہن نے چپکے سے اسے بتایا کہ ہم یہ پرپوزل احمر بھائی کی مرضی سے لے کر آئے ہیں تو وہ بے یقینی کی کیفیت میں اپنے دل کی دھڑکنوں کی گھٹتی

بڑھتی ہوئی رفتار کو سننے لگی...... جو صرف ایک ہی نام پکاررہی تھیں...... احمر...... احمر...... احمر پھر اسے اپنے دل کے لطیف جذبات سمجھنے میں دیر نہیں لگی...... اسے احمر سے محبت ہوگئی تھی اور وہ یہ جان کر بہت خوش تھی کہ محبت کے اس سفر میں اس نے تنہا قدم نہیں رکھا اسے منزل تک لے جانے کے لیے کوئی منتظر ہے وہ خود کو بہت خوش قسمت محسوس کررہی تھی کیونکہ اس نے تو سنا تھا کہ محبت کے بدلے محبت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے...... مگر یہاں تو محبت اس کے لیے دامن پھیلائے کھڑی تھی اور اسے یقین تھا کہ احمر کے پرپوزل کو گھر والے خوشی، خوشی قبول کرلیں گے کیونکہ وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا...... اور اس کے رشتے کو ٹھکرانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی۔ احمر کے گھر والوں کو چند دن بعد جواب دینے کا کہہ کر رخصت کردیا گیا تھا...... حجاب خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب احمر کو اس کا نصیب بننے سے کوئی نہیں روک سکتا اور گھر والوں کا جواب ہاں میں ہی ہوگا۔ وہ نادان جانتی نہیں تھی کہ بڑوں میں کیا بات چل رہی ہے۔ وہ اپنی خاموش محبت پر نازاں تھی کہ قدرت نے کتنی آسانی سے اسے اس کی زندگی کی سب سے حسین خوشی دینے کا اشارہ کردیا تھا احمر کا باقاعدہ رشتہ آنے پر ابراہیم احمد کو بھائی کی بات کا خیال آیا اور جب یہ بات کھلی تو اس کا یقین لرزنے لگا۔ اسے اپنا آپ احمر سے کوسوں دور دکھائی دینے لگا کیونکہ ان کے گھر میں ہمیشہ اس کے بابا اور تایا کے فیصلے کو اہمیت دی گئی تھی، ان کا ہر فیصلہ حرفِ آخر کی طرح مانا جاتا تھا۔ حجاب بچپن سے ہی اپنی چھوٹی، چھوٹی باتیں اپنے دادا جی اور بے بے سے کیا کرتی تھی اور اب جب اس کے دادا جی اس دنیا میں نہیں رہے تھے تو اس کی ہر بات کو اس کی بے بے بہت اہمیت دیا کرتی تھیں اور ان کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ حجاب کی ہر خواہش پوری کریں اور انہوں نے حجاب کو اس بار بھی یقین دلایا تھا کہ وہ

جو غذا بھی دوا بھی

حضرت محمد ﷺ غارِ حرا میں عبادت کے لیے جاتے تو جو کی روٹی یا ستو ساتھ رکھتے۔ صحابہ کرامؓ بھی بھوک لگنے پر ستو پھانک لیتے۔ ایک غزوہ میں تو حضور اکرمؐ اور تمام صحابہ کرامؓ کی غذا ستو پر مشتمل تھی۔

جو کی تاثیر سرد و خشک ہے۔ گرم مزاج اور موٹے افراد کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس میں پوٹاشیم کاربونیٹ پایا جاتا ہے۔ اس لیے شوگر بلڈ پریشر، امراضِ قلب اور اسہال میں بہت مفید ہے۔

گرم موسم میں جو کی روٹی کھانے سے پیاس نہیں لگتی اور روزے کی حالت میں یہ غذائیت...... فراہم کرتا ہے اگر دودھ میں ملا کر استعمال کیا جائے تو یہ تقویت جسمانی کے علاوہ جلد اور چہرے کو تمام قسم کے داغ دھبوں اور جھائیوں سے پاک صاف کرکے نکھارتا اور شاداب کردیتا ہے۔

کمزور بچوں کی نشوونما کے لیے جو کی کھیر بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ سینے اور پیٹ کے امراض میں بھی مفید ہوتا ہے۔ معدے کے امراض، خون میں کولیسٹرول کی زیادتی اور ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنے کے لیے یہ ایک بہترین غذا اور دوا ہے۔ جو کے استعمال سے دانت بوسیدگی سے محفوظ رہتے ہیں۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

ہے اور ویسے بھی اسے کیا اعتراض ہوگا؟"

"بیٹا تم لوگ ایک بار احمر کے رشتے پر بھی نظر ڈال لیتے تو اچھا ہوتا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں...... جواد آپ کا پوتا ہے اور آپ جواد کے بجائے احمر کو ترجیح دینے کو کہہ رہی ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو بیٹا...... جواد اور حجاب دونوں ہی میرے بچے ہیں، حجاب اس گھر میں رہے میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے لیکن ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہمارے بچوں کی خوشی کس میں ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں...... زندگی تو انہوں نے گزارنی ہے ناں پھر ہم ان کی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کیسے کر سکتے ہیں اور بیٹا سچی بات ہے شادی زبردستی کا سودا نہیں...... بلکہ یہ تو رشتوں کی صورت میں ایک خوب صورت بندھن ہے اگر اس میں زبردستی کی جائے تو یہ بندھن ناگوار زنجیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے...... جس میں بندھنے کے بعد انسان خود کو بے بس قیدی کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے...... یہ بات ہم سب ہی جانتے کہ حجاب اور جواد کی بچپن سے آپس میں کبھی نہیں بنی اور اگر دونوں بچوں کا بعد میں بھی ذہن نہ ملا تو نہ صرف ہمیں پریشانی ہوگی بلکہ ان کی گرہستی بھی مشکل میں پڑ جائے گی۔" بولتے بولتے وہ کچھ دیر رک کر بہو کا چہرہ دیکھنے لگیں پھر آہستہ آواز میں بولیں۔

"احمر اچھا لڑکا ہے ہمارا رشتے دار بھی ہے، مجھے لگتا ہے حجاب اس کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی۔"

"بے بے آپ اس بارے میں سوچ کر خود کو پریشان نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ حجاب، جواد کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی اور کزنز میں چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک تو چلتی رہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ اپنی اولاد کے بارے میں زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہو اور میں ٹھہری پرانے دور کی...... مجھے ان سب باتوں کی کہاں سمجھ۔" انہوں نے اِک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور مایوس ہو کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

حجاب، بے بے کو سحری کے لیے جگانے آئی تو وہ پہلے سے ہی جاگ رہی تھیں اور جانماز پر بیٹھی اپنی پوتی کی خوشیاں مانگ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ بے بے نے اپنی دعا مکمل کی تو ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ انہیں اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنی پوتی کے لیے کچھ نہیں کر پائیں۔

"بے بے کیا ہوا...... آپ رو رہی ہیں؟" حجاب نے پریشان ہو کر ان سے پوچھا...... بے بے نے حجاب کو یوں اپنے لیے پریشان ہوتے دیکھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"میری بچی کس طرح تو سب کا دکھ محسوس کر لیتی ہے مگر تیرا دکھ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا اور میں تیرے دل کی حالت سمجھتے ہوئے بھی تیرے لیے کچھ نہیں کر پائی۔"

"آپ نے اماں، بابا سے بات کی......؟ انہوں نے کیا کہا؟"

"تمہارے ماں، باپ فیصلہ کر چکے ہیں شاید وہ تمہارے لیے جواد کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں مجھے معاف کر دے میری بچی میں تیرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی۔"

"آپ ایسے مت کہیں بے بے۔ اس سب میں بھلا آپ کا کیا قصور...... آپ تو کوشش ہی کر سکتی تھیں ناں...... اور پھر جب خدا نے ہی میری قسمت میں یہ سب لکھ دیا ہے تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"میری بچی مایوس مت ہو، خدا سے اچھے کی امید رکھ۔ وہ قسمت کے لکھے کو بدل بھی تو سکتا ہے اس کے اختیار میں کیا نہیں...... کہتے ہیں رب سے آخری وقت تک مانگتے رہنا چاہیے، وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔"

"بے بے خدا پر ہی تو آس لگائی ہوئی ہے۔ بندے ہمیں دے بھی کیا سکتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے دادی کو قدرے مطمئن کر دیا تھا مگر اس کے اپنے دل کو کسی طور سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے کچن کی طرف چل دی۔

☆☆☆

رمضان کا مہینہ کب اور کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا تھا اور آج آخری روزہ افطار کرنے کے بعد چاند دیکھنے کے لیے اوپر چھت پر چلی آئی تھی...... جبکہ باقی گھر والے جواد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے ابھی ایک گھنٹے پہلے ہی ائرپورٹ سے اپنے آنے کی خبر گھر والوں کو دی تھی وہ سب گھر والوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا...... سب گھر والے یوں اچانک جواد کے آنے کی خبر سن کر بہت خوش تھے اور بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے اور عائشہ بیگم کی نظریں دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ دروازے پر دستک کی آواز پر عائشہ بیگم نے تقریباً دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا اور سامنے کے منظر کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... کیونکہ جواد کے ساتھ مغربی طرز کے لباس میں ایک نازک سی گوری چٹی لڑکی کھڑی تھی۔ انہوں نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے جواد کے ماتھے پر بوسا دینے کے بعد اس سے وہیں کھڑے کھڑے اس انگریز لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

"ارے چچی جان اندر تو آنے دیں، اس کا تعارف بھی کرواتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں آؤ بیٹا۔" کہتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں اور انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ جواد کے ساتھ اس گوری کو دیکھ کر سب ہی حیرت میں مبتلا تھے کہ جواد نے مسکراتے ہوئے سب کی حیرت دور کی۔

"یہ میری وائف انجلینا ہیں......" سبھی نے دکھ اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے جواد کی طرف دیکھا اور پھر جونہی عائشہ بیگم کی نظریں بے بے سے ملیں تو انہیں خود پر بہت شرمندگی ہوئی...... اور وہ ان کے قریب آ کر کہنے لگیں۔

"بے بے، آپ ٹھیک تھیں، مجھے معاف کر دیں آپ نے سچ ہی کہا تھا کہ ہماری حجاب کے لیے احمر سے اچھا لڑکا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" ابھی وہ بات ہی کر رہی تھیں کہ احمر اور اس کے گھر والے چاند مبارک کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عائشہ بیگم نہایت خوشی سے ان کا استقبال کرنے لگیں۔

"ارے بھئی حجاب کہاں ہے، ہم لوگوں نے سوچا آج سے بہتر دن آپ سے حجاب کا ہاتھ مانگنے کے لیے ہو ہی نہیں سکتا...... آپ لوگوں نے ابھی تک کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا، طلب کرنے خود ہی چلے آئے اور ہم "ہاں" میں جواب لے کر ہی جائیں گے۔" احمر کی والدہ نے بڑے مان سے ان سے کہا تو عائشہ بیگم نے انہیں گلے لگاتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اِدھر احمر کی متلاشی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور نہ جانے کس وقت اس کی بہن چپکے سے اسے چھت پر لیے چلی آئی جہاں حجاب متلاشی نظروں سے چاند کو ڈھونڈ رہی تھی۔

"ارے چاند اِدھر ہے، آپ وہاں کہاں دیکھ رہی ہیں۔" احمر کی آواز سن کر حجاب نے چونک کر دیکھا وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بہن احمر کو چھت پر چھوڑ کر خود نیچے چلی گئی تھی۔

حجاب، احمر کو یوں اچانک وہ بھی اپنے پیچھے چھت پر دیکھ کر شدید حیران ہو رہی تھی، اسے خبر ہی نہیں تھی کہ قدرت کو اس پر رحم آ گیا اور اس کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا درجہ پا گئی تھیں۔ سچ ہے لگن سچی ہو تو منزل خود چل کر آ جاتی ہے۔

مکمل ناول

دھند کے اس پار

ناہید فاطمہ حسنین

"ممی میں کچھ نہیں جانتی۔" قرت تڑختی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

"اگر آپ نے اب تک کچھ نہیں سوچا اور نہ کسی فیصلے پر پہنچ پائی ہیں جو آپ پہنچ بھی نہیں پائیں گی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں آپ کو پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ آپ سوچیں یا نہ سوچیں، فیصلہ میرے حق میں ہی کرنا ہے۔" وہ لمحے بھر کو سانس لینے کو رکی تھی۔

"اور مجھے لگتا ہے کہ اتنا وقت لینے کے باوجو



آپ دانستہ کسی فیصلے پر پہنچنا نہیں چاہتیں۔'' اس نے لفظ دانستہ کو خوب چبا کر کہا۔

ٹی وی دیکھتے' دیکھتے انہوں نے مڑ کر قرت کو تکا جو ایٹم بم بنی دھماکے کر رہی تھی، انہوں نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کی آواز دانستہ بڑھائی' وہ نہیں چاہتی تھیں قرت کی اونچی آواز اوپری منزل میں آپا بیگم تک جائے۔ انہوں نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ پھر بم برسانے لگی۔

''آپ جلد از جلد میرے فیصلے پر تصدیق کی مہر ثبت کر دیں ورنہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کورٹ کا راستہ کھلا ہے۔'' لحظہ بھر کو اس نے بہت ظالم نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''پھر مت کہیے گا کہ بدنامی نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔''

انہیں لگا قرت نے ان کے سر پر بارود بھری گاڑی چڑھا دی اور وہ چیتھڑوں کی صورت پھٹ کر تقسیم ہو رہی ہوں۔

''میری تربیت میں کب اور کہاں کمی آ گئی، میں نے تو اس سب کے بعد بہت کڑی تربیت کی تھی تا کہ ایک غلط فیصلے کے بعد دوسرا غلط فیصلہ رقم نہ ہو جائے مگر شاید ہونی ہو کر رہتی ہے۔ یہ سب ایسا اور اسی طرح ہونا تھا۔ تاریخ ہمیشہ خود کو دُہراتی ہے۔ مکافات کا عمل ہو کر رہتا ہے اس سے مفر ممکن نہیں خواہ ہم کتنی معذرتیں، کتنے معافی نامے داخل کر دیں اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں معافیاں رائگاں جاتی ہیں۔ اپنے بوئے کو ضرور کاٹنا پڑتا ہے اب یہ ہم پر ہے کہ ہم گلاب کاشت کریں کہ ببول...... ہر دو صورتوں میں پھل وہی ملے گا جو ہم نے بویا ہوگا۔'' وہ ایک ٹک قرت کو تکتی رہیں انہیں لگا ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی ہوں پھر اُن میں نمی کا احساس ہوا۔

''جتنی جلدی ہو آپ بابا سے بات کر لیں اگر میرے فیصلے کو آپ اپنے نام سے سنائیں گی تو آپ ہی کی توقیر میں اضافہ ہوگا ورنہ مجھے تو......'' بہت نوکیلی مسکراہٹ اس کے لبوں کے گوشوں کو پھیلا گئی۔

''میرے فیصلے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا...... میں کوچنگ جا رہی ہوں، بائے۔'' وہ ایڑیوں کے بل گھومی تھی بنا جواب بنا اجازت لیے وہ اونچی ایڑی کھنکھناتی گھر سے نکل گئی اور وہ بت بنی سوچے چلی گئیں لاکھ منع کرنے کے باوجود جدید تراش خراش کے ٹائٹ اور شارٹ ٹاپ، نت نئی ہیئر اسٹائل ہلکے' ہلکے میک اپ میں کالج اور کوچنگ جانے والی لڑکیاں وہاں جا کر کیا' کیا نہ گل کھلاتی ہوں گی مگر جب انہوں نے روکنا چاہا تھا تب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور یہ پانی باندھے گئے بند میں شگاف ڈالتا اپنا راستہ خود بنا رہا تھا۔

مرے مرے قدموں سے اٹھ کر وہ گیٹ بند کرنے گئیں ہلکا سا سر اونچا کر کے انہوں نے بالکونی میں کھڑی آپا بیگم کو دیکھا جو قیامت خیز طنز سے مسکرا کر اندر جانے کو مڑی تھیں۔ کپکپاتے وجود کو بہ مشکل گھسیٹتی بیڈ روم تک لائیں اور بے دم ہو کر بیڈ پر گر سی گئیں۔ انہیں لگا جیسے در و دیوار بھی آپا بیگم کے ساتھ مل کر طنزیہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

آج آنکھوں کو رونے سے مت روکیے
آج بارش تھمے ہم نہیں چاہتے

آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو انہیں بائیس چوبیس سال پیچھے بہا لے گیا جہاں قرت کے قالب میں وہ خود تھیں۔

☆☆☆

اماں بہت سیدھی سادی خاتون تھیں اور وہ اُن کی اکلوتی اولاد۔ جتنی اماں سیدھی تھیں اتنے ہی بابو جی بھی۔ اس کی منگنی بچپن سے اس کے پھوپی زاد آزر سے طے تھی۔ پھپھو کے دو ہی لڑکے تھے۔ پھپھو بہت محبت کرنے والی شفیق خاتون تھیں بالکل اپنے

بھائی بابو جی جیسی۔ جب وہ کالج میں آئی تب اسے حماد بھا گیا اور ایسا بھایا کہ اس کی محبت میں اسے کل کائنات ہیچ اور بے معنی لگنے لگی۔

جب پھپھو کا شادی کے لیے اصرار بڑھا اور اماں نے بابو جی سے بات کی تو اس نے کمرے میں داخل ہوتے وقت گفتگو سن لی۔ اسے لگا کمرے کی چھت اس پر آ رہی ہو وہ الٹے قدموں پلٹی اپنے کمرے میں آ کر اوندھی لیٹ کر خوب رو رو کر دل کی بھڑاس نکالی۔

''رونا مسئلے کا حل نہیں۔ مسئلے کا حل اماں اور بابو جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ہے۔'' کافی دیر رونے کے بعد اس کے ذہن میں یہ بات سمائی اور وہ اماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ڈھونڈنے لگی اور ساتھ میں مناسب الفاظ بھی۔

اماں اس کے جہیز کے لیے رکھے جوڑے گن رہی تھیں تبھی وہ ان کے سر پر سوار ہو گئی۔

''یہ سب تیاری بیکار جائے گی۔ میں آزر سے شادی نہیں کروں گی۔'' اس نے گویا بم اُن کے سر پر پھوڑ دیا۔

''ہائیں؟'' اماں فق اسے دیکھنے لگیں۔

''کیا تو پاگل تو نہیں ہو گئی؟''

''جی نہیں، بالکل ہوش و حواس میں ہوں۔'' اس نے ترکی بہ ترکی کہا تو اماں آہنی لہجے میں بات کرتی نوشین کو غیر یقینی انداز میں دیکھنے لگیں۔

''باؤلی...... شادی میں دن ہی کتنے ہیں۔ مجھے تو یہ مذاق بالکل نہیں پسند۔'' اماں نے اپنے طور پر یقین نہ کرتے ہوئے ماحول کو خوشگوار کرنا چاہا۔

''میں مذاق وذاق کوئی نہیں کر رہی۔'' ٹھیک ٹھاک گستاخی سے اس نے کہا تو انہوں نے بہت ترحم سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اسے رحم آ جائے اور وہ ہنس کر اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہے۔

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

''ارے دیوانی...... سب طے ہے۔ بس تیری پھپھو رسم کے طور پر پیغام لائیں گی۔''

''جی مجھے پتا ہے تبھی تو آپ سے آ کر بات کی کہ انہیں روک دیں۔ میں جہاں بتاؤں گی وہاں شادی کر دیں۔'' لہجہ ایک دم سپاٹ تھا۔

''ہیں......؟'' انہوں نے سینے پر دو ہتھڑ مارے۔ ''جہاں بتاؤں گی؟'' انہوں نے سوالیہ نگاہیں اس پر گاڑ دیں پھر بے حد بے بسی سے بولیں۔ ''میری بچی' میری ناک کٹ جائے گی۔''

''نہیں۔ کچھ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ تو اس وقت فرعون بنی ہوئی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہے بیٹی، میں نے تیری تربیت ایسی تو نہ کی تھی؟''

''تو میں نے ایسا کیا برا کر لیا جو آپ تربیت کو لے بیٹھیں۔'' برا کرنے والی کو اپنا عمل برا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ ''مرضی سے شادی کرنا میرا حق ہے اور میں اپنا حق استعمال کر رہی ہوں۔'' وہ شروع ہی کی تیز اور تند خو تھی لیکن اماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی تیزی یہ رنگ دکھائے گی۔

''اور میں تیری پھپھو کو کیا منہ دکھاؤں گی؟'' ہارے جواری کی طرح وہ گڑگڑائیں۔

''کہہ دیجیے گا نوشین تیار نہیں ہوئی۔'' کس آسانی سے اس نے قضیہ نمٹا دیا۔

''کیا......؟'' اتنی بے باکی، اتنی جرأت...... وہ سر پیٹ کر رو پڑیں اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

کافی دن گھر اور گھر والوں پر قبرستان کے سناٹے جیسے گزرے۔ بابو جی حیران تھے انہیں ماں اور بیٹی کے رشتوں میں منجمد برف نظر تو آئی مگر کیا بات ہے اس کا سرا نہ مل کے دیا۔ بیوی کو کریدا وہ ٹال گئیں۔ چھپ چھپ کر روتی رہیں، اسے سمجھاتی

رہیں اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ جوانی میں عشق کا بھوت بہت زور آور، بہت نڈر رہتا ہے۔ اس سیلاب کے مانند جو راستے کی ہر شے کو بہالے جاتا ہے۔

☆☆☆

اس روز پھپھو مٹھائی لے کر آئیں تو نوشین کے سر درویتے پر چونکے بنا نہ رہ سکیں اور اماں تو ایسے ہوگئیں جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

اُدھر اس نے حماد سے بات کی تو حماد بغلیں جھانکنے لگا۔ اس کا غصہ تو عروج پر جا پہنچا۔

''کیا مسئلہ ہے حماد...... بولو؟'' انداز خالص مردانہ تھا۔ ''اُدھر میرے گھر والے میری شادی طے کررہے ہیں اِدھر تم آنا کانی کررہے ہو۔ بولو کیا بات ہے، کیا مجھ سے فلرٹ کررہے تھے؟''

''نن...... نہیں، نہیں۔'' وہ گھبرا گیا۔ ''مسئلہ کچھ اور ہے۔'' وہ ہکلایا۔

''پتا ہے مجھے۔'' کمر پر ہاتھ ٹکا کر وہ بولی۔ ''یہی ناں کہ تم نے ابھی تک گھر والوں سے بات ہی نہیں کی ہے؟''

''میں نے اشارتاً تو انہیں کہہ دیا تھا۔''

''پھر؟''

''پھر کیا یار......'' وہ الجھا۔ ''طوفان کھڑا ہوگیا۔''

''پھر؟'' اس نے منہ بھینچ کر لفظ چبایا۔

''پھر کیا...... کچھ نہیں۔'' حماد کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔

''حماد میاں، یہ سب نہیں چلے گا۔'' خالص بدمعاشوں کی طرح ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر دوسرا ہاتھ حماد کے منہ پر نچایا۔ ''لڑکی ہوکر میں نے گھر والوں سے ٹکر لی ہے تو آپ کو بھی اپنے گھر کے طوفان سے نمٹنا ہوگا ورنہ چوڑیاں پہن لینا، لاکر دے دوں گی۔'' وہ ایسی ہی مردمار قسم کی تھی۔

''جو منہ میں آتا ہے بولے چلی جاتی ہو...'' حماد کو غیرت کے للکارے جانے پر طیش آگیا۔

''زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے آج ہی گھر والوں کو میرے ہاں بھیجو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میرے کہتے ہی سب تمہارے ہاں روانہ ہوجائیں گے؟''

''میں یہ سب نہیں جانتی...... اگر میرے گھر والوں نے شادی طے کردی ناں تو میں تو خیر نیند کی گولیاں کھا کر مر ہی جاؤں گی لیکن تیزاب سے تمہارا منہ بھی پکا جاؤں گی۔'' وہ اچھل پڑا۔

توبہ توبہ اس کے خیالات یہاں تک تھے۔ ایسی ہی تھی اتنی ہی تیز، بہادر، نڈر بے خوف کسی سے نہ ڈرنے والی۔ انجام سے بے خبر۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اندر اندر کانپتے ہوئے گھگیایا۔

''ماشاء اللہ۔'' وہ تمسخر سے ہنسا۔ ''یہ سلوک ابھی سے وہ بھی اس کے ساتھ جو تمہیں اتنا چاہتا ہے۔''

''ہاں تو چاہت نظر بھی تو آئے، خالی خولی الفاظ کے داؤ پیچ...... ہونہہ!'' وہ کب دبنے والی تھی۔

☆☆☆

اب تو اس کا روز کا معمول ہوگیا تھا کالج کے بجائے وہ اس کے پاس پہنچ جاتی اور سارا زور رشتہ بھیجنے پر ہوتا۔ ایک روز اس نے بہت تحمل سے اسے سمجھایا۔

''دیکھو نوشین مسئلہ یہ ہے کہ......'' اس نے گلا کھنکھارا۔ ''جیسا کہ تمہیں پتا ہی ہے، میں اکلوتا بیٹا ہوں مجھ سے چھوٹی راحمہ جس کی شادی ہونی ہے، مجھ سے پانچ سال بڑی آپا بیگم جو بیوہ ہیں ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

''مختصر۔'' وہ لمبی تمہید سے الجھ کر ڈپٹی۔ ''مختصر بات کرو، تم جانتے ہی ہو مجھے اتنی لمبی تمہید کبھی پسند نہیں رہی۔'' وہ پوری لڑاکا عورتوں کی طرح کمر کسے ہوئے تھی۔

''تم جانتی ہو دو سال قبل ہی میری جاب لگی ہے۔

کوئی بڑا افسر تو ہوں نہیں۔ بیوہ ماں کا گزارہ میری تنخواہ، بابا کی پنشن اور گھر کے کرائے سے چلتا ہے اور ہم چار نہیں...... شادی کے بعد تمہارے اخراجات...... نئی دلہن کو کچھ تو اچھے حالات میسر آئیں۔''

''نہیں چاہئیں اچھے حالات۔'' جوانی اور عشق کی رو میں بہہ کر اٹل حقیقت سے انحراف کرنے والی اپنی ضد پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''سوچ لو، تنگی کا شکوہ پھر مت کرنا۔''

''نہیں کروں گی۔''

''جو اور جیسے بھی حالات ہوں گے گزارہ کرلو گی؟''

''ہاں، ہاں بابا کہہ دیا ناں، بس اب بھیجو۔'' اس کی سوئی تو وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے پھپھو کو انکار کردیا؟'' کافی دن ماں بیٹی میں سرد جنگ چلتی رہی اور دونوں طرف خاموشی کا راج رہا۔ حماد سے او کے کا سگنل ملنے کے بعد اس نے اماں سے اسی اکھڑے لہجے میں بات کی۔

''کیا ہے نہ کروں گی۔'' اماں پھٹ پڑیں۔

''مت کریں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''مگر اُن کے بیٹے کی دلہن کسے بنائیں گی؟'' مسکراہٹ میں بلا کی سفاکی تھی۔

''کمبخت، مردود، منحوس دفع ہو۔ مرجا خدا کرے۔''

''حماد سے شادی کردیں پھر کہیے گا میں مرگئی۔''

''حماد! کون حماد؟'' وہ بری طرح چونکیں پھر خود ہی سمجھ گئیں اور ڈھے سی گئیں۔

کمرے میں آتے بابو جی نے سب سن لیا۔ انہیں لگا گھر کی چھت آسمان سمیت ان پر آپڑی ہو یا زمین آسمان گردش کرتے کرتے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ وہ ہونق بنے چشم تصور میں اپنی عزت کا جنازہ نکلتے دیکھ رہے تھے۔ اَب انہیں ماں، بیٹی کے سرد رویّے اور نوشین کے اکھڑے بدتہذیبی میں پور پور ڈوبے لہجے کی سمجھ آگئی تھی۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی وہ واپس پلٹ گئے۔ نوشین غصے میں بل کھاتی ناگن کی طرح پیر پٹختی اپنے کمرے کی سمت چلی گئی، وہ دبے قدموں اندر داخل ہوئے۔

قانتہ بیگم ہچکیوں سے روتی جاتیں دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کرتی جاتیں۔ اس سمے انہیں وہ دنیا کی سب سے قابلِ رحم ہستی لگیں۔

''رشتے تڑوانے والی عورت کے نکیل نہیں ڈالی جاتی قانتہ بیگم۔'' وہ بری طرح چونکیں سامنے مراد جمال کھڑے تھے۔ ''جتنی جلدی ممکن ہو اس غلاظت کے ڈھیر سے نجات حاصل کرو۔ سمجھ لینا ہم نے کوئی اولاد جنی ہی نہیں تھی۔ ہم کبھی ماں باپ بنے ہی نہیں تھے۔ آخر کو لوگ بانجھ بھی تو ہوتے ہیں ناں۔ اس ناہنجار اولاد سے ہم بانجھ بھلے۔ سمجھ لینا ہم چٹیل میدان جیسا صحرا تھے جس پر کبھی برگ و بار اگا ہی نہیں۔'' قانتہ بیگم ان سیدھے سادے مراد جمال کو گنگ ہوکر سن رہی تھیں۔ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر دوبارہ بغور مراد جمال کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی سیلاب اپنی پوری جولانی کے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ اٹھیں ان کے پاس آئیں پھر ایک دم ان کے کندھے سے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اپنے غمگسار ہم سفر کے کندھے سے ٹک کر انہوں نے خود کو بوجھل پن سے نجات دلادی مگر کون جانے مراد جمال نے آنکھوں کا بوجھ کاندھوں کو دیا تو شانے کچھ اور جھک گئے۔

☆☆☆

حماد گھر والوں کو مناتا رہا اور وہ راضی ہوکے نہیں دے رہے تھے۔ حماد نے کھانا پینا چھوڑ دیا، وہ آفس سے گھر آتا اور کسی سے بھی بات کیے بنا کمرے میں قید ہوجاتا۔ پورا گھر اسے منا منا کے تھک گیا کہ وہ بات نہ کرے کم از کم کھانا کھانا ہی شروع کردے۔ اس کی چہیتی راحمہ سے یہ سب برداشت نہیں ہوا

بالآخر اس نے امی سے بات کی۔

"بھائی کی شادی کہیں تو ہونی ہے تو ان کی مرضی سے کردیں۔ اس میں کیا برائی ہے؟"

جبکہ امی چاہتی تھیں کہ راحمہ کے فرض سبکدوش ہوکر حماد کی شادی کریں۔ حماد کا سر درو یہ کچھ نہ کھانا پینا دیر گئے لوٹ کر گھر آنا۔ راحمہ کا سب کو قائل کرنا بالآخر رنگ لایا اور امی طوعاً وکرہاً یہ فریضہ انجام دینے کے لیے راضی ہوگئیں۔

☆☆☆

آنکھوں کو خیرہ کردینے کی حد تک وہ حسین دلہن کے روپ میں بیٹھی تھی۔ اماں نے اس کی شادی کی تیاری تو کرہی رکھی تھی لہٰذا فرق اتنا پڑا کہ دولھا بدل گیا۔ پھپو ناراض تھیں لہٰذا شادی میں وہ اکیلی شریک ہوئیں۔ نہایت رسمی انداز میں انہوں نے اماں کو لفافہ دیا بنا کھانا کھائے واپس چلی گئیں نہ اسے دیکھنے آئیں نہ پوچھا۔ خیر اسے کون سا فرق پڑتا تھا؟ اندھی خوشیوں میں اردگرد کا دھیان کم ہی آتا ہے۔

دلہن بنی نوشین پر بہت روپ آیا تھا مگر اس روپ کو سراہنے والی آنکھیں نہ اس کی ماں کے پاس تھیں نہ پھپو نہ بابوجی کے پاس۔ سب مشینی انداز میں اپنے، اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اماں نے اسے شادی سے صرف دو دن قبل مایوں بٹھادیا تھا۔ مایوں بھی ایسا کہ نہ ابٹن لگا نہ کوئی رسم ادا کی گئی نہ ڈھول نہ گانے نہ سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ۔ اس نے خود ہی اپنے ابٹن مل لیا، وہ جانتی تھی ناراضی میں ایسے ہی سلوک روا رکھے جاتے ہیں مگر جب اماں نے مہندی کی رسم کو یہ کہہ کر انکار کیا کہ نہ اس فضول رسم کے لیے ہمارے پاس وقت ہے نہ پیسہ نہ اسلام اس رسم کی اجازت دیتا ہے۔ تب حماد کی ماں، بہنوں نے سر ہلاتے ہوئے بری کا سامان یوں پٹخ کر رکھا گویا وہ بھی پٹاخا چھوڑ کر خوشی کا اظہار کررہی ہوں۔

تب اسے دوسری طرف بھی سرد معاملات کا احساس ہوا۔ سب باتیں یاد کرکے لمحے بھر کو اس کا دل بھر آیا۔

"کیا مائیں ایسی ہوتی ہیں؟" اپنی غلطی کا احساس تو تھا ہی نہیں۔ ماں کے رویے کا نوحہ تھا جو اس کا دکھ لمحوں میں تحلیل بھی ہوگیا جب اسے اس خیال نے چھوا کہ وہ حماد کی بننے جارہی ہے۔ اس سے کیا کوئی بھی...... کچھ بھی کرے۔

☆☆☆

نکاح کے شوروغل کے باوجود اس کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اس نے دور تک نگاہیں دوڑائیں شاید اماں اور بابوجی آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں، جدائی کے خیال سے اسے لپٹا کر دعائیں دے دیں مگر نہیں...... ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اس نے سر جھکالیا۔ برابر میں بیٹھا اس کا محبوب جواب اس کا مجازی خدا بن چکا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا...... یہاں بھی چہرے پر دن کے بارہ بج رہے تھے۔ عجیب بجھا بجھا سا چہرہ ہے بندہ کسی کی شادی میں آتا ہے تب بھی چہرے پر مسکان ہوتی ہے کجا کہ اپنی شادی پر یہ حال۔"

"امی آرسی مصحف کی رسم کرنی ہے۔ آپ اس طرف آجائیں۔" آواز یقیناً حماد کی بہن راحمہ کی تھی۔ اس نے کان لگادیے۔

"دفع کرو۔" بالکل برابر سے حماد کی امی کی آواز سنائی دی۔ "ہزاروں بار ایک دوسرے کو دیکھ چکے، کاہے کا آرسی مصحف؟" دل میں کوئی چیز ٹوٹی۔ اس نے مزید سر جھکادیا۔ اسے لگا گمبھیر سناٹا اس کے اندر تک اتر گیا۔

"چلو معینہ اب رخصت کرو۔" ایک اور آواز سنائی دی۔

"ہاں...... ہاں اٹھو۔" کہہ کر خود ہی محترمہ اٹھ گئیں۔

"ٹھہریں بہن۔" کی آواز پر اٹھنے والی رک گئیں۔ یہ آواز تو وہ لاکھوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی۔ یہ اس کی ماں کی آواز تھی اس کا دل بھر آیا۔

"آخر کو ماں ہیں ناں مجھ پر پیار آہی گیا۔" وہ سوچتی تھی اماں دم رخصت اسے پیار کرنے آئی ہیں۔

"آپ، نوشین اور حماد میاں ذرا ڈرائنگ روم میں چلیں۔"

"ہائیں۔۔ یہ اماں کیا حماقت کررہی ہیں۔" وہ ابھی دل میں سوچ سکی کہ اس کی ساس کی آواز سنائی دی۔

"جی، ڈرائنگ روم میں، وہ کیوں...... بات کیا ہے آخر؟" ایک ہی سانس میں اتنے سوال۔

"یہ میں وہیں جاکر بتاؤں گی۔" ہمیشہ کی طرح اماں کا لہجہ میٹھا ہی تھا۔

"جی اچھا، چلو حماد اٹھو اور انہیں بھی کہو ڈرائنگ روم میں اپنی اماں کی بات سنیں۔ خدا جانے اب کیا تماشا ہو؟" آخری جملہ دبی زبان سے ادا کیا گیا مگر اس طرح کہ وہ اور حماد تو سن ہی لیں۔

اس نے سر اٹھایا معینہ بیگم یہ جا وہ جا۔ اس نے انتہائی ترحم طلب نگاہوں سے حماد کو دیکھا اس نے چوروں کی طرح گردن جھکالی اور قدم آگے کو بڑھائے۔

"حماد۔" سسکی روک کر اس نے شکستگی سے پکارا۔

"آہ...... ہاں۔" جلدی سے حماد نے اسے سہارا دیا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں اماں نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ اماں کے تیور کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ دفعتاً ان کی آواز گونجی۔

"یہ خود پسند کی شادی ہے جس میں ہماری پسند تو درکنار مرضی کو بھی کوئی دخل نہیں۔"

"ہائیں۔" اسے جیسے بچھو ڈنک مار گیا ہو۔ "یہ اماں ہیں؟" وہ کم پڑھی لکھی سادہ لوح اماں تو نہ تھیں۔ وہ تو کوئی طوفان اپنے چھپائے شیرنی لگیں جن کے الفاظ دھماکوں کی صورت اس کی سماعتوں پر برس رہے تھے۔ اسے اماں سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو شروع ہی سے بہت تیز طرار تھی جبکہ پورا خاندان اماں اور بابوجی کو اللہ میاں کی گائے جیسے لقب سے نوازتا تھا یہ کیسی گائے تھی جو اس بری طرح ڈکرا رہی تھی۔ نوشین کو رگوں میں لہو منجمد ہوتا محسوس ہوا۔

"آپ انہیں عمر بھر کے لیے رخصت کرواکر لے جائیں، اب ان کا ہم سے اور ہمارا ان سے ناتا یہیں اور اسی جگہ ختم ہوگیا۔"

"اُف خدایا! ذلت سی ذلت......!" وہ زمین میں نگاہوں کے ساتھ ساتھ گڑی جارہی تھی۔

"یہ ہمارے لیے اور ہم ان کے لیے مر گئے۔" وہ نوشین کی سمت جھکیں۔ "کیوں، تم نے یہی کہا تھا ناں؟ آج کے بعد تمہیں سمجھ آئے گا کہ اپنی لاش کو کاندھا دینا کتنا دشوار ہوتا ہے۔" اماں نے اس بار اس کے کان میں سرگوشی کی تھی وہ جب تک نظریں اٹھاتی وہ ڈرائنگ روم سے جاچکی تھیں۔ بہ مشکل تمام اس نے ترچھی نظروں سے پہلے حماد کو دیکھا اس کا چہرہ بھی ذلت ورسوائی پر دھواں دھواں تھا۔ ایسے ردِعمل کی توقع نہ حماد کو تھی نہ اسے۔ ساس کے چہرے پر طنز، نفرت، حقارت اور اسی جیسے لاکھوں جذبے ایک، ایک کرکے رنگ بدل رہے تھے۔

"چلو۔" ڈپٹ کر انہوں نے سکوت کو توڑا اور خود آگے نکل گئیں۔ نہ قرآن کا سایہ، نہ سکھیوں کے گیت۔

وہ ازخود حماد کا بازو پکڑے دھیرے دھیرے اس کار کی جانب بڑھی جو بجی سجائی اس کی منتظر تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اماں، بابوجی کو تلاش کررہی تھی۔

"کاش...... وہ کہیں سے آجائیں، بانہوں میں بھرلیں اور کہیں آئندہ تجھے معافی نہیں ملے گی اور لپٹالیں۔" مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب بچا بھی کیا تھا

اماں نے اس کی خوشیوں اور خوشیوں بھرے ارمانوں میں چنگاری چھوڑ دی تھی مڑ کے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ جل کر کس طرح خاکستر ہوگئی اور بابو جی...... وہ تو اس پورے عرصے میں کہیں نظر ہی نہیں آئے۔

☆☆☆

اس کو لاؤنج میں بٹھادیا گیا تھا۔ گھر میں آوازوں کا ایک شور برپا تھا۔ اماں کے الوداعی جملوں کی کڑواہٹ ابھی تک حلق میں تازہ تھی۔ اسے بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا تھا۔ گھر میں آوازوں کا شور بھی مدھم پڑ چکا تھا لیکن چلت پھرت باقی تھی۔

''اوہ، بھابی ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔'' راحمہ برابر میں آبیٹھی۔ اسے لگا لق و دق صحرا میں پانی کی ایک بوند اس کا حلق تر کرگئی۔

''امی کھیر والی رسم تو کریں......'' وہ ٹھنکی اور ماں کی جانب بڑھی۔

''ہونہہ کھیر والی رسم...... ابھی ان کی اماں نے ان کے ساتھ ساتھ ہمارے اور حماد کے اعزاز میں جو قصیدہ خوانی کی ہے وہ تمہیں اور تمہاری آپا بیگم کو بھی سنائی ہے میں نے...... یہ چونچلے من پسند بہوؤں کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ بھاگی ہوئیوں کے لیے......'' ساس کے نوکیلے جملے برچھی کی طرح دل کے پار ہوتے رہے...... دھڑام دھڑام کرکے چھت کی ایک، ایک اینٹ اس کے عین دل کے مقام پر گرتی رہی، وہ گھائل ہوتی رہی۔ آنسو کا ایک قطرہ گالوں کو بھگوتا آنچل میں جذب ہوگیا آخر وہ بھی گوشت پوست کا وجود تھی۔ کب سے اور کس، کس کے نوکیلے پتھریلے زخمی کردینے والے جملے سنتی۔

''کیا خود اپنی پسند سے شادی کرنے والی سبھی لڑکیوں کو اس ذلت و رسوائی سے گزرنا پڑتا ہے...... نہیں...... سب کے ردِعمل الگ ہوتے ہیں...... کسی کو معافی بھی مل جاتی ہوگی مگر میری ماں......'' وہ سوچے گئی پھر اسے اپنے ہم سفر کم شریکِ جرم کا زیادہ خیال آیا...... ''وہ کمبخت مجھے یہاں بٹھا کر بھول گیا تھا۔''

''جاؤ انہیں کمرا دکھاؤ حماد کا۔'' حماد پر زور دیا گیا تھا...... یہ آواز اس وقت آئی تھی جب صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ تختہ ہوگئی تھی۔

تبھی اس کی بیوہ نند اس کے پاس آگئیں۔ ''یہ سامنے والا کمرا حماد کا ہے، وہاں چلی جاؤ۔'' وہ تو یہ کہہ کر یہ جاوہ جا...... وہ کچھ دیر اور شرمائی بیٹھی رہتی پھر قدموں کی چاپ پر ذرا سا سر اٹھایا...... راحمہ اس کی جانب آرہی تھی۔

''راحمہ......!'' ساس کی کڑک دار آواز گونجی...... راحمہ اپنی ایڑیوں پر گھوم گئی۔

''جی امی......''

''تم چلو اپنے کمرے میں...... زیادہ ستار ایدھی بننے کی ضرورت نہیں۔'' حماد کی امی کی بات دار آواز کمرے میں گونج رہی تھی راحمہ پلٹ گئی تھی۔

ناچار وہ اٹھی اور بے غیرتی سے من من بھر کے قدم لے کر کمرے میں چلی آئی۔

''یہ کیا......؟'' حماد میاں آرام سے سورہے تھے۔ اس نے کمرا لاک کرکے حماد کو جھنجوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا......؟'' آنکھیں مل کر اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیا ہوا کے بچے......'' لمحے بھر میں تنہائی پاتے ہی وہ اصلیت پر لوٹ آئی تھی۔ آواز گھونٹ کر اس نے کہا اور حماد کے سینے پر مکوں کی بارش کردی۔

''کیا ہوا...... کچھ پتا تو چلے۔'' حماد نے اس کے ہاتھ پکڑ کر پیار سے کہا۔ بس یہ جملہ تھا جو اسے سوکھے صحرا میں ساون لگا۔ وہ حماد کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''کیا ایسا ہوتا ہے نئی دلہن کے ساتھ؟'' وہ روتی جاتی اور سوال کرتی جاتی۔

''دیکھو جان...... میں نے تمہیں پہلے بتادیا

...... حالات بہت برے ہوں گے اور تمہیں ان سے سمجھوتا کرنا ہوگا جس کا تم وعدہ کرچکی ہو۔'' وہ رو گئی اور وہ اسے محبت سے سمجھاتا رہا۔

''جس طرح میں تمہارے گھر میں unwanted ہوں اسی طرح سے تم......'' اس نے بہت پیار سے اس کے بال سنوار کر دلخراش حقیقت سے اسے آگاہ کیا۔

☆☆☆

اگلا دن بھی کوئی بہت خوشگوار دن نہ تھا...... جشنانی دلہن کو خود بنانا تھا لیکن اس کا دولھا بنالایا...... کمرے میں دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا...... حماد کے چہرے پر شادی کی رات سے چھائی مردنی کچھ کم ہوئی تھی۔

''اپنا، پچھا بہت خوب صورتی سے چھپالیا۔'' کچھ دیر پہلے ہونے والی ٹھنڈک کا احساس پھر اسے دہکا گیا...... حماد کی ماں یہ کہہ کر یہ جاوہ جا...... اس نے حماد کو تکا وہ نظریں چرا گیا۔ اس نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیے...... آنسو لڑھک، لڑھک کر گالوں کو تر کرنے لگے۔ حماد نے نوالہ بنا کر خود اسے اپنے ہاتھ سے دیا۔

''جانِ حماد یہ تو ابتدا ہے، اس سے بھی بدتر سلوک ہوں گے، ہمیں تیار رہنا چاہیے۔'' (ہر شوہر کی ذات میں ایک کامیاب سیاستدان بھی چھپا ہوتا ہے) حماد کی دل بستگی نے اسے کچھ سہارا دیا۔

ان چاہی بہو کتنی بھی میاں کی من چاہی ہو بھرے پُرے سسرال میں نخرے نہیں اٹھوا سکتی۔ اگر شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے تو سسرالیوں کے دل جیتنے کا راستہ خود کو مٹی کر کے ان کی خدمت کر کے زندگی گزارنے میں ہے...... پھر وہ تو میکے کو جانے والی تمام کشتیاں جلا آئی تھیں بلکہ یہ فریضہ بھی اس کی ماں نے انجام دیا تھا۔ اس نے کچن سنبھالنا چاہا تو آپا بیگم نے کام ہاتھوں سے لے لیا۔

''تم اپنا اور اپنے میاں کا کرلو یہی بہت ہے......'' اور وہ ہاتھ پونچھتے ہوئے اپنی دو کوڑی کی عزت سنبھالتی ایک طرف کو ہوگئی...... اس کی گز بھر کی زبان بھینچے ہوئے منہ کے اندر تھی، اس نے زبان سی لینے کا تہیہ کیا ہوا تھا ورنہ تو یہاں اتنے مخالفین کی موجودگی میں زبان چلانا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دینا تھا۔ میاں جی کون سے اپنے تھے......؟ وہ تو بس اپنے کمرے تک میں اپنے تھے ورنہ گھر بھر میں امی اور آپا بیگم کا راج تھا جو بقول نوشین سپر پروائیزر تھیں...... اس نے بغور آپا بیگم کو دیکھا چالیس پینتالیس کے پیٹھے میں تھیں۔

''یہ تو بہت بھاری پتھر ہے جو جلد جگہ سے سرکنے والا نہیں۔'' اس نے جل کر سوچا کہ آپا بیگم کے اوپر جانے کے بھی کچھ زیادہ چانسز نہیں۔ ادھر جب رو رو کر اس نے حماد سے شکایت کی تب کچھ دیر وہ اسے خاموشی سے تکتا رہا۔ حسبِ عادت وہ اسے جھنجوڑنے اس کے گریبان تک آگئی۔ پہلی بار حماد نے بہت غصے اور سختی سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے، لمحے بھر کو وہ ٹپٹا گئی بہت غور سے حماد کو دیکھا اس کے ماتھے پر کتنے بل پڑے ہوئے تھے وہ گن نہ پائی۔

''تم نے نہیں کہا تھا جو اور جیسے بھی حالات ہوں گے تم گزارہ کروگی؟'' حماد کی بھنچی سخت آواز اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا گئی۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پارہا تھا تب حماد نے پاس آکر اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا...... وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے حماد کو تک رہی تھی اتنے دن میں آج اسے احساس ہوگیا اس کی شادی ہوچکی ہے اور یہ بدمزگی کا پہلا دن ہے۔

''بولو......'' اب کے اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ اس نے گھبرا کر اثبات میں سر ہلادیا مبادا وہ اور چیخنے اور یہ بے عزتی نہ آواز باہر جا کر اس کے سب دشمنوں کو نہال کردے۔

''پھر......؟ پھر میرے کمرے میں گھستے ہی شکایتوں کے دفتر کیوں کھلنے لگتے ہیں۔'' حماد کی گھن

گرج کے جواب میں وہ اسے ٹکر ٹکر تک رہی تھی اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے...... اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپاک سے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔

پہلے تو حماد اسے حیران نظروں سے تکتا رہا پھر غصے میں کمرے سے نکل گیا اب مزید وہ کس سے اور کیا کہتا؟ دیواروں سے۔

واش بیسن میں پانی کے چھینٹے منہ پر مارتے مارتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

☆☆☆

''ہم لڑکیاں کیوں نہیں سمجھتیں اپنی چاہت پانا ایک لمحے کا کام ہے مگر اس چاہت کے ساتھ unwanted فرد بن کر تنگی کی زندگی گزارنا صدیوں پر محیط دورانیہ ہے۔'' وہ اپنے اور حماد کے لیے کھانا گرم کرتے ہوئے بار بار سوچ رہی تھی۔ گھر والوں کے بائیکاٹ سے حماد بہت ڈسٹرب رہنے لگا تھا۔ گھر والے حماد کی ضد پر اسے دلہن بنا کر لے تو آئے تھے لیکن اب سب کے رویے سرد تھے بلکہ حماد سے بھی مطلب کی بات کی جاتی تھی...... حالانکہ وہ آفس سے آتے ہی امی اور آپا بیگم کے پاس حاضری لگاتا تھا، اس سب کے باوجود گھر والوں نے چپ کا روزہ جاری رکھا ہوا تھا۔ اس گھر میں واحد نند راحمہ تھی جو شروع، شروع میں چھپ کر اس کی دوست بنی تو امی اور آپا بیگم نے طوفان کھڑا کر دیا۔

''خبردار جو تم نے اس سے دوستی کی ہو، انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔''

''تم کو اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔'' امی کے بعد یہ جملہ آپا بیگم کی طرف سے آیا تھا۔ وہ کمرے میں جاتی راحمہ کے بعد آپا بیگم کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔ گز بھر کی لمبی زبان نہ جانے کتنی مختصر ہو کر منہ کے باکس میں بند ہو گئی تھی...... ساری تیزی طراری اڑن چھو ہو گئی تھی۔

''ان کی اماں نے تو خوب پیچھا چھڑا لیا... اپنی بلا ہمارے سر ڈال کر الگ ہو گئیں...... میں کام کرتے اس نے امی کی آواز سنی جواب معمول کا حصہ بن گئی تھی مگر اسے زخم تو دیتی تھی۔ وہ ... کر نہیں سکتی تھی حماد کی نوکری معمولی تھی اتنی مہنگائی میں دو کمرے تو کیا وہ ایک کمرے کی کوٹھری بھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے اپنی ایک، ایک ضد، گستاخی نافرمانی، اماں اور بابو جی کو بے عزتی کے گڑھے میں دھکیلنا یاد آرہا تھا...... مگر اب اس یاد، اس پچھتاوے کا کیا جب بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا۔ خدا کا کرنا حماد کو اچھے پیکج پر جاب مل گئی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب حماد کو اوور ٹائم سے تو نجات ملی۔

اس شام حماد سب سے چھپ کر اس کے لیے پزا لے آیا، وہ بہت خوش خوش کھا رہی تھی۔ تبھی اس نے بتایا کہ اس نے اس نئی جاب کی سیلری کی پوری رقم امی کو دینے کے بجائے کچھ اس کے جیب خرچ کے لیے رکھ دی ہے۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، وہ بہت محبت سے اسے چپ کرواتا رہا، رونے کی وجہ پوچھتا رہا، تب بہت رسان اور معصومیت سے اس نے کہا۔

''میں تو سمجھی تم بھی سب کی طرح مجھ سے بیزار ہو گئے ہو......'' تب حماد ہنس دیا۔

☆☆☆

اور جب اسے ننھی جان کی آمد کی اطلاع ہوئی تب امی اور آپا بیگم کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''کیا نئی جاب کو تم گورنری سمجھنے لگے ہو...... کیا ضرورت تھی ابھی بچے کی......؟'' اس کے آفس سے گھر گھستے ہی امی نے اس کے لتے لے ڈالے۔

''بس...... یہ ایک بچہ ہی بہت کافی ہے، جب تک کوئی بہت اچھی جاب نہ لگ جائے، بچے نہ بڑھنے پائیں۔'' امی اپنی کہے جا رہی تھیں اور وہ

مجرموں کی طرح یوں سر جھکائے کھڑا سن رہا تھا جیسے یہ بچہ...... کسی ناجائز ذریعے سے آرہا ہو...... کمرے کے اندر موجود نوشین کو بھی امی کی کڑک دار آواز نے چور جیسا بنا ڈالا اور حماد کے کمرے میں آتے ہی اس نے خاموش رہنے میں عافیت جانی مبادا وہ کچھ بولے تو حماد باہر کا غصہ اندر نکال دے۔

''کیا پسند کی شادی کرنا اتنا بڑا جرم ہے؟'' دنیا سے تو پوچھنے کی ہمت نہیں تھی، سونے کے لیے لیٹی چھت کو گھورتی نوشین نے اپنے آپ سے ہی پوچھ ڈالا۔

''جب تمہاری اولاد ہو اور وہ یہی سب کچھ کرے جو تم نے کیا تب خود کو میری جگہ رکھ لینا، تمہیں جواب مل جائے گا۔'' نہ جانے کہاں سے قانتہ بیگم آدھمکیں۔

وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کمرے میں کوئی نہ تھا برابر میں حماد بے خبر سو رہا تھا۔ بہت سارے لمحے اس کی آتی جاتی سانسوں کی طرح گزر گئے۔ نہ جانے کیوں آج اسے اماں بے طرح یاد آئیں۔ وہ مٹھی ماتھے پر ٹکا کر رو پڑی۔ سسکیوں نے جب ہچکیوں کا روپ دھارا تو کروٹ بدلتا حماد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''شین۔'' بہت پیار سے اس نے نوشین کو پکارا۔ وہ بدستور روتی رہی۔ وہ اٹھ کر بیڈ کے کراؤن سے ٹک گیا ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا۔

''کیا ہوا شین؟'' بس حماد کا یہ جملہ تھا کہ اسے ایک ہمدرد کا کاندھا نصیب ہو گیا جس پر سر ٹکا کر خوب روئی۔

''حماد کیا بچے کی خبر سن کر میری اماں مجھے معاف کر دیں گی؟'' حماد نے سر ڈال دیا وہ بھلا اس کی ماں کا مزاج آشنا کب تھا کیا جواب دیتا۔

''بولو ناں حماد؟'' وہ پھر سسکی۔

''کر تو دینا چاہیے۔'' وہ اس کے سوا جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔

''حماد تمہارے لہجے میں یقین اور اعتماد کی کمی کیوں نہیں ہے؟''

''اس لیے کہ یہ سکے تو ہم گنوا چکے ہیں۔'' وہ صرف دل میں سوچ سکا۔

☆☆☆

جوں جوں اس کی ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے ایک انجانا ڈر اور خوف اس پر طاری تھا اور پھر جس دن وہ اسپتال جا رہی تھی بے حد پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ آج اسے قدم قدم پر اپنی گستاخی اور من مانی کا صدمہ تھا اس کے بھگتے جانے والے نتائج کا احساس بھی۔ زندگی کا نیا اور پہلا تجربہ ہونے جا رہا تھا مگر اس کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں تھا بس اس کا ہم سفر تھا جس کے چہرے پر پہلے ہی تفکرات نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

''میں ایک آخری کوشش اور کر لیتا ہوں امی کو منانے کی۔'' وہ مرے مرے قدموں سے جاتے رک کر پلٹا۔ نوشین نے صرف ہاں میں سر ہلانے کو ترجیح دی۔

''دیکھو حماد، تم اپنی شادی سے پہلے کیے وعدے پر قائم رہو جب ہم نے یہی شرط رکھی تھی کہ ہم تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے اور اسی شرط پر ہم اس جیسی والدین سے بھاگی لڑکی کو تمہاری بیوی بنا لائے تھے۔ جب یہ فیصلہ تم لوگوں کا ہے تو اس کے ثمرات و نقصانات بھی تم دونوں ہی بھگتو۔'' امی کی آواز نے اس کے دردوں میں اضافہ ہی کیا تھا۔ حماد اس کے پاس آچکا تھا۔ جھک کر اس کا سامان اٹھانے لگا تو اس کے چہرے پر چھائی تھکن اسے بوڑھا دکھانے لگی۔ نوشین کو اپنے بجائے حماد پر ترس آنے لگا۔

☆☆☆

جب نرس نے اسے بیٹی کی خبر سنائی تھی تب وہ بری طرح خوف سے لرز گئی تھی۔

''نہیں نہیں...... لڑکی نہیں ہو سکتی۔'' وہ ہذیانی

انداز میں چیخی تھی۔ ”نہیں...... میں نے خدا سے بیٹے کی دعا کی تھی، نہیں لے جاؤ اسے مجھے بیٹی نہیں چاہیے۔“ اس کے بری طرح چیخنے پر نرس نے بچی کو اپنے ہی بازوؤں میں دبائے رکھا۔ باہر لا کر حماد کو دکھایا تو وہ اس پر نظر پڑتے ہی لمحے بھر کو سب بھول گیا۔

کمرے میں آ کر بھی وہ خوف میں مبتلا رہی۔ اس نے بیٹی کی شکل تک نہ دیکھی۔

”کیا ہو گیا ہے شین، تم ایک نظر دیکھو تو سہی کتنی پیاری ہے ہماری بیٹی۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خزاں کے لرزیدہ پتے کی طرح بس کانپتی رہی۔ وہ کسی کو کیا بتاتی کہ اماں کا ایک جملہ اندھے سائے کی طرح اس کے تعاقب میں ہے۔

”جب تمہارے بیٹی ہو اور وہ یہی سب کرے تب میری جگہ پر خود کو رکھ لینا۔“

☆☆☆

اسے گھر آئے پانچواں دن تھا مگر اس نے ابھی تک نظر بھر کے بیٹی تک کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاں بیٹی کے آنے سے اتنا ہو گیا تھا کہ راحمہ اس کے کمرے میں.. بلا دھڑک آنے جانے لگی تھی۔ بچی کو اٹھا لیتی، کمرے سے لے جاتی یا شاید امی کے پاس بھی لے جانے لگی تھی۔

”شین...... شین......“ حماد خوشی و سرگوشی میں اسے پکار رہا تھا اس نے خفیف سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”پتا ہے، امی قرت کو گود میں لیے پیار کر رہی ہیں۔“

”ہیں!“ وہ اچھل کر مارے خوشی کے بستر پر بیٹھ گئی۔ ”سچ؟“ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”ہاں، ہاں...... میں جھوٹ کیوں بولنے لگا؟“

”یعنی امی کی ناراضی ختم؟“

”کم از کم قرت سے تو۔“

”یعنی ہم سے نہیں؟“ وہ پھر افسردہ ہو گئی۔

”اب...... یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”پھر حماد...... اس کا مطلب ہے اماں بھی مجھے قرت کے صدقے میں معاف کر دیں گی؟“ اس کی سوئی پھر اپنی اماں پر جا اٹکی۔ حماد چپ ہو رہا، وہ بے تاب ہو گئی۔

”ہاں، ہاں حماد...... مجھے یقین ہے۔“

”تو کوشش کر دیکھو۔“ یوں معاملہ سوا مہینے پہ لٹک گیا۔ اس نے چھلے ہی میں نہ صرف حماد بلکہ پورے گھر کا کام سنبھال لیا۔ اسے مزاحمت کا بالکل سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”بھابی، بھابی......“ راحمہ کی آواز میں خوشی نمایاں تھی اس نے گردن موڑی۔

”یہ امی نے پنجیری بنائی ہے آپ کے لیے۔“ اس نے ڈبا اسے پکڑایا۔ ”اور کہا ہے کہ سوا مہینے تک آپ کوئی کام نہیں کریں گی۔“ تو شین کے آنسو چھلک آئے وہ اسی لمحے امی کے کمرے میں گئی۔ اظہارِ تشکر میں کچھ کہنا چاہا تو لگا وہ اپنا ساؤنڈ باکس اپنے ساتھ لانا بھول گئی ہے یا شاید لفظ گونگے ہو گئے ہیں۔ زار و زار رونے بیٹھ گئی۔ آج جب خود صاحب اولاد ہوئی تو احساس جاگا والدین کا دل دکھا کر کون سکھی رہا ہے۔ وہ روتے ہوئے بیٹھ گئی۔ تبھی حماد کی ماں کے مہربان ہاتھوں نے اسے سہارا دے کر اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اسے لگا قانتہ بیگم بڑے سے دوپٹے کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹے وہی کہیں موجود ہیں، اس نے چاروں سمت نظریں دوڑائیں مگر وہاں اماں کی خوشبو تھی، اماں نہ تھیں پھر اس نے گلے لگانے والی ہستی پر نظر کی تو حماد کی ماں۔ وہ بھی تو ماں تھیں ناں اور شاید ماؤں کی خوشبو بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔ بہت ملیح، بہت پاکیزہ......! وہ پھر اُن کے کندھے سے لگ کر رو دی۔

”بس، بس اب چپ ہو جاؤ۔“ وہ اسے چپ ہو گئی مبادا ان کی حکم عدولی پر پھر ناراضی کا پرچہ کٹ جائے گا۔

☆☆☆

راحمہ سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی امی بھی مہربان ہو گئی تھیں اور جو نہ ہوئی تھیں وہ آپا بیگم تھیں۔

سوا مہینہ ہونے پر اماں کی طرف جانے کی اس نے اجازت مانگی۔

”تم چلی تو جاؤ مگر مجھے تمہاری ماں سے ایسی کوئی امید نہیں کہ وہ معاف کر دیں گی۔“ دل میں ہوتے دھک دھکے نے امی کے کہنے پر گویا بلاسٹ ہی کر دیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ سی گئیں۔

”جا کر معافی مانگنے میں کیا حرج ہے؟“ پھڑپھڑاتے لبوں سے اس نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں ضرور۔“ انہوں نے سر ہلا دیا اور وہ جیسے اڑی اڑی چلی گئی۔

☆☆☆

گھر کے دروازے پر غیر معمولی رش اس کا دل بیٹھنے لگا پھر بھی اس نے ننھی قرت کو دبائے دبائے قدم اندر بڑھائے۔ اندر کا منظر اس کا دل دہلا دینے کو کافی تھا۔ سامنے گہوارے میں بابو جی کی میت رکھی تھی اور گہوارے کے پاس قانتہ بیگم پتھر بنی بیٹھی تھیں نہ آنکھ میں آنسو نہ لبوں پر فریاد۔

وہ گہوارے سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کو مدت بعد دیکھ کر رشتے دار اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جن دو آنکھوں میں حیرت اور ناپسندیدگی تھی وہ قانتہ بیگم اور پھپو تھیں۔

ماں تو ماں ہوتی ہے کتنی بھی سنگ دل ہو اولاد کے لیے موم ہو ہی جاتی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے قرت کو ان کی گود میں دے کر ان سے لپٹنا چاہا۔ قانتہ بیگم نے قرت والا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے روک کر پیچھے کیا اور خود اپنا منہ موڑ لیا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”کیا مائیں اتنی پتھر دل ہو سکتی ہیں؟“ بابو جی کی میت پر روتے ہوئے بارہا اس نے سوچا سر اٹھا کر اس نے ماں کو پھر دیکھا۔ انہوں نے بھی نظر اٹھائی تھی صرف ایک بار اس پر ڈالی بھی تھی ان نظروں میں کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

”جو بیٹیاں والدین کو زندہ در گور کر دیں، زندہ دیوار میں چننے کے بعد قطرہ قطرہ سانس لینے پر مجبور کر دیں ان پر ترحم کی نگاہ کیسی؟“ بس وہ پہلی اور آخری نظر تھی جو انہوں نے اس پر ڈالی۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد تک انہوں نے دوسری نگاہ اس پر نہ کی۔

”پھپو آپ مجھے معاف کر دیں اور اماں سے بھی معافی دلوا دیں۔“ ایک کونے میں کھڑی پھپو کو اس نے جا لیا۔

”بھائی جی کی بیماری میں، میں نے بہت کوشش کی کہ تم کو بلا لوں مگر نہ بھائی جی مانے نہ بھابی بیگم۔ دونوں نے کہا مرنے والے بلائے نہیں جاتے وہ ہمارے لیے مر گئی۔“ پھپو آگے بڑھ گئیں، ماضی میں کہے اپنے جملے اسے یاد آ گئے اس نے یہی تو کہا تھا۔ ”مجھے رخصت کر دیں پھر سمجھیے گا میں مر گئی۔“

”میں واقعی مر گئی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی اس کمرے میں جو کبھی اس کا تھا۔ اماں کو جاتے دیکھا تبھی زقند بھر کر اس نے اماں کو جا لیا۔ وہ رو رہی تھی، سسکیاں لیتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اماں مجھے معاف کر دیں۔“ اماں اپنے پیچھے اس کے چلے آنے پر بے خبر تھیں اس کی آواز سے چونکیں تو ضرور مگر لمحے بھر میں اٹھتا ہوا سر وہیں روک لیا اس کی طرف نگاہ نہیں کی۔

”اماں...... کہیں تو میری شادی کرنی تھی ناں...... یہاں ہو گئی تو کیا برا ہو گیا؟“ اس نے اماں کو ہلکا مگر وہاں بدستور خاموشی رقصاں تھی۔

”اماں...... حماد کی امی نے بھی ہمیں معاف کر دیا، آپ بھی معاف کر دیں ناں؟“ اس نے ان سے لپٹ جانا چاہا۔ ان کے بوڑھے ناتواں بازوؤں میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی جو انہوں نے زوردار دھکا دے کر اسے پرے کیا۔ وہ بچی سمیت

گرتے گرتے بچی تھی۔ بڑی غضب ناک آنکھیں تھیں شعلہ جیسے لپک رہا ہو۔

''حماد کی ماں کی عزت نمک تھی میری تیل...... نمک ہتھیلیوں کی اوک سے اٹھ جاتا ہے تیل نہیں...... پھر...... پھر تم نے ہم دونوں کی عزت کا جنازہ نکالا تھا۔ مرے ہوئے لوگ معاف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔'' وہ سانس لینے کو رکی تھیں۔ ''ایک وقت تھا میں تمہارے آگے گڑگڑا رہی تھی، ہاتھ جوڑ کر اپنی اور تمہارے بابوجی کی عزت کے واسطے دے رہی تھی، اس وقت تم خود کو بادشاہ وقت تصور کررہی تھیں اور آج بھکاری بنی میری در پر سر رگڑ رگڑ کر معافی طلب کررہی ہو۔ چلی جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی منحوس صورت مت دکھانا۔'' اماں اسی طنطنے سے نکل کر کمرے سے گئیں کبھی جو طنطنہ اس کا خاصہ تھا۔ تبھی پھپھو دوبارہ کمرے میں آئیں۔ آنسوؤں سے تر چہرہ بہ مشکل اس نے اٹھایا۔

''بھابی بیگم کہہ رہی ہیں اب تم مزید تماشہ مت کرو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔'' اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح پیر گھسیٹ گھسیٹ کر گھر سے نکل گئی۔

☆☆☆

بیڈ پر گھنٹوں وہ روتی رہی جب وہ پژمردہ چہرے سے گھر میں داخل ہوئی تھی تبھی حماد اور اس کی امی نے بھانپ لیا تھا مگر مصلحتاً کچھ بولی نہیں تھیں اور اب وہ رو رہی تھی کاٹ میں لیٹی ننھی قرت بھی بھوک سے بلک رہی تھی۔ تبھی راحمہ اندر آگئی اسے ہلانا چاہا تو اس نے حرکت نہ کی وہ مجبوراً قرت کو لے کر باہر چلی گئی۔

اب اس کا جینا مرنا اس گھر اور گھر والوں سے وابستہ ہوگیا تھا اب وہ زیادہ تر گم صم ہی رہتی تھی۔ حماد بہت دلجوئی کرتا بار بار کہتا بھول جاؤ۔ وہ گہری سانس بھر کر اپنی ہتھیلی پھیلاتی۔

''حماد جیسے ہتھیلی کی لکیریں مٹ نہیں سکتیں اسی طرح ماں باپ بھلائے نہیں جاسکتے۔ باغی جذبات کی برف پگھلے تو ندامت ہی ہاتھ آتی ہے۔'' نہ جانے دل کے کسی گوشے سے آواز ابھری تھی اسے پھر چپ لگ گئی۔

☆☆☆

اس روز وہ راحمہ کو لان کے سوٹ دلوانے بازار لے گئی وہاں اسے اپنی پرانی کالج فرینڈ مل گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ پہلی نظر میں اسے راحمہ اپنے بھائی کے لیے بھاگئی اس نے وہیں کھڑے کھڑے اسے پروپوزل دے دیا وہ اپنی دوست مونا کو گھر دکھانے کے بہانے لے آئی۔ امی بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ مونا بہت قرینے کی تہذیب و رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی اس کا بھائی انگلش فرم میں سوفٹ ویئر انجینئر تھا گھر بھی اچھے علاقے میں تھا، سیلری پیکج بھی خاصا ہینڈسم تھا۔ مونا کے جانے کے بعد اس نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چنتے ہوئے امی سے مونا کے دیے پیغام کے حوالے سے بات کی۔ ٹیبل پر بیٹھی آپا بیگم کا غصہ اُن کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اس نے امی پر نگاہ ڈالی۔ وہ اس کی بات سن کر چپ ہوگئی تھیں جب اس نے دوبارہ اپنی بات دُہرائی تب انہوں نے ان سنی کردی۔ وہ سمجھ گئی امی شاید آپا بیگم کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں لہٰذا وہ خود بھی کھانے بیٹھ گئی۔

اس نے حماد کو آتے ہی مونا کے دیے رشتے کے حوالے سے امی کی رائے حاصل کرنے کی بات کی۔

''آخر کیا برائی ہے مونا کے بھائی میں۔ تعلیم یافتہ ہے، اکلوتا ہے، اچھی جاب ہے اچھی جگہ رہائش ہے اور کیا چاہیے؟'' اندر کمرے سے آتی حماد کی آواز پر اس نے بھی کان لگادیے۔

''یہ پیغام جس ذریعے سے آیا ہے ہمیں اس ذریعے پر اعتراض ہے۔ ہمیں وہ ذریعہ قبول نہیں۔'' گو امی کی آواز مدھم تھی لیکن اسے اپنے کانوں میں پگھلا سیسہ اترتا محسوس ہوا۔

''کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟'' وہ سمجھ گئی تھی بدھو حماد نہیں سمجھ پایا تھا۔

''مطلب...... یہ کہ مونا، نوشین کی دوست ہے اور دوست اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے جیسی نوشین ویسی اس کی دوست۔'' یہ آپا بیگم تھیں جو دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

''اس کا تو مطلب ہے آپ نے ابھی تک نوشین کو دل سے معاف نہیں کیا؟'' حماد نے آپا بیگم کی کڑوی گولی حلق سے بہ مشکل اتاری جو بات نوشین کے دل میں تھی وہ حماد نے پوچھ لی تھی۔

''ہاں، میں نے معاف کردیا صرف قرت کی بدولت۔ قرت میرا خون ہے، میں نہیں چاہتی تھی کہ لاتعلق رہوں تو قرت بگڑ جائے۔ اس کی تربیت میں اپنی نگرانی میں کروں گی۔'' وہ باہر کھڑی دل مسوس رہ گئی کہ امی کی پھر آواز سنائی دی۔

''لیکن شاید معاف کرنے کا تم دونوں نے غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ معاف کردیا ہے لیکن جو کچھ تم دونوں نے کیا ہے وہ ناکردہ نہیں ہوسکتا ہے۔''

''پھر معافی کیا ہوئی؟'' حماد دھیمے لہجے میں اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

''معافی یہ ہوئی کہ میں نے تم دونوں سے دل صاف کرکے بات چیت شروع کردی۔ تم دونوں کا خیال رکھنے لگی بس اس سے اور زیادہ کی تم امید بھی مت رکھنا۔''

''امی بہت سے لوگ محبت کی شادی کرتے ہیں کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے؟''

''سب کے اپنے اپنے تجربے، اپنے اپنے ردِعمل ہوتے ہیں۔'' امی پڑھی لکھی خاتون تھیں بہت رسان مگر مدلل بات کررہی تھیں۔

''جو برابر والی پڑوسن کررہی ہیں کیا ضروری ہے میں بھی وہی کروں۔'' وہ تھوڑا ہنسی تھیں۔ ''اب نوشین کی ماں نے نوشین کو مستقل تھوک دیا مگر میں نے دونوں کو چاٹ لیا تو یہ معاف ہی تو کردیا۔ یہ الگ ردِعمل تو ہے۔'' کافی دیر کمرے میں گمبھیر سناٹے کا راج رہا باہر بیٹھے ہونے کے باوجود اسے اندر کے بوجھل ماحول کا اندازہ تھا۔ کافی دیر بعد امی کی مدھم آواز پھر سنائی دی۔

''بیٹا یہ زندگی ہے، اصل اور حقیقی زندگی۔ کسی چینل پر چلنے والا بیس بائیس قسطوں کا کھیل نہیں جس میں تھوڑی ناراضی اور بعد میں سب اچھا، اچھا ہوجاتا ہے۔ اصل زندگی ڈراموں، اسٹیج افسانوں اور تھیٹر سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہاں دل میں آئی کدورت شیشے پر آئے بال جیسی ہوتی ہے۔ کبھی نہیں نکلتی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی لمحے ضرور آنچ دے جاتی ہے جس کی کسک برسوں دل کے پردوں پر دستک دیتی ہے۔''

امی کی لمبی تمہید نے دل میں خزاں رُت اتاردی۔

☆☆☆

کتنے ہی موسم آئے اور گزر گئے۔ دل کے موسم پر چھائی پت جھڑ ساون میں تو بدل گئی مگر بہار رُت آکے نہ دی۔ دل میں پھر ہوک اٹھی ماں کے سینے سے لگ جانے کی۔ ہاتھ پیروں کو چوم لینے کی۔ ان کی پوریں اپنی آنکھوں سے مل لینے کی اور کچھ نہیں تو ان کے سُبک، ملیح پُرنور چہرے کے دیدار کی تو قدم یکبارگی پھر ماں کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ خفت کے احساس سے بنا کسی کو بتائے۔

☆☆☆

دستک کی آواز پر نکلنے والے اجنبی چہرے نے بتایا کہ یہ گھر فروخت ہوچکا ہے۔ قانتہ بیگم اسے فروخت کرکے کہاں چلی گئیں انہیں نہیں پتا...... زمین ایک بار پھر اس کے پاؤں تلے سے سرک گئی تھی۔

''اماں نے کہاں جانا ہے؟ پھپھو کے علاوہ ان کا ہے ہی کون۔'' کافی دیر اپنے سابقہ گھر کی دیوار تلے کھڑے رہنے کے بعد اس نے سوچا پھر قدم آگے

کو بڑھا دیے۔ حواس تو مختل ہو چکے تھے قدم رکھتی کہیں تھی پڑتے کہیں تھے۔ پھپھو کے گھر جا پہنچی۔ وہاں تالا منہ چڑا رہا تھا۔ زمین نے ایک بار پھر اسے پناہ نہ دی اور سرک لی۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر رو پڑی۔ پڑوسن سے احوال کھلا کہ پھپھو کے بیٹے کا حیدرآباد تبادلہ ہو گیا لہٰذا وہ اپنے ساتھ اپنی بیوہ ممانی (قانتہ) کو بھی لے گیا۔ دیر تک سیڑھیوں پر بیٹھی پاگلوں کی طرح روتی رہی ماں سے ملنے کی جو موہوم امید تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس کی بھولی بھالی ماں اس کے حق میں اس سے کم سفاک نہ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے جس طریقے سے اس سے بدلہ چکایا تھا یہ ان کی انتہا درجے کی ضد کو ظاہر کرتا تھا۔

روتی پیٹتی جب گھر پہنچی تو نئی افتاد اس کے استقبال کو تیار تھی۔ آپا بیگم کے ساتھ ساتھ امی غضب ناک تھیں۔

''تم کہاں گئی تھیں؟'' ابھی وہ حواسوں میں بھی نہ لوٹی تھی کہ امی کی آواز سانپ کی پھنکار لگی۔

''پرانے چھن نہیں چھوڑے جاتے امی......

امی آپ کیا سمجھ رہی ہیں یہ معافی مانگ کر پارسا ہو گئیں۔ یہ آج تک اپنے ماضی میں بھٹک رہی ہیں۔ بہتر ہے انہیں ان کے گھر کی راہ دکھائیں۔'' یہ آپا بیگم تھیں۔ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ اس نے بہتیرا بتانا چاہا مگر وہاں سن کون رہا تھا؟

''تم کس سے پوچھ کر نکلی تھیں اور دن بارہ بجے کی گئی، گئی شام چار بجے لوٹی ہو کس سے ملنے گئی تھیں؟'' آفس سے واپسی پر آپا بیگم نے حماد کو خوب بھر دیا تھا اب وہ گرج رہا تھا۔

وہ رو رو کر بتا رہی تھی کہ وہ اپنی ماں سے ملنے گئی تھی مگر یہاں سن کون رہا تھا؟ اعتبار کون کر رہا تھا۔ وہ جان گئی تھی اعتبار کیا جاتا ہے اعتبار والوں کا، بے اعتباروں کا نہیں۔ نہ یہاں کوئی یقین کرنے کو تیار تھا۔ بالآخر اس نے چپ سادھ لی۔ حماد نے اس سے کئی دن بات نہیں کی۔ گو راحمہ اس سے اشاروں کنایوں میں بات کر رہی تھی اسے بھی کھل کر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ناقابلِ اعتبار تھی لہٰذا قرت اس سے چھین لی گئی کہ قرت ان کا خون تھی اگر وہ اس کی پرورش کرتی رہی تو بیٹی کو بھی اپنی جیسی تربیت دے گی۔

وہ اپنی ہی اولاد، اپنے جگر گوشے کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہی تھی لیکن ضرب تو عزت پر آئی تھی۔ وہ اتنے عرصے بعد بھی اپنا مقام اپنا اعتبار نہیں بنا سکی تھی۔ تف ہے ایسی زندگی پر وہ بیڈ کراؤن سے ٹکی سوچے گئی آج تین دن سے اس نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ وہ لامحدود سوچوں میں گھری سوچے گئی۔

''میں نے خودسری کی کیا قیمت چکائی، سودا پھر بھی چک کے نہ دیا۔'' اس نے اپنی ماں سے ان کی ممتا چھینی تو قدرت نے اس سے اس کی بچی چھڑوا دی۔

''تم ناقابلِ اعتبار ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے بعد ایک بچی ہو جانے کے بعد بھی تم بھٹک جاؤ گی۔'' یہ آپا بیگم کی لگائی آگ تھی جس کے شعلے حماد کے منہ سے برس رہے تھے۔ اس کی چیخیں زمین آسمان ایک کر رہی تھیں تبھی حماد کا ایک زناٹے دار تھپڑ اسے چپ کروا گیا اور تب سے آج تیسرے دن تک اسے چپ لگی تھی۔

اب آنسو تھے یا آہیں، قرت کی جدائی وہ الگ...... جب بھی قرت کی آواز آتی وہ دل مسوس کے رہ جاتی۔ ان سب کے باوجود اسے یقینِ کامل تھا کہ امی اور راحمہ، قرت کی بہت جانفشانی سے دیکھ بھال کر رہی ہوں گی۔ حماد آتا اور امی کے کمرے میں چلا جاتا خدا جانے آپا بیگم نے کیسا بھرا تھا کہ وہ اس کی صفائی سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

''وہ جس کی خاطر سب اس سے ناراض ہو گئے، سب نے قطع تعلق کر لیا وہی آج بیگانہ بنا ہوا تھا۔ وہی اسے دوش دے رہا تھا۔ الزامات کی بوچھاڑ کر رہا تھا دوسروں کے لگائے بہتانوں پر آمنا صدقنا کر رہا تھا۔'' وہ جانماز پر سر پکڑے بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔

''اس زندگی کا کیا فائدہ جو سب سے ناراض گزاری جائے۔ اماں ناراض نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ بابو جی ناراض قبر میں جا سوئے، پھپھو ناراض...... اب تو حماد اور اس کے گھر والے بھی ناراض۔'' روتے روتے ہچکی بندھی تو آواز بھی اونچی ہو گئی۔

''اس زندگی سے تو موت بھلی۔ اے خدا میں تیری دی زندگی تجھے لوٹا رہی ہوں اور تجھ سے معافی بھی طلب کر رہی ہوں کیونکہ میں بہت کم ہمت ہوں اور اس طرح روٹھی دنیا کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔'' وہ جانماز پر گری سسکتی رہی پھر روتے ہوئے اپنی چوڑیاں اتارنے لگی۔

''مجھے زندہ نہیں رہنا، مجھے زندہ نہیں رہنا۔'' وہ بڑبڑاتی جاتی اور اپنی کانچ کی چوڑیاں اتارتی جاتی۔

☆☆☆

''امی بھابی مر جائیں گی...... وہ خودکشی کر رہی ہیں۔'' راحمہ رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ امی جو ذرا تھک کر بستر پر کمر ٹکائے لیٹی تھیں اپنی آنکھوں پر رکھے بازو کو ہٹا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''مر جانے دو اتنی غیرت مند نہیں جو موت کو گلے لگا لے۔'' آپا بیگم نے نخوت سے لقمہ دیا۔

''نہیں آپا بیگم، میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' راحمہ روتے ہوئے امی کو کھینچنے لگی۔

''امی آپ لوگ مجھے بولنے نہیں دیتے نہ میری بات سنتے ہیں۔ اس دن بھابی کو اپنی امی کی بہت یاد آ رہی تھی وہ اپنی امی ہی سے ملنے گئی تھیں۔ صرف اس شرمندگی سے ہم سب سے چھپایا کہ اگر اس بار بھی پہلے کی طرح معافی نہیں ملی تو وہ ہم سب کی نظروں میں گر جائیں گی۔ انہوں نے آنے کے بعد مجھے چپکے سے بتایا تھا کہ ان کی امی پھپھو کے ساتھ حیدرآباد شفٹ ہو گئی ہیں۔ بھابی بہت دل برداشتہ ہیں۔ ہم سب کا رویّہ اوپر سے حماد بھائی کا اعتبار اٹھ جانا، یہ سب انہیں خودکشی پر مجبور کر رہا ہے۔'' راحمہ رو رو کر بے تکان بولے جا رہی تھی۔

''راحمہ میں کہتی ہوں کہ چپ ہو جاؤ۔'' آپا بیگم قدرے غصے سے چیخیں مگر امی نے ایک نظر قرت پر ڈالی اور دوسری روتی ہوئی راحمہ پر پھر ایک دم جھٹکے سے اٹھیں اور تقریباً بھاگتی ہوئی بیٹے کے کمرے میں پہنچیں۔ ان کے پیچھے راحمہ تھی۔

نوشین کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اس کی پشت ان دونوں کی طرف تھی وہ جھکی ہوئی تھی پانی گلاس میں بھر رہی تھی دوسرے ہاتھ کی پھیلی ہوئی ہتھیلی میں کانچ کی چوڑی کا پسا ہوا پاؤڈر تھا۔ راحمہ کی چیخ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ امی اور راحمہ کو دیکھتے ہوئے اس نے وہ پاؤڈر پھانکنا چاہا تھا۔ امی نے زوردار ہاتھ مار کر وہ پاؤڈر گرا دیا۔

''ایک گناہ ماں کی نافرمانی کر کے کیا تو دوسرا گناہ خودکشی جیسی حرام موت سے کرنا چاہتی ہو۔ دنیا تو خراب کر ہی لی ہے اب آخرت بھی برباد کرنا چاہتی ہو۔'' امی بری طرح چیخ رہی تھیں۔

''بے اعتبار ہو کر زندگی جینا بہت دشوار ہوتا ہے۔'' وہ دلاسا دیتی راحمہ سے لپٹ گئی۔ امی اس کے لرزتے کانپتے وجود کو تکتی رہیں۔ ماں تھیں ناں انہیں بھی اس پر رحم آ گیا بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی۔

امی بہت پیار سے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اسے اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کے نوالے کھاتے ہوئے اسے یہ لمس نیا نہیں لگا۔ یہی لمس اس کی ماں کے ہاتھوں کا بھی تھا۔

''جس طرح بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں کیا اسی طرح مائیں بھی سانجھی ہوتی ہیں۔'' سوچتے سوچتے

نہ جانے وہ کس نگر میں پہنچ گئی تھی۔

جب حماد سے شادی کی ضد پر اس نے کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا تب اماں اسے بھوکا دیکھ کر زبردستی اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا رہی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی نوالہ حلق میں پھنس گیا اور وہ میز پر ماتھا ٹیک کر رو پڑی۔

''اماں مجھے معاف کر دو، میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں۔ حیدر آباد تو بہت بڑا گنجان آباد ہے۔ تم انسانوں کے جنگل میں کہاں کھو گئیں اماں۔'' وہ سسک سسک کر روئے گئی حماد کی امی نے اسے دل کا بوجھ اتارنے دیا۔

☆☆☆

حماد کے دوست کی فیملی راحمہ کا رشتہ لے کر آئی۔ لڑکا حماد کے دوست کا بڑا بھائی تھا اور پولیس کے محکمے میں آفیسر تھا۔ جسے راحمہ کے لیے منظور کر لیا گیا۔ وہ راحمہ کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ اس نے شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیکن سوچ کی سوئی بار بار ایک جگہ آ کر اٹک جاتی۔ اس کے لائے رشتے پر اس کے کردار کے حوالے سے جس جرم کو نوشین سے منسوب کر کے انکار کیا گیا تھا کیا وہی جرم حماد سے سرزد نہیں ہوا تھا؟ معاشرے کا یہ وہ دوغلا معیار تھا جس میں ایک جرم کی سزا عورت کو پوری ملتی ہے جبکہ مرد کو اس سزا سے بری کر دیا جاتا ہے۔

دن اتنی تیزی سے گزرے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر بہت گہری دھند نظر آئی۔ جو عکس صاف اور بہت واضح تھا وہ قانتہ بیگم کا تھا۔ جو دھندلاتا نہیں تھا بلکہ آنکھوں کو جھڑی لگا دیتا تھا۔

قرت جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کے اندر کی ضد اور خودسری کے خدوخال بڑے واضح ہو رہے تھے۔ نوشین اس کی خودسریوں پر اندر ہی اندر سہم جاتی اور یہ تمام خودسری حماد اور اس کے ساتھ تھی ورنہ اس کا دادی سے تو بڑا احترام والا رشتہ تھا ہر چھوٹی بڑی بات پر حکم بجالانے والا، فرمانبرداری کا۔

قرت کے میٹرک میں آتے ہی امی اللہ کو پیاری ہو گئیں، اسے لگا جیسے ایک بار پھر اس کا سائبان اپنی جگہ سے ہل گیا اور وہ دھوپ کی زد میں آ گئی۔ آپا بیگم کی کبھی اس سے نہ بنی۔ امی کے مرتے ہی آپا بیگم اوپری منزل میں منتقل ہو گئیں جو راحمہ کی شادی کے بعد سے خالی کروا لیا گیا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود بناتی تھیں انہوں نے نوشین سے احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ حماد آفس سے آنے کے بعد پابندی سے آپا بیگم کے پاس ضرور حاضری لگاتا۔ راحمہ جب جب سسرال آتی تو وہ ساس کا کردار خوب نبھاتی گو کہ وہ بھابی بھی لیکن لین دین میں وہ کبھی پیچھے نہ ہٹی۔

امی کے انتقال کے بعد اس نے قرت کو بڑی نگرانی میں رکھا تھا۔ نہ جانے کب اور کس طرح سورج کی آتشی کرن کون سے روزن سے اندر داخل ہو گئی تھی کہ جاگتی آنکھوں بھی اسے کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی کڑی نگرانی میں بھی ایسا ہو جائے گا۔ کچھ دن سے وہ قرت کے بدلے بدلے لچھن دیکھ رہی تھی، کھوج لگانے پر پتا چلا کہ جس کوچنگ سینٹر میں قرت پڑھتی تھی وہاں باہر کھڑے ہونے والوں میں رضی بھی شامل تھا۔ جس کے ساتھ قرت کا چکر چل رہا تھا، اس چکر کے تانے بانے دورِ جدید کی دھماکا خیز ایجاد موبائل دوستی سے جا ملتے تھے۔

برسوں پہلے کہے اماں کے جملے اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے برسانے کا کام کر رہے تھے۔

''جب تمہاری اولاد تمہارے ساتھ ایسا ہی کچھ کرے تب میری جگہ پر خود کو رکھ لینا۔'' وہ تکیے میں منہ دے کر رو پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے قرت سے بات کی تو قرت خودسری اور ہٹ دھرمی دکھاتے ہوئے شیر ہو جائے گی اور پھر کہانی وہیں سے شروع

ہو جائے گی جہاں مدتوں پہلے نوشین نے چھوڑی تھی۔ آپا بیگم سے تو شیئر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے تو اسے شادی کے بعد سے منہ ہی نہیں لگایا تھا حماد سے دکھڑا رو نہیں سکتی تھی، وہ جانتی تھی مرد کی فطرت، اس نے اسے ہی موردِ الزام ٹھہرانا تھا کہ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ تمہاری تربیت میں ہی کھوٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ دیواروں سے سر ٹیک کر پھر رو دی۔ اب اسے ماں ہی یاد آئیں۔

''اماں تم بہت خوش قسمت تھیں جنہیں دکھ درد بتانے کے لیے بابو جی کا کاندھا تو میسر تھا۔ میں تو اس سہارے سے بھی محروم ہوں۔'' وہ بیڈ پر گری مسلسل رو رہی تھی تبھی کسی مہربان ہاتھ نے اس کے شانے چھوئے وہ چونک کر مڑی۔ سامنے حماد کھڑا تھا وہ تیزی سے آنسو چھپانے کے چکر میں باتھ روم میں بھاگی اور حماد اسے حیرت سے جاتا دیکھ کر کچھ کہنے سے رک گیا۔ جب وہ کافی دیر اندر رہنے کے بعد باہر آئی تب بھی اس کی آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

حماد ایزی ہو کر بیٹھ چکا تھا عادت کے مطابق کئی بار کے پڑھے اخبار کو دوبارہ چاٹ کر اس کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

''میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

''شین۔'' اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ''پہلے یہ بتاؤ کیا بات ہوئی ہے۔ تم کب سے رو رہی ہو اور کیوں؟'' وہ سوال جس کے پوچھے جانے کا ڈر تھا حماد نے پوچھ لیا تھا۔

''حماد...... مجھے اماں بے طرح یاد آ رہی ہیں۔'' گھسا پٹا بہانہ تو تھا ہی اس کے پلو میں سو کھول کے رکھ دیا۔ حماد چپ ہو رہا۔ وہ بھی جانتی تھی اسی لیے یہ بہانہ کیا کچھ دیر کے بعد چائے کے بہانے اٹھ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ خود راحمہ کی طرف چلی گئی اور خوب رو رو کر دل ہلکا کر لیا۔ راحمہ نے اسے تسلی دی، اچھے الفاظ میں سمجھایا کہ پہلے لڑکے سے مل لیں اگر مناسب ہو تو شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ خود پر بیتی کو دہرانے بیٹھی تو راحمہ نے بہت نرمی سے سمجھایا۔

''ارے بھابی، زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ میری مانیں تو آپ لڑکے اور اس کے والدین سے مل لیں۔ اچھا ہو تو بھائی کو بتا دیں ورنہ پھر......''

''پھر کیا؟'' نوشین کی آواز میں اب تک نمی گھلی ہوئی تھی۔

''پھر انکار کر دیں۔'' راحمہ نے سہولت سے کہا۔

''بتایا تو ہے اس کی خودسری۔'' نوشین سسک پڑی۔ ''وہ انکار سننے کو تیار نہیں۔''

''پھر بھابی اللہ کے حضور گڑگڑائیں۔'' راحمہ بھی مضطرب ہو گئی۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے خدا نے دعا کا حکم پہلے دیا ہے جبکہ بندہ اس وقت خدا سے رجوع کرتا ہے جب ہر طرف سے مایوس ہو جائے۔ وہ بھی سر ہلاتی ہوئی اٹھ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن اتوار تھا، قرت کی کالج اور کوچنگ سے چھٹی تھی۔ حماد بھی گھر پر تھا مگر یہ بھی شکر ہے کہ چھٹی والا دن خوب سو کر گزارتا تھا۔ اس نے لہجہ بدل کر بہت پیار سے قرت کو پکارا۔

''میرے پاس کمرے میں آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' کمرے میں آنے کے بعد کچھ دیر اس نے ماں کو نظروں میں تولا۔

''آپ نے بابا سے بات کی؟'' بے حد سفاکی سے قرت نے اسے دیکھ کر الٹا سوال کیا۔

''میرے پاس کوئی گراؤنڈ تو ہو جسے بنا کر میں حماد سے بات کروں۔'' وہ نہایت متحمل تھی۔

''جی پوچھیں۔'' کچھ دیر قرت اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی پھر اسی لہجے میں بولی۔

''وہ لڑکا کون ہے، کس خاندان کا ہے، کیا کرتا

ہے مجھے کچھ پتا تو ہو؟" اس نے بیٹی کے گستاخ لہجے کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

"رضی نام ہے، وہ رضوان۔" شاید وہ گڑبڑائی تھی پھر خود پر قابو پا کر بولی۔ "پڑھتا ہے، خاندان کا مجھے علم نہیں۔"

"پڑھتا ہے۔" نوشین نے زیرِلب دُہرایا۔ "پھر تو جب تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہوگا شادی تو تب ہی کرے گا ناں؟"

"نہیں، وہ چھوٹا موٹا کوئی نہ کوئی کام، بزنس کرتا ہی رہتا ہے۔"

"چھوٹا موٹا؟" نوشین کی آنکھیں پھیلیں۔ "چھوٹے موٹے بزنس، کوئی نہ کوئی کام...... ان سب پر تو شادیاں نہیں ہوتیں۔"

"افوہ۔" وہ جھلائی۔ "ممی آپ یہ سب اس سے مل کر بات کرلیں۔ اس کے پاپا کی بہت بڑی جائداد ہے۔ ہزاروں تو اس کی پاکٹ منی ہے۔ اس کے برانڈڈ کپڑے، شوز، والٹ، کار آپ کچھ بھی دیکھ لیں۔"

"والدین کی دی ہوئی پاکٹ منی پر بیویاں نہیں پلا کرتیں۔" اس کا لہجہ سخت ہوا۔

"ممی فار گاڈ سیک، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں اور رضی دونوں مل کر جاب کریں گے۔ ہم آپ سے مانگنے نہیں آئیں گے۔" قرت کے کہنے پر اسے پھر اپنا ماضی یاد آ گیا۔ دل چاہا چیخیں مار مار کر سب اسے بتا دے مگر کمال ضبط سے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے، رضی سے کہو اپنی فیملی کو بھیجے۔" وہ اٹھنے لگی۔

"اس کی فیملی تیار نہیں۔" قرت کے جملے نے نوشین کو زبردست شاکڈ کیا اس کے اٹھتے قدم زمین نے جکڑ لیے۔

"پھر جب فیملی تیار نہیں تو......؟" اس کی سانس حلق میں پھنس گئی وہ حواس باختہ ہونے لگی۔

اس نے حماد کا انتخاب کیا تھا تو کم از کم حماد برسرِ روزگار تو تھا اور یہ لڑکا رضی...... اُف خدایا......! اس نے سر پکڑا۔ ڈھونڈے سے کوئی خوبی اس میں نظر نہیں آ رہی تھی اس کی بیٹی کس چیز پر فدا ہو گئی تھی۔

"وہ کہتا ہے کہ پوری کوشش کرے گا کہ اس کی فیملی تیار ہو جائے اگر نہیں ہوئی تو ہم از خود شادی کرلیں گے پھر اس کی فیملی ضرور ہمیں قبول کرلے گی کیونکہ وہ ان کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہے۔" کس سہولت سے قرت نے سب کہہ دیا اور وہ سانس روکے سب سنتی رہی۔ اس نے بغور قرت کو دیکھا جس کی سمجھ میں اپنی ماں کی بات نہیں آ رہی تھی اور آ رہی تھی تو اس انجان اجنبی کی۔ خدا جانے اس نے کون سا اسم گھول کر پلایا تھا۔ جو وہ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

"تم رضی کو کہو مجھ سے ملے۔" نوشین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس نے رنگ میں آخری داؤ آزماتے ہوئے کہا۔ قرت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اسے اپنی آواز کی لرزش خود محسوس ہوئی۔

"کہیں یہ کوئی چال تو نہیں؟" قرت حد درجہ گستاخ ہو رہی تھی۔ نوشین نے حیرت سے اسے دیکھا پھر لمحے بھر دیکھنے کے بعد گویا ہوئی۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

"اس لیے کہ پہلے تو آپ رضی کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتی تھیں مگر اب...... اتنی سہولت سے اس سے ملنے کو تیار ہو گئیں۔" نوشین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا۔" اچھا کو بہت کھینچ کر ادا کیا۔ "میں رضی سے بات کرتی ہوں۔" پھر وہ مڑ گئی تھی رکی نہیں تھی اور نوشین سر پکڑے آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں رضی پر ایکسپوز کر دینا ہوگا کہ تمہارے والدین کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوگا۔" جب وہ کوچنگ سے لوٹی تو ماں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس نے سنا۔ سر اٹھا کر حیرت اور کچھ ناگواری سے اس نے ماں کو تکا۔

"مگر کیوں؟" ہتھے سے اکھڑنے کے بجائے خود کو سنبھالا اور تیوری کے بل سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"تا کہ رضی پر بالکل یہ ظاہر نہ ہو کہ تمہاری ضد کے باعث ہم اس رشتے کو کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔" نوشین نے چائے کا سپ لیا۔

"اس سے فرق کیا پڑتا ہے وہ جانتا ہے کہ......"

"بہت فرق پڑتا ہے۔" نوشین نے قرت کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ایسا اس لیے ضروری ہے کہ وہ کبھی زندگی میں تمہیں طعنے دینے نہ بیٹھ جائے۔ تمہیں فالتو اور بے وقعت نہ سمجھے، وہ جان لے کہ تمہارے پیچھے ہم بطور ڈھال موجود ہیں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے۔" کم سنی کی ناقص اندھی عقل تلملا اٹھی۔

"یہ تم قبل از وقت کیسے کہہ سکتی ہو۔" اس نے تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ "جبکہ ابھی تم نے اس کے ساتھ اپنی عملی زندگی شروع بھی نہیں کی ہے۔"

"میں اتنے عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔" قرت کی پیشانی کے بل بہت نمایاں تھے۔

"قرت...... یہ دور جو شادی سے قبل کا ہے یکسر مختلف ہوتا ہے اس دور سے جو شادی کے بعد آتا ہے اور جس کا بہرحال تمہیں کوئی تجربہ نہیں۔ میں چاہوں تو تمہاری شادی کر کے تم سے لاتعلق ہو سکتی ہوں جیسا کہ میری ماں ہو گئی تھیں۔" جو حقیقت وہ برسوں سے چھپائے رہی آج اسے خود ہی آشکار کر دیا قرت کے لیے یہ انکشاف بہت اچانک اور حیران کر دینے والا تھا۔

"آ...... آپ......" وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

نوشین نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"ہاں، میں بھی تمہاری طرح جوانی میں دیوانی ہو گئی تھی۔ بھول گئی تھی ماؤں کو رُلا کے، ستا کے کبھی کوئی شاد نہیں رہ سکتا۔ رب کی بارگاہ میں کتنی معافیاں، کتنی معذرتیں طلب کر کے کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا ہے جس طرح تمہارے جیسی اولاد کی صورت میں، میں پا رہی ہوں۔"

"کک...... کیا آپ کی ماں نے آپ کو معاف نہیں کیا تھا؟" اٹک اٹک کر قرت نے پوچھا۔

"نہیں...... آخری لمحات تک نہیں، وہ کہتی تھیں لڑکی کی عزت تیل کے مانند ہوتی ہے اوک سے کبھی نہیں اٹھتی بہہ جاتی ہے۔"

"مگر بابا دادی وغیرہ تو بہت اچھے لوگ تھے پھر آپ کی امی نے مخالفت کیوں کی؟" قرت کو حیرت ہو رہی تھی اس کی آواز بالکل مدھم ہو چلی تھی۔

"تمہاری دادی اچھی نہیں تھیں کافی عرصے بعد وہ میرے ساتھ بہتر محض اس لیے ہوئی تھیں کہ تم پیدا ہو گئی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ حماد اور نوشین کی کہانی دوبارہ دُہرائی جائے حالانکہ ایسا ہو کے رہا۔" اس نے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر ٹکا کر آخری جملے نہایت نیچی آواز میں کہے تھے۔

"آپا بیگم تو آج تک ناراض ہیں۔" نوشین کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔

"پھر......؟" اس نے بہت غور سے ماں کو تکا مگر نوشین سے مزید بولا نہ گیا تو اٹھنے لگی۔ قرت نے اسے روک لیا۔

"آپ کچھ بتا رہی تھیں۔" بیٹی کے روکے جانے پر مڑ کر اس نے قرت کو دیکھا۔

"رہنے دو، راکھ کو کریدنے سے انگلیوں کی پوریں ہی جل اٹھتی ہیں۔ بس تم رضی کو باور کروا دو کہ تم اس کے لیے کریزی نہیں ہو رہی ہو۔" جاتے جاتے اس نے بہت بے رحمی سے اپنی ناک کو ٹشو سے

رگڑا تھا۔

"اگر وہ مجھے چھوڑ گیا......؟" کچی عمر کی لڑکی ماں پر کھل گئی۔ نوشین کو جھٹکا لگا۔ واقعی وہ تو رضی کے لیے پاگل، دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ اس نے چھپ کر قرت کے سیل فون پر رضی کے بھیجے میسج پڑھ لیے تھے جس کے سبب اسے رضی سے بنا دیکھے ہی نفرت ہو چلی تھی۔

"تب تو یہ اور اچھا ہوگا۔ یہاں یہ بات کھل جائے گی کہ وہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں، وہ کہیں بھی چلا جائے کسی کا بھی ہو جائے اچھا ہی ہے بجائے اس کے کہ بعد میں وہ بے وفا ہو...... بہتر ہے پہلے ہی کھل جائے۔" اس نے قرت کے چہرے پر آتے رنگ دیکھ لیے تھے پھر وہ مزید کمرے میں نہیں رکی۔

☆☆☆

اگلے روز رضی اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کلف لگے کپڑوں کے ساتھ لگتا تھا اس نے گردن کو بھی کلف لگالیا ہے۔ کافی دیر وہ اسے بنا بولے تکتی رہی۔ کچھ ساعتیں گزار لینے کے بعد اس نے رضی کا بغور مشاہدہ کیا وہ اس کے تصور سے کہیں بھیانک تھا۔

ہاتھوں میں مختلف رنگ برنگی ڈوریوں کے ساتھ فیشن کے مختلف پٹے، گلے میں پڑی چین، ہیرو ٹائپ کندھے تک کے بال جس کی اس نے ربر بینڈ لگا کر پونی باندھی ہوئی تھی لمحے بھر کو اسے کراہیت آئی۔

انگلیوں میں پڑی مختلف رنگ کی انگوٹھیاں...... اس کے کچھ نہ بولنے اور محض تکتے رہنے نے رضی کو نفسیاتی طور پر الجھا کر دباؤ میں لے لیا تھا۔ وہ اس کی بے مقصد خاموشی سے الجھنے لگا تھا جس سے نوشین لمحے بھر کو محظوظ ہوئی تھی۔

"یہ انگوٹھیاں کیوں پہنیں ہیں؟" چپ کا قفل توڑا بھی تو کیا پوچھا۔ رضی تو عام سادے سوالات کا منتظر تھا مگر خیر اس نے اپنا کھویا اعتماد بحال کرتے ہوئے ایک اندازِ فاخرانہ سے اپنی انگوٹھیوں کو دیکھا۔

"یہ......" طویل خاموشی کے بعد گلا کھنکھارا۔ "حفاظت کے لیے۔"

"بھلا انگوٹھیاں بھی حفاظت کرتی ہیں؟" اس کے استہزائیہ انداز سے ہنسنے نے رضی کو خجل کر دیا۔

"میں نے بہت سے ایسے لوگ جو ایکسیڈنٹ میں مرے ان کے ہاتھوں میں بھی انگوٹھیاں دیکھی ہیں۔" اس کی گہری مسکراہٹ پر رضی نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

"پورا نام کیا ہے تمہارا؟"

"رضوان مراد۔"

"قرت کو کب سے جانتے ہو؟"

"دو سال سے۔"

"اور دوستی کیسے ہوئی؟"

"یہ بات آپ کو قرت نے نہیں بتائی؟" اب کی اس کے لبوں پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ نوشین نے محسوس کیا کہ اس سے چوک ہوگئی وہ سنبھلی۔

"بتائی تھی، تم سے سننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے کیا پتا قرت نے آپ سے کیا بہانہ گھڑا ہے۔ آپ کو سچ بتایا ہے یا جھوٹ؟ میں آپ کو خواہ مخواہ میں کچھ اور بتا دوں۔" اس کی مسکراہٹ گہری تھی۔ مرد بہر حال مرد ہوتا ہے عمر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ نوشین نے سمجھ لیا کہ وہ ایک شاطرانہ کھلاڑی ہے۔

"تعلیم؟" نوشین حد درجہ مختصر بات کرنا چاہ رہی تھی۔

"بی کام پارٹ ون۔"

"کالج؟"

"پرائیوٹ کر رہا ہوں۔"

"والدین راضی کیوں نہیں ہو رہے؟"

"آپ بھی تو راضی نہیں تھیں۔" نوشین کو محسوس ہوا اب وہ بہت اعتماد سے بول رہا ہے۔

"مگر اب تو راضی ہوں۔" اس نے رضی کو نظروں میں ٹٹولا۔

''وہ بھی ہو جائیں گے۔''
''کب؟''
''فی الحال تو نہیں ہو رہے۔''
''اچھا!'' اس نے گہری سانس اپنے اندر تاری۔ ''تم ابھی پڑھ رہے ہو اور شادی بھی فوراً کرنا چاہتے ہو کماتے بھی کچھ نہیں......''
''جی نہیں۔'' اس نے نوشین کی بات کاٹی۔ ''جی میں چھوٹا موٹا بزنس کرتا ہوں۔''
''چھوٹا موٹا...... مگر زندگی چھوٹے موٹے بزنس سے نہیں گزرتی۔'' رضی نے کچھ دیر نوشین کو تکا پھر گلا کھنکھار کر بولا۔
''تین بیٹیوں کے بعد اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہوں اُن کے بعد اُن کا کاروبار میں......''
''یہ بات ابھی کی کرو کیونکہ ابھی وہ اس رشتے پر راضی نہیں۔ وہ کیوں راضی نہیں، یہ نہیں بتایا تم نے؟'' اس نے ایک دم دوسرا سوال داغا۔
''اصل میں میری امی اپنی بہن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔'' رضی کو جواب دیتے دیتے اتنی دیر تو لگی کہ اس کے لہجے سے جھوٹ کی بو آئی۔
''اوہ۔'' وہ سوچنے لگی۔ ''پھر تو تمہارے والدین قرت کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔'' اسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہو۔
''شادی میرے قبول کرنے پر ہو گی ان کے نہیں۔ ویسے بھی مجھے امید ہے کہ وہ شادی کے بعد ہمیں قبول کر لیں گے، آپ برا نہ سوچیں...... اچھا سوچا کریں تو سب اچھا ہی ہو گا۔'' رضی کے جملے میں چھپا طنز اس سے مخفی نہ رہا۔
''مجھے تیرنا نہیں آتا لیکن گہرے پانیوں میں اچھا، اچھا سوچ کر اتر جاؤں...... کیا واقعی کنارے آ لگوں گی؟ اچھا جو سوچا ہے میں نے۔'' رضی کے جواب میں بہت پُرسکون ہو کر اس نے کہا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ کوشش کے باوجود باہر کھڑی قرت نہیں سن سکی۔

☆☆☆

رضی سے ملنے کے بعد اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے حواس مختل کر بیٹھے گی اسے قطعاً سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ قرت کو کیسے سمجھائے؟ وہ تو حد درجہ گستاخ ہو چلی تھی۔ عزت کی دھجیاں بکھیرنے پر آمادہ تھی وہ اگر رضی کے ساتھ بھاگ بھی جاتی تو یہ کچھ بعید نہیں تھا۔ عشق میں اندھی لڑکیوں کو آگے پیچھے، دائیں بائیں کوئی راستہ کوئی راہداری نظر نہیں آتی اور جو نظر آتا ہے وہ صرف اپنا محبوب خواہ وہ کیسا بھی ہو...... بس انہیں محبوب ہوتا ہے۔ نوشین اس نقطے کو سمجھتی تھی وہ خود بھی اس راہ گزر کی مسافر رہی تھی۔ جس کے دامن میں اب صرف پچھتاوے اور شرمندگی کی پرچھائیاں تھیں۔
وہ مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار تھی رات بھر بالوں کی پونی، ہاتھوں کی انگوٹھیاں خواب میں نظر آتی رہیں۔ جس چیز نے نوشین کی توجہ اپنی جانب کھینچ کر اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا وہ اس کے ہاتھوں میں بندھی گھڑی میں جڑا ڈائمنڈ تھا۔ کپڑے اور جوتے بھی برانڈڈ تھے لیکن اس کے باوجود وہ رضی کے چہرے پر خاندانی وقار ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔
اس نے فون کر کے راحمہ کو بلایا ایک وہی تو اس کی ہمدرد تھی۔ سب کچھ سن کر راحمہ بھی فکرمند ہو گئی پھر دھیرے دھیرے اسے کچھ سمجھانے لگی۔ جاتے وقت اس نے سرگوشی میں نوشین سے کہا۔
''بھائی اپنا رویہ دوستانہ رکھیے گا۔'' نوشین نے خیالوں میں تکتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔

☆☆☆

''ممی آپ نے رضی کے حوالے سے کیا فیصلہ کیا؟'' دوسرے ہی دن وہ پھر کسی تنے ہوئے درخت کے مانند ماں کے روبرو کھڑی تھی۔ نوشین سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''آپ نے بابا سے مشورہ کیا؟''
''مشورہ؟'' دکھ سکھ کہہ کر نوشین نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔
''مشورہ اس بات پر کیا جاتا ہے جس کے اختیار یا رد کرنے کا ہمیں حق حاصل ہو۔''
''تو پھر...... پھر یہ دیر کس لیے؟'' قرت نے زور سے پیر پٹخے تھے۔ ''آپ ہماری شادی کر دیں پھر ہمیں بھول جائیے گا۔'' برسوں پہلے کی نوشین، قرت کے قالب میں بولی تو نوشین کا زناٹے دار تھپڑ قرت کے گال سرخ کر گیا۔ ماں نے اپنا یہ حق جانے کہاں محفوظ کر رکھا تھا جواب استعمال کیا تو قرت کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔
''آج سے برسوں پہلے میری ماں نے بھی میری گستاخی پر مجھے تمہارے بابا کے ساتھ بیاہ کر اپنا تعلق توڑ لیا تھا۔'' نوشین کی رندھی آواز کے انکشاف نے قرت پر گویا منوں برف ڈال کر اسے منجمد کر دیا۔ نوشین کو بیٹی کو سمجھانے کے لیے آج مدتوں بعد اپنی زندگی کے ورق الٹنے پڑے۔
''انہوں نے میری ضد پر مجبور ہو کر میری مرضی کی شادی تو کر دی مگر پھر مجھے اپنی شکل دکھائی نہ ٹھکانا بتایا۔ جذبات کی خودسر آندھی جب تھمی تو چہرے پر گرد و غبار کے سوا کچھ باقی نہ بچا۔ جو لوگ والدین کی عزت کا جنازہ نکال دیتے ہیں پھر انہیں ڈھونڈے سے بھی عزت نہیں ملتی۔ خدمتیں کر کر کے میں سسرال میں آدھی ہو گئی مگر جب کوئی خاص موقع آتا میرے حوالے سے ہمیشہ سوالیہ نشان لگ جاتا۔ یہاں تک کہ جب تک تمہاری دادی زندہ رہیں تمہاری پرورش انہوں نے کی۔ کیوں کی......؟ کیونکہ میں لڑکیوں کی پرورش کر کے انہیں عزت دار بنانے کی اہل نہیں تھی۔ اہل وہ ہوتا ہے جس کے اپنے پاس عزت ہو۔ آپا بیگم آج تک مجھ سے شاکی ہیں۔ راحمہ کو تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔'' نوشین کے آنسو بڑی روانی سے گالوں پر راستہ بنا کر زمین کا پیوند ہو رہے تھے۔ قرت ابھی تک اپنے گال پر ہاتھ رکھے بھونچکی، نوشین کو سن رہی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی زندگی کا یہ گوشہ سدا اس سے چھپا کر رکھا تھا۔
''میری۔ بھولی بھالی ماں مجھ سے کہیں زیادہ ضدی تھی جو مرتے دم تک نہ مجھ سے ملی نہ اس کی ممتا میرے لیے تڑپی مگر میں...... اماں کا فیصلہ، اماں کا ردِعمل دُہرانا نہیں چاہتی، میں تم سے لاتعلق نہیں ہونا چاہتی۔'' نوشین رک گئی۔
دونوں طرف بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی دونوں شاید اپنی اپنی جگہ فریز ہو چکی تھیں۔ قرت میں حرارت پہلے دوڑی لگتا تھا اس کی آواز گہرے پانیوں سے آ رہی ہے جس میں پاتال کی نمی بھی شامل تھی۔
''یعنی آپ میری شادی رضی سے نہیں کریں گی؟'' نئی نسل کے دماغ میں جب عشق کا بھوت سرایت کر جائے تو ان کی سوئی وہیں اٹک جاتی ہے۔
قرت نے شاکی نگاہ سے نوشین کو تکا۔
''یہ میں نے کب کہا۔'' نوشین نے سر ہلایا۔
''میں اپنی ماں کی غلطی ہرگز نہیں دُہراؤں گی۔ شادی کر دوں گی، عزت سے پھر تم سے ملوں گی بھی۔''
قرت کی آنکھیں گیلی ہو گئیں بڑھ کر اس نے چٹ چٹ نوشین کے کئی بوسے لے ڈالے۔
''قرت!'' اس نے بہت نرمی سے اسے پکارا۔
''جی۔'' وہ بھی بہت محبت سے اسے دیکھنے لگی۔
''رضی کی انگلیوں میں پھنسی انگوٹھیاں، گلے کی چین، کان میں چھوٹی سی بالی، عورتوں کی طرح کی پونی...... کیا یہ سب تمہیں بھی پسند ہیں؟'' رسانیت سے اس نے گرم لوہے پر چوٹ ماری۔
''بالی اور چین پر تو میں نے بھی اعتراض کیا تھا۔'' قرت نے نظریں جھکا لیں۔ ''پونی تو آج کل فیشن میں ہے۔'' نوشین نے قرت کے کہنے پر پھر

تاسف سے سر ہلایا۔

☆☆☆

''میں تم سے کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ کم از کم تم مجھے اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ تو دکھاؤ مگر تم مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے ہو۔'' شاید نوشین کی دعائیں رنگ لائی تھیں جو قرت کی آنکھیں کھلنے لگی تھیں۔

''دھیرے دھیرے...... پتا بھی ہے کہ غصہ چہرے کی شکنوں میں اضافہ کرتا ہے اور چہرے کو بدصورت بناتا ہے مگر پھر بھی تم غصے سے باز نہیں آرہی ہو۔'' رضی ڈھیٹ بنا ہنس رہا تھا۔

''دیکھو۔'' قرت نے وارن کرنے کے انداز میں انگلی اٹھائی۔ ''تم مجھے باتوں کے ذریعے چکما نہیں دے سکتے۔''

''پتا ہے مجھے... سب پتا ہے یہ سب تمہاری ماں کی شرارت ہے۔'' رضی کے بے ہنگم قہقہے نے اسے اور تپا دیا۔

''اچھا اگر ہے بھی تو کیا بری بات ہے؟'' قرت دوبدو بولی۔

''دیکھو قرت، اصل میں تمہاری ماں ہماری شادی نہیں ہونے دیں گی وہ چاہتی ہی نہیں کہ......''

''جسٹ شٹ اپ۔'' وہ اونچی آواز میں چلائی۔ ''میں جب تک تم سے مطمئن نہیں ہوں گی شادی نہیں کروں گی۔'' وہ پیر پٹخ کر جانے کو مڑی۔

''میں گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنا جانتا ہوں۔'' رضی کے دھمکی نما جملے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اسے لگا اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے بہ مشکل وہ رضی کی طرف گھومی۔ رضی نے مسکرا کر ماحول کو دوست بنانا چاہا۔

''تو پھر جو ہو سکے وہ کرلو تم مجھے بھی جانتے تو ہو۔'' کہنے کو تو وہ کہہ کر گھر آگئی مگر دیر تک رضی کے جملوں کی بازگشت اسے چونکاتی رہی۔ کچھ دن تک اس کا موڈ آف رہا جسے نوشین نوٹس کرتی رہی مگر کچھ دنوں بعد پھر سب کچھ معمول پر آگیا اور قرت پہلے جیسی ہوگئی۔

☆☆☆

''رضی کے ماموں اس کی شادی میں شریک ہوں گے اور شادی کے کچھ عرصے تک رضی انہی کے گھر رہے گا۔'' نہ جانے کیوں آج نوشین چونکی نہیں تھی اسے یہ سب کچھ برا بھی نہیں لگا تھا۔ بہت تحمل سے اس نے کہنا شروع کیا۔

''تم جمعے کو رضی کو اس کے ماموں کے ساتھ بلالو۔ ہم کچھ معاملات طے کرلیں۔'' قرت کی حیرت اور خوشی سے آنکھیں پھٹ گئیں۔

''سچ۔'' اس نے پھر نوشین کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا مگر پھر ایک دم چونکی۔

''مگر جمعے کو بابا تو ہوں گے نہیں۔'' اسے معلوم تھا کہ حماد ہفتے بھر کے لیے آفس کے کام سے لاہور جارہے تھے۔

''اوہو۔'' نوشین نے لہجے میں شہد کی حلاوت پیدا کی۔

''میں اور راحمہ تو رضی اور اس کے ماموں سے مل لیں پھر جب حماد آجائیں گے تب معاملہ فائنل کردیں گے۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' قرت الجھ کر رہ گئی، اسے یہ سارا معاملہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ''پہلے پھپھو ملیں پھر بابا...... میرا مطلب ہے ایک ساتھ کیوں نہیں؟'' وہ اب تک الجھی ہوئی تھی۔

''بھئی...... سیدھی سی بات ہے حماد ایک ہفتے کا کہہ رہے ہیں لیکن ممکن ہے انہیں زیادہ وقت لگ جائے جبکہ تمہاری پھپھو کو ملنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے لہٰذا میرا خیال ہے کہ ہم ایک ملاقات جمعے کو رکھ لیں۔'' نوشین کے انتہائی پیار سے سمجھانے پر شکوک و وہم کا شکار قرت صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''سنو تم اس جمعے کو اپنے ماموں کے ساتھ ہمارے گھر آجاؤ۔'' قرت کے انگ، انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ رضی اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔

''اور ہاں سنو......'' قرت پوری کی پوری اس کی طرف گھومی۔ ''جب ہمارے گھر آؤ تو یہ انگوٹھیوں کی دکان سجانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ فیروزے کی تو میں ہرگز نہیں اتاروں گا۔'' رضی نے ایک ہاتھ کی انگلی دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پہنی فیروزے کی انگوٹھی پر رکھی۔

''کیوں، اس میں ایسا کیا لعل جڑا ہے؟'' قرت نے تیوری چڑھائی۔

''یہ میرے لیے بہت لکی ہے۔'' رضی نیچی آواز میں بڑبڑایا۔

''پتھر کسی کی قسمت کے فیصلے نہیں کرتے۔'' قرت نے بالکل نوشین کے انداز میں کہا۔ ''تمہیں یہ بھی اتارنی ہوگی بعد میں چاہے مرضی پہن لینا۔'' قرت بہت خوش تھی بے پروائی سے بولی تو رضی ہنس پڑا۔

''جو حکم سرکاری...... آگئی جان کی باری۔'' رضی نے سر جھکا کر ایکٹنگ کی تو قرت چونک پڑی۔

''کیا...... کیا کیا؟ یہ سب کیا اول فول بک رہے ہو۔'' رضی کے بلند ہوتے قہقہوں پر وہ اسے شاکی نظروں سے تکنے لگی۔

☆☆☆

حماد کو گئے آج دوسرا دن تھا۔ آج رضی نے اپنے ماموں کے ساتھ آنا تھا۔ راحمہ صبح ہی سے آگئی تھی اور نوشین کے ساتھ چائے اور دیگر لوازمات کے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔

سب کاموں سے فراغت پاکر وہ لوگ رضی کا انتظار کرنے لگے۔ پانچ بجتے ہی نہ جانے کیوں قرت کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ رضی سے اکثر ہی ملاقات رہتی تھی، فون پر تو روزانہ نوشین سے چھپ کر باتیں ہوتی تھیں۔ نوشین کی گہری نگاہوں نے جب سے اس کا محاصرہ کیا تھا تب فون اور میسجنگ کسی حد تک دشوار ہوگئی تھی لیکن پھر بھی تعطل نہیں آیا تھا مگر آج تو دل عجب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ پانچ سے چھ بج گئے تو اس کے ساتھ ساتھ سب کی پریشانی دیدنی تھی۔ تبھی ان کے علاقے میں زبردست فائرنگ شروع ہوگئی اور وقتی طور پر سب کا دھیان بٹ گیا مگر جب ساڑھے سات بجے تو نوشین اور راحمہ کو بھی تشویش ہوئی انہوں نے قرت سے رضی کو فون کرنے کو کہا مگر وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ خود کئی بار کوشش کرچکی ہے پھر اس نے بظاہر انہیں دکھانے کے لیے فون کیا اور پژمردگی سے بتایا کہ دوسری طرف سیل بند جارہا ہے۔ نوشین کے چہرے پر... فکرمندی کے بہت گہرے آثار تھے۔

شام سے رات اور رات بھی گہری ہوگئی تو راحمہ کے جانے کے بعد نوشین نے گہری سانس بھری۔

''مجھے تو وہ پہلے ہی فراڈ لگا تھا۔'' نوشین کا یہ کہنا تھا کہ قرت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''وہ فراڈ نہیں ہے۔'' وہ پورا زور لگا کر چیخی تو نوشین نے اپنی پامال ہوتی عزت بچا کر اسے دیکھا اور خاموش رہنے میں عافیت جانی۔

''وہ ایسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھتی ہیں۔'' خود بہ خود قرت کی آواز دھیمی ہوکر لہجہ شکستہ ہوگیا۔ ''ضرور کوئی بات ہوگئی ہے جو اس کا سیل فون مستقل آف ہے۔'' نوشین نے بہت ترحم کی نگاہ اس پر ڈالی اور بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

وہ بظاہر بستر پر لیٹ گئی تھی مگر اس کا دل و دماغ رضی کے اردگرد بھٹک رہا تھا۔ اس نے خود پر چادر ڈال کر چہرے کو ڈھانپ بھی دیا تھا اور آنکھیں بھی موند لی تھیں لیکن ان بند آنکھوں سے بھی وہ بہت صاف بہت نمایاں رضی کو دیکھ رہی تھی جو نہ جانے

کہاں چھپ گیا تھا۔ اگر اسے نہیں بھی آنا تھا تو فون کر کے ضرور بتانا چاہیے تھا اسی ادھیڑ بن میں اس نے پھر رضی کو فون ملا۔

"The number you have dialed is powerd off please try later!"

بار بار ایک ہی بازگشت، دل چاہا سیل دیوار سے دے مارے۔ ماتھے پر کئے برساتی وہ پھر لیٹ گئی پوری رات آنکھوں میں کٹی نہ چاہتے ہوئے بھی نوشین کے کہے جملوں پر اسے کان دھرنا پڑا۔

''جو تمہارا نہیں وہ پھر کہیں بھی چلا جائے کسی کا بھی ہو جائے اچھا ہی ہے' بے وفا کے ملنے سے نہ ملنا بہتر۔'' وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی۔ دل جیسا ضدی اور پاگل وجود اسے ہرجائی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار رہی تھی اتنی آسانی سے کیسے بدول ہو جاتی۔

☆☆☆

وہ ہمیشہ صبح سویرے ناشتا کرنے کی عادی تھی۔ حماد ابھی تک کراچی سے واپس نہیں لوٹا تھا سو ناشتے کی میز پر اخبار اس کے حصے میں آیا ورنہ حماد ناشتے کے ساتھ ہی اخبار پڑھتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ناشتا کرتی اور ساتھ میں اخبار پڑھتی جاتی۔ قرت رات بھر جاگی تھی اسے بھوک ستا رہی تھی اس نے کالج سے آف کیا اور اپنے اور ماں کے لیے چائے لانے چلی گئی جبکہ وہ ناشتا کرنے کے ساتھ اخبار پڑھتی جا رہی تھی۔ ایک خبر نے لحظہ بھر کو اسے جما دیا تھا۔ قرت ماں کو بے حرکت دیکھ کر قریب آئی۔

''ممی...... ممی......'' قرت نے کئی آوازیں دے ڈالیں۔ کپ ٹیبل پر رکھے۔

''ایسا اس میں کیا ہے؟'' اس نے ماں کے ہاتھ سے اخبار لے کے پڑھنا شروع کیا تو وہ بھی شاکڈ رہ گئی۔ قریبی کرسی پر گرتے گرتے بھی اس نے اس خبر کو کئی بار پڑھ ڈالا۔ جس میں پولیس کو مختلف وارداتوں میں مطلوب ڈکیت سرغنہ رضوان اللہ عرف رضی اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ انہی کے علاقے سے شام چھ بجے ایک مخبری پر پہلے سے مورچہ بند پولیس کے جوانوں سے مقابلے کے بعد گرفتار ہوا تھا۔ اس پر ڈکیتی اور لوٹ مار کی کئی وارداتوں کا الزام عائد تھا۔

خبر پڑھتے پڑھتے قرت کی نظر دھندلا گئی۔ کئی ساعتیں دبے پاؤں گزر گئیں مگر اسے لگا وہ ساعتیں بہت سے طوفان کے ہمراہ بہت زور شور سے اس کے کان کے پردے پھاڑے ڈال رہی ہیں۔ تبھی نوشین اٹھی اور اس نے روتے ہوئے قرت کو لپٹا لیا۔ وہ گنگ ضرور تھی لیکن ماں کے لپٹانے پر ضبط کے بندھن توڑ بیٹھی۔ دونوں ماں بیٹی کے آنسو تواتر سے گالوں پر پھسل رہے تھے۔

نوشین، قرت کے سر پر اپنا چہرہ ٹکائے سوچ رہی تھی۔ خدا کے ہر کام میں اس کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ راحمہ کے لیے آئے اس کی دوست کے رشتے کو ری جیکٹ کر کے حماد کے دوست کے چھوٹے بھائی کے رشتے کو منظور کرنے میں شاید یہی حکمت پوشیدہ تھی کہ رضی کے کرمنل ریکارڈ کا پتا اور اس کی مخبری پر رضی کی گرفتاری کا ممکن ہونا راحمہ کے شوہر کا مرہونِ منت تھا۔

اس نے اپنے مصنوعی اور مگرمچھ کے آنسوؤں کو گرنے سے قطعاً نہ روکا۔ اسے لگا فضا میں موجود بہت سی دھند چھٹ چکی ہے اور مطلع صاف شفاف ہو چکا ہو۔ اس نے بہت گہری آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اور ایک قطعی مصنوعی سسکی لے کر بیٹی کو اس کے ساتھ کی جانے والی ہمدردی کا تاثر دیا۔

نزہت اصغر



مایہ ناز مصنفہ عطیہ عمر سے پُراثر گفتگو

عزیز قارئین پاکیزہ! ہم آپ کے لیے آج ایک اور ہردلعزیز رائٹر کا انٹرویو لیے اس بزم میں حاضر ہیں۔ عطیہ عمر صاحبہ کے انٹرویو کی فرمائش عرصے سے چلی آ رہی تھی...... مگر کچھ ہماری طرف سے تاخیر اور کچھ عطیہ صاحبہ کی طبیعت کی ناسازی آڑے آتی رہی۔ بہرحال بفضلِ خدا آج وہ ہماری اس بزم میں موجود ہیں۔ ہماری دعائیں سدا اُن کے ساتھ رہیں گی۔ تو چلیں قارئین ایک اصلاح پسند اور اصولی رائٹر سے پُرسوچ گفتگو آپ کی نذر......

پاکیزہ ✧...... سب سے پہلے تو آپ کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور ساتھ شکریہ بھی کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات ہماری نذر کیے۔ آپ کو اس بزم میں آنا کیسا لگ رہا ہے؟

عطیہ عمر ✧...... جزاک اللہ، اللہ کا شکر ہے کہ اب ٹھیک ہوں اور شکریہ تو میں ادا کرتی ہوں، تمام قارئین بہنوں کا، نزہت آپ کا، انجم انصار صاحبہ اور محترمہ عذرا رسول صاحبہ کا کہ جن کی حوصلہ افزائی اور قدر افزائی کے باعث میری تحریریں آپ تک پہنچتی ہیں۔ آپ سب کے ساتھ، اس بزم میں آنا میرے لیے باعث عزت ہے۔ حالانکہ ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں کہ میں کوئی ایسی اہم ہستی نہیں جس کا انٹرویو کیا جائے لیکن محترمہ نزہت اصغر کے خلوص اور محبت کے سامنے خواہ مخواہ کے نخرے کرنا بھی اچھا نہیں لگتا سرِ تسلیم خم ہے......

پاکیزہ ✧...... اچھا اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں کچھ بتائیے؟

عطیہ عمر ✧...... عام گھریلو مصروفیات کے علاوہ آج کل صرف مطالعہ کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... قلم اور کاغذ سے آپ کا کب ناتا جڑا؟ میں رائٹنگ کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں؟

عطیہ عمر ✧...... اسکول کے زمانے سے بچوں کے صفحے (روزنامہ نوائے وقت، جنگ) نونہال، تعلیم و تربیت میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں آنے لگی تھیں۔ خواتین، طلبا کے صفحات کے لیے بھی چند ایک مضامین لکھے۔ 1999ء میں پہلی بار میرے افسانے ''پاکیزہ'' اور ''دیگر رسائل''

میں شائع ہوئے۔

پاکیزہ ✧......آپ کے ذہن میں کیا تھا کہ کس طرح کے افسانے لکھیں گی؟

عطیہ عمر ✧......جب میں کالج میں تھی تو (نانا جان مرحوم کی لائبریری سے لے کر) ادبی دنیا، فنون، مخزن وغیرہ پڑھتے ہوئے، اس طرح کا لکھنے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد عمر فاروق کے کزن کی بیگم (مسز بریگیڈیئر امیر محمد خان) کے ہاں میں نے خواتین کے لیے شائع ہونے والے کئی ایک ڈائجسٹ پڑھے۔ ایک افسانہ جس میں ہیروئن بے شمار مصیبتیں جھیل کر آخرکار شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے۔ گویا اب سکھ چین کا دور شروع......تو مجھے خیال آیا کہ بے شک شادی ایک خوشی کا موقع ضرور ہے لیکن یہ ایک شادی شدہ جوڑے کے لیے نئی زندگی کا آغاز ہے۔ جس میں صرف خوشی، رومانس نہیں بلکہ اس سب کے ساتھ ساتھ بہت سی ذمّے داریوں کا شانوں پر آپڑنا بھی ہے......پھر مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ مذہب کو صرف عبادات تک محدود کر کے عام معاشرتی رویوں اور خصوصاً خواتین کے افسانوں میں اس کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس یہی سوچ تھی۔ جس کے تحت میں نے ڈائجسٹ میں لکھنے کا سوچا۔

پاکیزہ ✧......پہلی تحریر کی کامیابی پر کیا تاثرات تھے؟

عطیہ عمر ✧......کئی سال بعد کسی تحریر پر اپنا نام لکھا دیکھ کر بہت اچھا لگا تھا......اور جہاں تک کامیابی کا تعلق ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کیونکہ میں نے افسانہ، ناول لکھتے ہوئے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ بہت معروف، پسندیدہ لکھاری سمجھی جاؤں، میری کسی تحریر سے کسی بھی لڑکی، خاتون نے اچھا پیغام لیا، اس پر عمل کیا تو یہ میری کامیابی ہوگی۔

ویسے پہلی تحریر (افسانہ) شائع ہونے کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک روز یونہی باتوں باتوں میں عمر کہنے لگے۔ ''شادی سے پہلے مجھے لگتا ہے، اپنے نانا سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرواتی تھیں۔ ابھی لکھو، تو مانوں گا۔'' بس جی، اس شوق میں کہ ''میاں صاحب'' سے منوایا جائے... فی الفور دو افسانے لکھ ڈالے۔ جو ''صاحب بہادر'' نے پڑھے، بنفس نفیس خواتین اور پاکیزہ کے آفس میں مسودہ لے کر گئے۔ شائع ہونے کے بعد مجھ سے پہلے پڑھے اور یہ میری پہلی اور تا حال آخری تحریریں تھیں جو ''عمر'' نے پڑھیں۔ اور ان پر ''نگاہِ کرم'' کی وجہ یہ تھی کہ دیکھنا چاہتے تھے، ایڈیٹر صاحبہ نے کس قدر کانٹ چھانٹ کی اور جب ان شائع شدہ تحریروں میں کسی قسم کی قطع و برید نہ دیکھی تو فرمایا۔ ''کافی مروت ہے ان لوگوں میں۔''

پاکیزہ ✧......کچھ نوجوانی اور کالج کے دور کو یاد کیجیے کہ کیا سوچتی تھیں؟

عطیہ عمر ✧......کم سے کم ماسٹرز بلکہ پی ایچ ڈی سے پہلے میں اپنا تعلیمی سلسلہ رکتا نہ دیکھتی تھی مگر...... اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ گریجویشن کے بعد والدین اپنی ذمّے داری نبھاتے ہوئے سسرال روانہ کردیں۔

پاکیزہ ✧......تعلیم انسان میں کیا تبدیلیاں لاتی ہے اور لاسکتی ہے؟

عطیہ عمر ✧......میں سمجھتی ہوں کہ ''تعلیم'' اگر ''حق'' کے ''علم'' کی ہو تو انسان کو ''احترامِ آدمیت'' سکھاتی ہے اور سب سے پہلے خالق اور مخلوق کا تعلق سمجھاتی ہے۔ شافعِ محشرؐ پر نازل ہونے والی پہلی وحی کا پہلا لفظ ''اقراء'' یعنی ''پڑھ'' تھا، پڑھ اپنے رب کے نام سے، جس نے (انسان کو) پیدا کیا۔ گویا واضح کر دیا گیا کہ انسان کی تعلیم ''رب کے نام'' سے شروع ہونی چاہیے۔ بہت معذرت کے ساتھ، جب ''علم'' فقط ''حصولِ زر'' کے لیے حاصل کیا جائے تو زرِ خالص (خالص سونے) کے محل ضرور تعمیر ہو جاتے ہیں مگر ''خیر'' ان محلات سے دور چلی جاتی ہے......میری ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا اور ضروریاتِ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں، پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے لے کر آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور دیگر بزرگان دین و ملت کی زندگیاں گواہ ہیں کہ اسلام رہبانیت کا درس ہرگز نہیں دیتا۔ ضروریاتِ زندگی کے لیے پیسہ یقیناً اہم ہے مگر دل کے سکون اور ضمیر کے اطمینان کے لیے ناگزیر ہرگز نہیں ہے۔ کیا خوب کہا حکیم الامت اقبالؒ نے

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں، اپنا سراغ

پاکیزہ ✧......آج کی نوجوان نسل کو دیکھ کر کیا محسوس کرتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧......(نوجوان کے نام)

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
(اقبال)

آج کی نوجوان نسل کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے (سب نہیں) کاش ''باغباں'' نے ان ننھے پودوں کی کاٹ چھانٹ، گوڈی دلجمعی سے کی ہوتی، آبیاری وقت پر کی ہوتی تو یہ پودے... چمن دنیا کی جان ہوتے......مگر باغباں (والدین، اساتذہ) نے جب اپنی ذمّے داریاں کمپیوٹر کو سونپ دیں تو ''علم'' تو آگیا ''عرفان'' دور چلا گیا یعنی آگہی و شعور، تحمل، تدبر، رواداری اور شکر جیسے اوصاف من حیث القوم زوال پزیر ہیں تو پھر نوجوانوں سے کیا گلہ؟ کہ اس عمر میں ویسے ہی جذبات کا غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی میری تمام تر امیدیں اور نیک تمنائیں نوجوان نسل سے وابستہ ہیں۔ انہی سے ملک و قوم کا مستقبل روشن ہوگا، انشاء اللہ۔

پاکیزہ ✧......کیا جنریشن گیپ کو دوستی کے ذریعے پُر کیا جاسکتا ہے؟

عطیہ عمر ✧......جی ہاں۔

پاکیزہ ✧......گھر میں آپ کیسی رہتی ہیں...... مطلب آپ کی تحریروں میں حد درجہ شخصیت سازی اور فکر سازی پر زور ہوتا ہے کیا عملی طور پر بھی اس کا مظاہرہ کرتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧......اگر آپ کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں خود کس حد تک ''باعمل مسلمان'' ہوں تو عرض یہ ہے

چوں می گویم کہ مسلمانم، بلرزم!
کہ دانم مشکلات لا الہ را!
اقبال

(ترجمہ: جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں کیونکہ لا الہ الا اللہ (کے کلمے کے اقرار کے بعد کی مشکلات سے واقف ہوں) میں بھی سوچتی ہوں، زبان سے کتنا بڑا دعویٰ کرتی ہوں اور عمل...... یہ سوچ لرزنے، کانپنے کے لیے بہت ہوتی ہے۔ مکروہات اور ترغیباتِ دنیا میں گھری لتھڑی، میری بے مایہ ہستی اور اس خالقِ کون و مکاں سے یہ وعدہ......؟ اور ساتھ اس کے محبوب کو خاتم الانبیا ماننے کا اقرار۔ ان کے امتی ہونے کا فخر......تو پھر اقبال کی زبان میں یہی کہتی ہوں

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر
روزِ محشر، عذر ہائے من پزیر!
در حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیؐ پنہاں بگیر
اقبالؒ

ترجمہ: (اے رب ذوالجلال تو دو جہانوں سے غنی ہے۔ روزِ قیامت میرے نامۂ اعمال سے درگزر کرتے ہوئے میری التجا قبول فرمانا اور مجھے محض

اپنے فضل سے بخش دینا اگر میرا نامۂ اعمال دیکھنا ناگزیر ہو تو یہ کرم کرنا کہ میرے مصطفیٰؐ کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا)

ویسے میرے بچے تو ہیں نہیں کہ ان کی فکر و کردار کی تعمیر پر توجہ دیتی مگر موقع ملنے پر اپنے بہن، بھائیوں کے بچوں اور کبھی کبھی عمر کے بہن بھائیوں کے بچوں کو ہلکی پھلکی نصیحت کر دیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آج پاکستان کے حالات دیکھ کر نوجوان نسل کا مستقبل کیسا محسوس کرتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... اس سوال کا جواب تقریباً دے چکی ہوں۔ انشاء اللہ نوجوان نسل کا مستقبل تابناک دیکھنا چاہتی ہوں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پاکیزہ ✧...... کیا بزرگوں اور نوجوانوں کی افکار اور مشاغل ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو ہم بچوں اور نوجوانوں کو اپنے جیسا بننے کی تلقین کیوں کرتے رہتے ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... بزرگوں اور نوجوانوں کے فکر و مشاغل ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ شاید اس لیے کہ جو ہم نہیں کر سکے اس کی امید نئی نسل سے کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کیا ترجیحات ہونی چاہئیں؟

عطیہ عمر ✧...... کامیابی کا مفہوم، ہر شخص کے نزدیک جدا ہے۔ اس لیے ترجیحات بھی الگ، الگ ہوں گی۔ پیسہ، شہرت، پُرآسائش زندگی، اگر ''کامیاب زندگی'' کی کسوٹی ہو تو وہ اسی حساب سے اپنی ترجیحات طے کرے گا...... اور اگر اخروی زندگی میں کامیابی مقصود ہو تو پھر اس دنیا میں بھی کامیاب زندگی کی ترجیحات الگ ہوں گی۔ لیکن جو بھی مراد ہو ''کامیابی'' کے لیے ہدف کے تعین کے بعد خلوصِ نیت، محنت اور لگن کو ترجیح دینی چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... کیا مادیت کی خواہش خالصتاً نفسانی خواہش ہے یا انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہے؟

عطیہ عمر ✧...... انسان ایک ذی روح ہے اور وہ بھی اشرف المخلوقات۔ اس لیے جب ہر جان دار کو اپنی زندگی کی بقا کے لیے پانی، ہوا اور دیگر خوراک کی ضرورت ہے تو انسان ان ضروریات سے مبرّا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب یوں دینا چاہوں گی کہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اقدار کے دائرے میں رہ کر جو خواہش پوری کی جائے اور اس خواہش کی تکمیل میں دوسرے کی آرزو کا خون نہ ہو، وہ ''نفسانی'' نہیں...... بلکہ انسانی ضرورت ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی زندگی کی اولین ترین آرزو...... حسرت؟

عطیہ عمر ✧...... اللہ کا شکر ہے اس نے بہت نوازا۔

پاکیزہ ✧...... کیا بچپن کی باتیں، واقعات، سہیلیاں آج بھی اداس کر دیتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... بچپن تو ہر انسان کا سنہرا دور ہوتا ہے اور وہ عزیز ہستیاں جو بچھڑ گئیں، بہت یاد آتی ہیں۔ اداس بھی کرتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... میاں بیوی کے درمیان خوشگوار رشتے کی نوعیت کے بارے میں تین جملوں میں اپنے خیالات بتائیں؟

عطیہ عمر ✧...... 1- وفا کی سرزمین پر اعتماد کے بیج سے اگنے والا محبت کا شجرِ سایہ دار۔

2- ایک انتہائی نازک، نفیس بلوریں گلدان، جس میں میاں، بیوی کی ایک دوسرے سے بے جا توقعات اور خواہشات' نااتفاقی کی دراڑیں ڈال دیتی ہیں اور وہ کرچی کرچی بھی ہو سکتا ہے۔

3- معاشرے کی تشکیل کی بنیادی اکائی۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... شادی سے پہلے محبت، انڈر

اسٹینڈنگ، باہمی رضامندی پھر شادی...... یہ عمل درست ہے یا مکمل ارینج میرج؟ ہمارا مذہب بھی اجازت دیتا ہے کہ لڑکی سے ضرور پوچھو۔ انکار کر دے تو زبردستی نہیں کرو مگر عملی طور پر ایسا ہوتا نہیں...... آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

عطیہ عمر ✧...... اس سوال کا جواب قدرے تفصیل سے دوں گی۔ حضرت آدمؑ نے اللہ رب العزت سے اپنی تنہائی کے ساتھی کی خواہش کی تو حضرت حواؑ کی پیدائش ہوئی اور پھر زمین پر آنے کے بعد اولادِ آدمؑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ قابیل نے اللہ کے حکم سے اپنے والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے اپنی خواہش اور پسند کی تکمیل چاہی اور جب اللہ عزوجل نے اس کی قربانی قبول نہ کی تو اس نے حسد کا شکار ہو کر شیطان کے بہکاوے میں آ کر ہابیل کو قتل کر دیا۔ شیطان کے بچھائے دام میں آ کر آج تک اولادِ آدمؑ میں سے بہت سے اپنی خواہش اور تمنا کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتے۔ چاہے وہ پسند کی شادی ہو یا دیگر معاملاتِ زندگی۔

اس وقت بات پسند کی شادی کی ہو رہی ہے۔ آج کل زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ اسلام پسند کی شادی کی اجازت دیتا ہے، بجا...... لیکن اسلام میں پسند کا یہ مطلب نہیں کہ شادی سے پہلے نوجوان لڑکی، لڑکا تفریح گاہوں، ریستورانوں کی خاک چھانیں، رات رات بھر گپیں لگائیں۔ سورۂ نور اور سورۂ احزاب اور چند دیگر مقامات پر قرآن کریم میں اور پھر عہدِ نبویؐ، عہدِ صحابہؓ میں عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت ہی کی گئی ہے۔

سورۂ شوریٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کو کہا گیا، اللہ کے رسول نے فرمایا جس نے استخارہ کیا وہ نامراد نہیں ہو گا، جس نے مشورہ کیا وہ پشیمان نہیں ہو گا۔ تو کیا ایک نوجوان لڑکی اور لڑکا اس قدر عقل مند ہیں، نعوذ باللہ

نعت

ہو کیسے فکرِ انسان کو یارا تیری مدحت کا
خدائے پاک ہی خود مدح خواں ہے تیری عظمت کا
زباں قائل صداقت کی عمل حامل امانت کا
یہ ادنیٰ معجزہ تھا تیرے آغازِ نبوت کا
جہانِ خاک تھا محروم سائے سے تیرے لیکن
رہا اہلِ جہاں کے سر پہ سایہ تیری رحمت کا
وہ خاکِ پاک یثرب وہ مقدس سرزمیں جس سے
جہانِ خاک کو رتبہ ملا فردوسِ جنت کا
جھکاتے ہیں جبیں آ کر جہاں علم و ہنر والے
جہاں جھکتا ہے سر آ کر شہنشاہوں کی شوکت کا
وہیں کی خاک کے آغوش میں انسانیت جاگی
وہیں چمکا ستارا نوعِ انساں کی شرافت کا
وہیں آیا مقابل حسنِ معنی حسنِ صورت کے
نظر آیا جہانِ خاک کو جلوہ محبت کا
محبت نے تمناؤں کو ذوقِ جستجو بخشا
یہ ذوقِ جستجو ہے ولولہ تجھ سے عقیدت کا
اسی اِک ولولے سے زندگی نے آبرو پائی
یہی اِک ولولہ ہے نورِ ایماں تیری امت کا
بس اے زورِ قلم رک جا کہاں تک یہ سخن رانی
نہ یارا شعر گوئی کا نہ دعویٰ علم و حکمت کا
یہی دو چار شعرِ نعت ہیں بس کائنات اپنی
یہی ہے اِک وسیلہ بے سہاروں کی سعادت کا
ابھرتا ہے آنکھوں میں کبھی آنسو ندامت سے
ستارہ ہے یہی ہم سے گنہگاروں کی قسمت کا

شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

مرسلہ: میمونہ عزیز، کراچی

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے زیادہ فہم و فراست رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے والدین، سرپرستوں سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں؟ والدین کو چاہیے کہ اپنی اولاد کے مزاج، پسند، ناپسند کا خیال رکھتے ہوئے اس کے لیے جیون ساتھی منتخب کریں، اولاد سے مشورہ کریں۔ اس کے ہونے والے جیون ساتھی کے بارے میں تمام تر معلومات سے آگاہ کریں۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کی یقیناً اجازت ہے۔ والدین اور اولاد دونوں ہی ایک دوسرے سے مشورے کے پابند ہیں اور باہمی رضامندی سے ہی یہ رشتہ ہونا چاہیے۔ (عطیہ! آپ کے اس آسان اور قدرے مفصل جواب سے قارئین کی یقیناً رہنمائی ہوگی)

پاکیزہ ✧...... آپ کی تحریریں پاکیزہ و دلکش کی جان ہوا کرتی تھیں اب آپ نے کافی عرصے سے نہیں لکھا...... کیا کسی نئے موضوع کی تلاش تھی؟

عطیہ عمر ✧...... غیر حاضری کی وجہ، ایک تو طبیعت کی خرابی اور پھر کچھ دیگر ذاتی وجوہات۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ کی تحریروں میں قارئین کھو جاتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے آج کا قاری کیا پسند کر رہا ہے؟

عطیہ عمر ✧...... ماشاء اللہ پاکیزہ ایک معیاری ماہنامہ ہے اور ''بہنوں کی محفل'' پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین بخوبی کر رہا ہے۔ میرے خیال میں حقیقت کی ترجمانی کرتی تحریریں پسند کی جاتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کو اپنی کسی تحریر پر سخت تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا ہوگا اس وقت آپ کے کیا تاثرات ہوتے ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... فرمان فاروق اعظمؓ ہے کہ ''خدا اس کا بھلا کرے جو میرے عیب میرے پاس تحفے میں بھیجتا ہے۔''

اللہ ہمیں معاف کرے، ہمارے ظرف ان مبارک ہستیوںؓ کی طرح اعلیٰ کہاں مگر پھر بھی میں تنقید سے نہیں گھبراتی... کیونکہ مثبت تنقید، تعمیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ویسے جہاں تک مجھے یاد ہے بہت زیادہ تنقید کبھی ہوئی نہیں۔ تنقید کی بات ہو رہی ہے تو اسی حوالے سے میری ایک تلخ یاد ہے۔ تلخ اس لیے کہ مجھے اس واقعے سے بہت تکلیف ہوئی بلکہ ابھی بیماری کے دوران مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ میں کسی کی دل آزاری کا باعث بنی۔ میں ان بہن سے دلی معذرت کرتی ہوں۔ میرا مقصد ان کے علم، تحریر کی تضحیک ہرگز، ہرگز نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی تحریر پر تنقید کر رہی تھی۔ میں کون سی بڑی ادیبہ ہوں کہ تنقید کا منصب سنبھالوں۔ بات یوں تھی کہ ایک افسانہ پاکیزہ میں شائع ہوا جس میں لڑکی کا محبوب محبت کا جھانسا دے کر عزت چھین لیتا ہے اور پھر محبوبہ کو داغ جدائی دے جاتا ہے۔ محبوبہ صاحبہ، سابق محبوب حالیہ دشمن کے والد صاحب سے شادی کر لیتی ہیں۔ ایک بچے کی والدہ محترمہ بن کر سابق محبوب کے سامنے تفاخر سے جاتی ہیں۔ ان کے تئیں، ان کا انتقام پورا ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے خط میں یہ شرعی مسئلہ بیان کیا کہ جس طرح سگی ماں اور سگے باپ سے ازدواجی رشتہ قطعاً حرام ہے، ساس، سسر سے بھی حرام ہے بلکہ اگر مرد، عورت میں ناجائز تعلق بھی قائم ہو چکا ہو تو تب بھی ان کے لیے ایک دوسرے کے والدین اور اولاد قطعاً حرام ہیں۔

میری اس وضاحت سے وہ لکھاری بہن ناراض ہو گئیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ میں اپنی علمیت بگھار رہی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آتے جاتے موسم آپ کی تحریروں کو کس طرح متاثر کرتے ہیں؟ آپ نے حقیقی واقعات سے کس حد تک متاثر ہو کر لکھا؟

عطیہ عمر ✧...... موسم اچھا ہو تو لکھنے کو جی چاہتا

ہے۔ کئی ایک افسانے حقیقی واقعات سے متاثر ہو کر لکھے۔ یہ آئے روز کے بم دھماکے، ڈرون حملے، فائرنگ، بے گناہ ہم وطنوں کا بہتا لہو، مقتدر ہستیوں کی ذاتی مفاد کی جنگ، قلب و روح کو مضمحل کر دیتی ہے تو کچھ لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

پاکیزہ ✧...... اپنی شخصیت کو آپ کس حد تک جدیدیت سے ہم آہنگ رکھتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... صرف اس حد تک جو میرے مزاج سے میل کھائے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی اس مصروفیت سے آپ کا گھر، شوہر اور دیگر رشتے کس حد تک متاثر ہوئے؟

عطیہ عمر ✧...... گھر اور شوہر میری پہلی ترجیح ہے۔ اس لیے جب تک مشترکہ خاندانی نظام کے تحت رہی کچھ نہیں لکھا۔

پاکیزہ ✧...... ایک آئیڈیل عورت کیا ہوتی ہے؟ اور ایک آئیڈیل مرد بھی؟

عطیہ عمر ✧...... میرے خیال میں ایک قابلِ تقلید مرد یا عورت وہ ہے جو خود سے وابستہ تمام تر رشتوں کو ان کے جائز مقام پر ان کا حق، احترام کے ساتھ ادا کرے۔

پاکیزہ ✧...... زندگی کا اولین مقصد کیا ہونا چاہیے کیا ہم کسی بھی مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... زندگی کا اولین مقصد خالق کی اطاعت، اس کا شکر، اس کی مخلوق کا احترام ہونا چاہیے۔ معذرت کے ساتھ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم میں سے اکثر نے اپنی زندگیاں حقیر فائدوں اور مقاصد کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... دوستی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ کی لڑکپن کی سہیلیاں کیا ابھی تک رابطے میں ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... دوستی بہت معتبر ناتا ہے نہیں۔

پاکیزہ ✧...... اپنے دل کی باتیں کس سے کرتی ہیں؟

عطیہ عمر ✧...... زیادہ تر اپنے رب سے پھر ان ہستیوں سے جو میرے دل کے قریب ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج کل کے ماحول میں ایک لڑکی یا لڑکے کی پرورش کن خطوط پر ہونی چاہیے؟

عطیہ عمر ✧...... اعتماد، محبت بہت اہم ہے لیکن اپنے مذہب اپنی اقدار سے روشناس کرانا بھی اولین ذمے داری ہے۔ کل کو والدین، اپنی اولاد کے لیے بھی جواب دہ ہوں گے۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ سے دوستی کا احوال بیان کیجیے؟

عطیہ عمر ✧...... اٹھارہ، بیس سال کی دوستی ہے۔ پہلے صرف پڑھنے کی حد تک...... اور اب اس کے صفحات میں بھی شامل ہوتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... اس قلم و کاغذ کی دوستی میں فرائض سے کس حد تک غفلت برتی؟

عطیہ عمر ✧...... فرائض کو پہلی ترجیح دی ہے۔ دوست تو دوست ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کیا لباس پسند کرتی ہیں اپنے لیے اور دوسروں کے لیے؟ رنگ؟ موسم؟ پسندیدہ کھانا؟ پسندیدہ تفریح کی جگہ؟

عطیہ عمر ✧...... اپنے لیے ایسا لباس جو مذہبی اور اخلاقی اقدار کے منافی نہ ہو اور میری شخصیت کو اجاگر کرے۔ دوسروں کے لیے بھی ایسا ہی پسند کرتی ہوں...... تقریباً تمام ہلکے رنگ۔ بہت بھڑک چمک پسند نہیں۔ لیکن میاں کی پسند پر کچھ گہرے رنگ بھی پہن لیتی ہوں۔ موسم سردی کا...... بارش کا...... زیادہ مرغن اور مرچوں والے کھانے نہیں کھا سکتی۔ باقی سب کچھ کھا لیتی ہوں...... سمندر۔

پاکیزہ ✧...... شاعری کے بارے میں کیا خیالات ہیں کون سا شاعر پسند ہے؟

عطیہ عمر ✧......جذبات کے اظہار کا خوب صورت ذریعہ...... پسندیدہ شعرا کی تو لمبی فہرست ہے لیکن سرفہرست اقبالؔ۔

پاکیزہ ✧......ٹی وی دیکھنے سے کس حد تک شغف ہے؟

عطیہ عمر ✧......کوئی خاص نہیں۔ لیکن عمر کا ساتھ دینے کے لیے ٹاک شوز، خبریں اور متفرق دیکھ لیتی ہوں۔ ڈانس اور گانے کے پروگرام ہم دونوں ہی نہیں دیکھتے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے ٹی وی ڈرامے نہیں لکھے یا اپنا اسکرپٹ نہیں دیا، کیوں؟

عطیہ عمر ✧......غالباً چھ سات برس پیشتر عمر کے ایک دوست کے کہنے پر ایک اسکرپٹ دیا تھا۔ ڈراما پروڈیوسر نے عمر کے دوست کو بتایا کہ جیو کے لیے وہ اسکرپٹ منظور ہوگیا ہے کچھ ہفتوں کے بعد بتایا کہ وہ اسکرپٹ گم ہوگیا۔ دوبارہ لکھ کر دیں جو میں نے نہیں لکھا اور اب میرا ایسا ارادہ بھی نہیں۔ وجہ؟ اور کیوں، میرے خیال میں رہنے دیں۔

پاکیزہ ✧......موجودہ رائٹرز میں کون پسند ہے؟

عطیہ عمر ✧......سب ہی...... عمیرہ احمد، قیصرہ حیات، نمرہ احمد کو کون پسند نہیں کرتا۔ ثمرہ بخاری، شیریں حیدر، عالیہ بخاری، عنیزہ سید، رخسانہ نگار کے ناموں کے بغیر پسندیدہ رائٹرز کی فہرست کیسے بن سکتی ہے۔ رفعت سراج، رفعت ناہید سجاد، ان رائٹرز میں سے ہیں جب سے میں نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا ان کی تحریروں کے سحر میں گرفتار ہوں اور نگہت سیما۔ وہ نہیں جانتیں کہ میں ان کی گرائیں بھی ہوں اس لیے اگر اقربا پروری کی چھاپ نہ لگے تو یہ وہ لکھاری ہیں جن کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے میرا دل دھڑکتا ہے اور نگہت سیما کی تحریروں کی آنچ دھڑکن میں محسوس ہوتی ہے اور ساجدہ حبیب، کیا شاندار پاکستانی ادیبہ ہیں اور اب آتا ہے نام انجم باجی کا۔

بہت شگفتہ، رواں اور شستہ انداز تحریر۔ میں سمجھتی ہوں کہ نئی رائٹرز کو ان کی تحریروں سے رہنمائی لینی چاہیے۔

پاکیزہ ✧......نئی رائٹرز کے لیے کوئی پیغام؟ ہمارے پاکیزہ قارئین سے کیا کہنا چاہیں گی؟

عطیہ عمر ✧......نئی رائٹرز کے لیے تو پچھلے جواب میں پیغام شامل ہے۔ قارئین کی محبتوں اور خلوص کا بہت شکریہ۔ انہی کی وجہ سے تو پاکیزہ کے صفحات میں ہماری تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ نئی رائٹرز اور تبصرہ نگار بہنوں کو اپنا ایک لڑکپن کا واقعہ سنانا چاہوں گی۔ میرے مرحوم نانا جان استاد تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ، تحقیق ان کا خاص میدان تھا۔ اردو، فارسی میں شعر کہتے تھے۔ کئی قدیم شعرا پر تحقیق بھی کی تھی۔ سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان ان کے شاگردوں میں سے تھے۔

میں اور نانا جان ایک مشاعرہ سن رہے تھے۔ میں نے ایک شعر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو نانا جان نے مجھے چند اشعار لکھ کر دیے اور ساتھ ہی بہت سے ایسے الفاظ اردو، فارسی کے جو ایک ہی طرح لکھے، بولے جاتے ہیں مگر ان کا مفہوم جدا اور بعض اوقات الٹ ہوتا ہے۔ مثلاً ''خال'' ایک معنی اس کا ''تل'' ہے اور دوسرا ''کم''...... باز (پرندہ) بعض۔ (کچھ) نقطہ (جیسے نون میں ایک نقطہ) نکتہ...... سطر (لائن) ستر (پردہ) معاش (روزگار) ماش وغیرہ۔ الفاظ پر اعراب لگانے کو کہا تاکہ مطلب واضح ہو اور کہا کہ اگر ان تمام الفاظ کا فرق نہ بتایا اور اشعار پر اعراب نہ لگا سکیں...... اور تمام الفاظ کو ان کے مفہوم کے مطابق جملوں میں استعمال نہ کیا تو پھر تمہیں کسی شعر پر رائے زنی کا حق نہیں۔ شعر یہ تھا کہ

(ایک التماس، اعراب کا خیال رکھیں)

گئے چار سُن، تیرا کم تھا سن کہ لیے تھے سُن، ترے کچھ تو
ہوا سینہ چھَن، گیا دل بھی چھن، جونہی بولے چھُن ترے گھنگرو

مزید عرض یہ ہے کہ الحمدللہ میرا تعلق جس خاندان سے ہے، وہاں رزقِ حلال کے لیے حتی المقدور کوشش کی جاتی تھی۔ الحمدللہ میرے بھائی، بہنوئی شوہر ان کے بھائی رزقِ حلال کمانے کی سعی کرتے ہیں۔ مرحوم والدین صوم وصلوٰۃ کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین۔

پاکیزہ ✧......اچھا چلتے چلتے یہ بھی بتاویں کہ ایک اچھے قلمکار میں کیا...... ہونا ضروری ہے؟

عطیہ عمر ✧......وسیع مطالعہ، عمیق مشاہدہ۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ و بیان پر قدرت۔ جس موضوع پر لکھ رہی ہیں، اس کے بارے میں مستند معلومات اور تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ۔ بے چاری اردو آج کل انگریزی کے نرغے میں نظر آتی ہے۔ بہت اچھے معتبر نام ایک غلطی کا شکار نظر آتے ہیں۔ یعنی اردو کی قدیم تشبیہات، تلمیحات اور استعاروں کا غلط استعمال کرتے ہیں جیسے پچھلے دنوں پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں میزبان نے جو ایک معروف شاعر ہیں ایک جملے میں الفاظ استعمال کیے ''دعوتِ شیراز''...... ان کا مطلب پُرتکلف ضیافت سے تھا۔ (آپ کا وقت لینے پر معذرت خواہ ہوں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد عام روزمرہ کا سادہ کھانا ہے۔ شیخ سعدی اپنے دوست کے ہاں مہمان ہوئے تو اس نے صبح شام انتہائی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ شیخ سعدی جب دسترخوان پر بیٹھتے تو کہتے ''ہائے دعوتِ شیراز'' اور دوست اگلے کھانے پر مزید اہتمام کرلیتا۔ کچھ عرصے بعد وہی دوست شیخ سعدی کا مہمان ہوا تو شیخ سعدی نے عام معمول کا کھانا سامنے رکھا۔ دوست کی حیرت دیکھ کر شیخ سعدی نے فرمایا۔ میرے الفاظ سے تم غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے۔ حالانکہ میرا مطلب یہی سادہ کھانا تھا۔ وہ پُرتکلف دعوتیں، تم تین چار وقت کرسکتے تھے۔ زیادہ دن نہیں۔ میں زیادہ دن تمہارے ہاں ٹھہرتا تو تمہارے لیے مشکل ہوجاتی۔ اب ''دعوتِ شیراز'' ہے۔ جو میں کھاتا ہوں، تم بھی کھاؤ اور جتنے دن مرضی میرے ہاں ٹھہرو، میرے لیے کچھ بار نہیں۔ (واہ عطیہ بہت خوب)

پاکیزہ ✧......آپ اپنے اس قلمی سفر سے کس حد تک مطمئن رہیں؟ ابھی کیا لکھنے کی خواہش ہے؟

عطیہ عمر ✧......ابھی تو کوشش کررہی ہوں۔ بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے بہت سے ادھورے مسودے مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ باقی جو اللہ کا حکم۔ (انشاء اللہ آپ پاکیزہ کے صفحات پر جگمگاتی رہیں گی) فی امان اللہ...... اگر میرے کسی خیال، فقرے سے کسی بہن کی دل آزاری ہوئی ہو تو معذرت۔

☆☆☆

قارئینِ کرام! امید ہے آپ کو عطیہ عمر کی فکر انگیز بات چیت اور معلومات سے آراستہ جوابات یقیناً پسند آئے ہوں گے۔ ہم آخر میں ایک مرتبہ پھر عطیہ صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے ہماری درخواست پر مفصل گفتگو کی اور عطیہ صاحبہ کی تحریروں کا انتظار ہمارے ساتھ ساتھ قارئین بھی کرتے رہیں گے اور عطیہ اسی طرح ہمیں اپنے افکار سے نوازتی رہیں گی۔

عزیز بہنو! اس بزم میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا، اب اجازت دیجیے۔ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں خدا نگہبان!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

عید لائی خوشیوں کا دلکش سماں

شائستہ زریں

عید کے لغوی معنی ہیں ''جو بار بار آئے'' عید بے پناہ خوشی کا نام بھی ہے اور اسلام کے اہم رکن روزوں کا انعام بھی۔ گویا ہمارا مذہبی تہوار جسے ہم نہایت جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ یہ خوشی ہر مسلمان کے حصے میں بنا طبقاتی فرق کے آتی ہے۔ عید کی خوشیوں پر سب کا یکساں حق ہوتا ہے سو عید کی خوشیاں مناتے وقت ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ

خوشیوں سے عید ہوتی ہے، خوشیوں سے عید کرنا
اپنی اس خوشی میں سب کو شریک کرنا

گویا عید کے موقع پر ہماری ذات سے ملنے والی چھوٹی سی خوشی سے بھی کسی کی عید کی خوشیوں میں نکھار آجائے تو یہ ہمارے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام ہے...... بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے لیے عیدی ہے کہ اللہ نے ہمیں ان لوگوں میں شمار کیا جن کی ذات سے لوگ سچی خوشی اور فیض پاتے ہیں۔ عید کا تصور عیدی کے بغیر نامکمل ہے، خواہ وہ دس روپے کی ہو یا سو روپے...... عیدی کی اپنی ہی خوشی ہوتی ہے، بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ ساتھ اب عیدی کے ریٹ بھی بڑھ گئے ہیں۔ یہ بجا کہ عیدی کرنسی میں دینے کا رواج ہے اور اچھی بھی لگتی ہے لیکن گزشتہ چند برسوں سے عیدی میں کرنسی سے ہٹ کر مختلف اشیا تحائف کی صورت میں دینے کے رجحان میں اضافہ ہوگیا ہے۔ عیدی کرنسی میں ہو یا مختلف لوازمات کی صورت لیکن عید پر دلی جذبات و احساسات کی عکاسی کرتا شاعرانہ کلام کسی بیش قیمت تحفے سے کم نہیں کہ وہ دینے والے کے جذبات کا جو وہ آپ کے لیے رکھتا ہے سچا اور پُرلطف اظہار ہوتا ہے۔ ان ہی امور کے پیش نظر ہم نے عید نمبر کے سروے کے لیے معلوم کیا کہ......

س ۱: کبھی ایسا ہوا کہ آپ کی ذات کی وجہ سے کسی دوسرے کی عید خوب صورت ہوگئی، اسے بھی عید کی خوشیاں ملیں؟

س ۲: آپ کے خیال میں کم سے کم عیدی کتنی ہونی چاہیے؟ عیدی صرف کرنسی کی صورت میں ہونی چاہیے یا دیگر لوازمات بھی ہو سکتے ہیں؟

س ۳: کسی کو عید پر شعری تحفہ دینا ہو تو آپ کس کو اور کون سا شعری تحفہ دیں گی؟

حرا سلیمان (کمپیئر)

۱: عید میرے لیے بہت اسپیشل دن ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ اپنے گھر کام کرنے والی ماسیوں کے لیے ایک دن عید کی شاپنگ کرتی ہوں اور انہیں سستی چیزوں پر نہیں ٹرخاتی بلکہ قیمتی چیزیں دلواتی ہوں اسی طرح میرے وہ رشتے دار جو افورڈ نہیں کر سکتے ان کے ساتھ عید کے موقع پر مالی تعاون ضرور کرتی ہوں تاکہ وہ عید کی خوشیاں بھرپور طریقے سے منا سکیں۔

۲: جو افورڈ کر سکتے ہیں وہ کم سے کم ہزار روپیہ تو دیں جو نہیں کر سکتے وہ اپنی جیب کے مطابق دیں۔ عیدی صرف کرنسی کی صورت میں ہونی چاہیے



حرا سلیمان

اس کا مزہ ہی اور ہے۔

۳: میں اپنے پیرنٹس اور مانی دونوں کو الگ الگ عید کا شعری تحفہ دوں گی۔ میرے پیرنٹس کے لیے

دعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرتی مسکراتی پُر بہار عیدیں
نچھاور آپ پر ہوں ایسی صد ہزار عیدیں
زمانے بھر کی خوشیاں آپ پر کردیں نثار عیدیں

اور مانی کے لیے یہی کہوں گی کہ۔

میں نے چاہا کہ تجھے عید پر کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے موتی لاکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

زاہدہ خان (براڈکاسٹر)

۱: میری دو بہنیں کینیڈا میں رہتی ہیں جب میں یہاں سے بہنوں، بہنوئیوں اور بچوں کے عید کے کپڑے سلوا کر بھیجتی ہوں اور وہ انہیں پہن کر وہاں عید کی نماز پڑھتے ہیں تو بے حد خوش ہوتے ہیں اور یقیناً اس سے اُن کی عید خوب صورت ہوجاتی ہے۔

۲: اس کا تعین تو بہت مشکل ہے بچوں کو تو عیدی جتنی بھی ملے کم ہے اور انہیں عید کرنسی ہی میں اچھی لگتی ہے۔ لیکن میری سوچ یہی ہے کہ کرنسی میں نہیں ہونی چاہیے کیونکہ عموماً ایک فیملی دوسری فیملی کے بچوں کو عیدی دیتی ہے تو جواباً وہ بھی اتنی ہی یا اس سے کچھ بڑھ کر رقم عیدی میں دے دیتے ہیں تو اس میں کچھ مزہ نہیں، عیدی میں تحائف دینا اچھا لگتا ہے۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ لڑکیوں کو ان کی دلچسپی کی چیزیں دینی چاہئیں اور اگر کوئی اچھی کتاب دے دیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

۳: اپنے بھائیوں کو یہ شعری تحفہ دوں گی۔

خدا کرے کہ ہمیشہ گلاب کے مانند
مہک مہک کے جیو گلشن حیات میں تم
زمانے بھر کی ہوں خوشیاں تمہارے دامن میں
جہاں بھر کی محبت سمیٹ پاؤ تم

ذہب خان

(جونئر اسکوائش چیمپئن، جورڈن چیمپئن)

۱: ہر سال ہی عید پر میری یہ کوشش ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں عید کی خوشیاں بانٹ سکوں اور یہ میں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کرتی



ذہب خان

ہوں یعنی عید کا پہلا دن اپنے والدین اور گھر والوں کے ساتھ مناتی ہوں۔ دوسرا دن خاندان والوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ تیسرے دن دوستوں میں انجوائے کرتی ہوں اور ننھے منے بچوں کے ساتھ عید منانے میں بہت مزہ آتا ہے...... بچوں کی عید کی تیاریاں، ان کے کپڑے، شوز اور اسٹائل دیکھ کر جہاں مجھے مزہ آتا ہے وہاں وہ بھی بہت خوش ہوتے ہیں جب میں ان کی چیزوں کی تعریف کرتی ہوں اور ان.... سب کے ساتھ ساتھ مستحق افراد میں بھی عید کی خوشیاں بانٹنے کی کوشش کرتی ہوں اور میرے محبت بھرے رویے سے ان تمام لوگوں کی عید خوب صورت ہو جاتی ہے۔

۲: میرے خیال میں تو عیدی پیار، محبت اور خلوص کا نام ہے اس لیے کم سے کم نہیں زیادہ سے زیادہ دینی چاہیے اور کرنسی میں دینی چاہیے مگر اپنی جیب دیکھ کر میرے حساب سے بچوں کو کرنسی میں دینی چاہیے وہ اس سے زیادہ انجوائے کرتے ہیں اور بڑوں کے لیے گفٹ ہونے چاہئیں۔ جب میرے بڑے مجھے کیش میں عیدی دیتے ہیں تو عید کا احساس ہوتا ہے۔

۳: شعری تحفہ میں اپنے ڈیڈی کو دوں گی۔

یہ دعا مانگتے ہیں ہم عید کے دن
باقی نہ رہے آپ کا کوئی غم عید کے دن
آپ کے آنگن میں اترے ہر روز خوشیوں بھرا چاند
اور مہکتا رہے پھولوں سے چمن عید کے دن

فرحانہ ناز ملک (رائٹر)

ا: میرے بچے جب اپنی مرضی کے مطابق جتنی چاہے عید کی شاپنگ کرتے ہیں اور عید والے دن جب وہ چیزیں استعمال کرتے ہیں تو اُن کی اس خوشی سے میرا عید کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اپنے گھر کام کرنے والی ماسی کو عید کی شاپنگ کے علاوہ عید کی ضروریات کے لیے اس کو اضافی رقم دے کر اس کی عید کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہوں۔

۲: اگر عیدی صرف لینے کا رواج ہو تو پھر کرنسی کیا، جوڑے کیا، کاسمیٹکس، کیا جیولری آئٹمز کیا سب عیدی کی مد میں شامل ہونا چاہیے اور اگر بات دینے کی ہو تو پھر صرف کرنسی میں ویسے میری بہنیں عیدی لینے پر قیمتی سے قیمتی کپڑوں سے کم پر راضی نہیں ہوتیں۔

۳: عزیز و اقارب سب کے سب بدذوق ہیں اس لیے شعری تحفہ میں اپنی لکھاری بہنوں کو دوں گی۔

ہلالِ عید کی شب
تیرے صحنِ چمن میں
روزِ عید کی چاندنی چمکائے
میری دعا ہے کہ
تیرے گھر کے آنگن میں
ستاروں کی مالا اتر آئے
مسرت کے ان لمحوں میں
خوشیاں تیرے گرد جھلملائیں
بہاروں سے تیرا دامن بھر جائے

انعم قاضی (فارمیسیٹ)

ا: میری وجہ سے ہمیشہ میری نانی کی عید خوشگوار



انعم قاضی

ہو جاتی تھی۔ جب میں ان سے عید ملنے جاتی تو وہ خاص طور پر میری پسند کی چیزیں بناتیں اور بنواتیں اور میں ہی نہیں یہ بات سب محسوس کرتے کہ مجھ سے عید مل کر نانی کی عید کی خوشی بہت بڑھ جاتی تھی۔ اپنے بزرگوں کو عید کے موقع پر خوشی دینے سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہو گی؟

۲: عیدی صرف کرنسی میں اور دینے والے کی حیثیت اور مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔ جو وہ خوشی سے دے لے لینا چاہیے۔

۳: میری چھوٹی خالہ بینا جو میری خالہ کم دوست زیادہ ہیں، آج کل ساؤتھ افریقہ میں مقیم ہیں میرا شعری تحفہ ان ہی کے لیے ہے۔

مسرتوں کے دیے فروزاں ہوں مثالِ عید
تم میرے آنگن میں اترو کبھی مثالِ عید
سمجھوں تمہاری دید کو یوں میں کمالِ عید
تصور کو سدا جگمگائے یہی خیالِ عید

جویریہ وسیم (ڈاکٹر)

ا: ایک خاتون جو ہمارے گھر کافی عرصے سے آرہی ہیں، چند سال پہلے انہوں نے بتایا کہ ان کی



جویریہ وسیم

نواسی کے عید کے کپڑے نہیں بن سکے، یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا میں نے اپنے عید کے جوڑوں میں سے ایک سوٹ کم کر کے اس کے پیسے ان کی نواسی کے عید کے کپڑوں کے لیے دے دیے وہ بہت خوش ہوئیں مجھے بہت دعائیں دیں۔

۲: عیدی اگر محبت سے دی جائے تو اس کی الگ ہی خوشی ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ عیدی کرنسی میں ہو، کوئی تحفہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

۳: شعری تحفہ میں چھوٹی اور لاڈلی بہن بسمہ کو دوں گی۔

ملیں تجھے نہ دکھ زندگی میں
پھول کی طرح تو مہکے خدا کرے
زندہ رہے نام ابد تک تیرا
عید کی خوشیاں تجھے مبارک خدا کرے

ردا افتخار (طالبہ)

ا: ہاں ایسا ہوا ہے وہ موقع اور لمحات میرے اپنے لیے انتہائی خوش کُن تھے جب ایک فلاحی ادارے میں چھوٹے چھوٹے تحائف کے ساتھ اپنے دوستوں کے ہمراہ وہاں پہنچی جہاں بوڑھے، بچے اور



ردا افتخار

ہمارے سب موجود تھے اور ہماری بھر پور محبت کے مستحق بھی، وہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ ایک ذرا سی توجہ سے میری ذات ان لوگوں کے لیے کس قدر خوشیوں کا باعث بن گئی۔ عید کی خوشیاں منانے کے لیے ہمارے پاس تو ہمارے والدین، دوست، رشتے دار، اردگرد تمام لوگ موجود ہیں مگر ان افراد کے لیے کون ہے؟

۲: عیدی کو کسی بھی لحاظ سے کرنسی میں تھوڑی یا زیادہ ذہن میں رکھ کر نہیں سوچنا چاہیے، یہ ایک ہماری انتہائی دل کو مسرت دینے والی بہت اپنائیت لیے رسم ہوتی ہے، اسے ایک ٹوکن کے طور پر ہی لینا چاہیے کم یا زیادہ کا کچھ تصور نہیں بس عیدی ملنی چاہیے عیدی کسی بھی شکل میں ہو دینے والے کی محبت اور اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔

۳: میں اپنی پیاری آنی (سلمیٰ خالہ) کو عید پر یہ شعری تحفہ دوں گی۔

سدا ہنستے رہیں جیسے ہنستے ہیں پھول
دنیا کے سارے غم آپ کو جائیں بھول
چاروں طرف پھیلائیں خوشیوں کے پھول
اس امید کے ساتھ آپ منائیں عید

علما خان (طالبہ)

۱: ایسا کوئی ایک واقعہ تو نہیں ہے۔ ہاں ہر عید کے موقع پر میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ سب کا خیال رکھوں، خود بھی خوش رہوں اور اوروں کو بھی خوش رکھ کر اپنی ہی نہیں ان کی عید بھی خوب صورت بناؤں۔

۲: بچوں کی تو کیا بات ہے عیدی کے تصور سے بڑوں کی آنکھوں میں بھی چمک آجاتی ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں لیکن اب عیدی کے حوالے سے میری سوچ میں تبدیلی آگئی ہے میرا خیال ہے کہ عید پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بلا کر ان کی دعوت کریں اور سب سے بڑھ کر جن کے پاس عید


علما خان

منانے کے لیے وسائل نہیں ہیں ان کی مدد کریں کیونکہ عید کی خوشیوں پر امیر غریب سب کا برابر کا حق ہے ناں تو اس سے بڑی عیدی کیا ہوگی۔ ہاں اکثر لوگوں کو عید کرنسی میں ہی اچھی لگتی ہے جو کم سے کم سو روپے تو ہو۔

۳: شعری تحفہ میں اپنے والدین کو دوں گی۔

دعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرتی مسکراتی پُر بہار عیدیں

سروئ ناز (طالبہ)

۱: ایک مرتبہ عید کے موقع پر میں نے اپنی ماسی کی بیٹی کو اپنا سوٹ دے دیا تھا اور اس کے ساتھ کی جیولری بھی دی تھی جسے عید کے دن پہن کر وہ آئی تھی اور بہت خوش ہو رہی تھی۔

۲: بچوں کو تو عیدی کرنسی ہی میں زیادہ پُرکشش لگتی ہے لیکن اگر کوئی مجھے عید کے موقع پر کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی دے تو مجھے بہت اچھا لگے گا، کم سے کم عیدی ۱۰۰ تو ہونی چاہیے۔

۳: شعری تحفہ اپنی کزنز کو دوں گی۔

ستارے جگمگاتے ہیں، عید کی شام
محبوب چہرے نظر آتے ہیں عید کی شام
کتنی روشن، جگمگ ہو جاتی ہے تب
اپنے پیاروں کے سنگ عید کی شام

قارئین! عید خوشی کا دوسرا نام ہے اور خوشی تو مل کر منانے ہی میں مزہ آتا ہے۔ عید کے موقع پر ہماری ذات سے اوروں کو ملنے والی خوشیوں میں سے ایک بڑی خوشی باہمی ناراضی ختم کرنے کی بھی


سروئ ناز

ہے اور اس وقت تو لطفِ عید اور بڑھ جاتا ہے جب اس پر عمل کر لیا جاتا ہے کہ

کدورت کو مٹاؤ، مسکراؤ عید کا دن ہے
محبت سے گلے سب کو لگاؤ عید کا دن ہے

اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کرلیں جو عید کے لیے وہ اہتمام کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جو ہم بڑی فراخدلی سے کر لیتے ہیں تو کیوں نہ دل بڑا کر کے ان کی عید کو بھی خوبصورت بنا دیں؟ عیدی جب اپنائیت اور خلوص سے دی جائے تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنی ہے، جب بڑے اپنی محبت اور شفقت کی چھاؤں میں دیتے ہیں تو سو روپے بھی ہزار سے کم نہیں لگتے عیدی کا تصور کرنسی ہی سے وابستہ ہے۔ ہاں دوستوں اور

فرمائش

صبا نے ندیم سے کہا۔ ”کتنا اچھا ہوتا اگر تم سمجھوتے کی دہلیز سے پہلے ہی لوٹ جاتے مگر اب جانے سے پہلے میرے آخری سوال کا جواب ضرور دیتے جانا۔ میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ میرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لاؤ اور مجھے خوابوں کے دیس میں لے چلو۔ میں تو حقیقت کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہوں، میں نے تو صرف تم سے سونے کا ایک ذرا بھاری سا سیٹ ہی تو مانگا تھا کہ نقلی جیولری پہننے میں مزہ نہیں آیا کرتا۔“

مرسلہ: عائشہ خالد، میرپور خاص

کزنز کے مابین عید میں باہمی تحائف کا لین دین اچھا لگتا ہے اور یہ تحفہ اگر اس کی پسند کا ہو جسے دیا جا رہا ہے تو اس کی عید کی خوشی تو دوبالا ہو جائے گی ناں۔ رہا شعری تحفہ تو اس کی کیا بات ہے بعض شعری تحائف کرنسی والی عیدی سے بھی فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

ہماری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے پاکیزہ کی تمام قلمکار اور قاری بہنوں کے لیے عید سعید کے پُرمسرت موقع پر شعری تحفہ۔

کیا پیش کروں بجز تہنیتِ عید
دائم نصیب رہے خوشیوں کی نوید
مسرتوں کی ضامن ہر ساعتِ عید
پھولے پھلے شاداب رہے نخلِ امید
وفا کا سندیس لے کر اترے تمہارے آنگن میں
گواہ رفاقتوں کا، محبتوں کا بن کر ہلالِ عید
تمام روز و شب یونہی فروزاں رہیں ہر دم
ہر شب، شب برات، ہر روز، روزِ عید (آمین)

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆عید آنے میں چند ہی دن باقی ہیں۔ یقیناً آپ عید کی تیاریوں میں مصروف بھی ہوں گی۔ اپنی تیاریوں کے ساتھ ساتھ...... اپنے اردگرد لوگوں پر ایک نظر ضرور ڈالیے گا جو اپنی مفلوک الحالی کے باعث اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتے...... آپ کی مدد کے توسط سے کسی بھی گھرانے کو عید کی خوشیاں مل سکتی ہیں جو کہ آپ کے لیے بھی دلی طمانیت کا باعث ہوں گی...... اور یوں بھی ہم اس دفعہ عید اور جشنِ آزادی تقریباً ساتھ ساتھ ہی منا رہے ہیں۔ موبائل اور میڈیا کے اثرات نے چھوٹے بچوں کو بھی وقت سے پہلے بالغ کردیا ہے۔ اس ماہ دو ماؤں نے بھی مجھے فون پر بتایا کہ ان کی تیرہ سالہ بچی شادی کرنے کی خواہش مند ہے، اسی طرح چودہ سالہ لڑکا بھی شادی کرنے کے لیے اپنے گھر میں شور شرابا مچائے ہوئے ہے۔ اب اس کا علاج کیا کریں۔ ان ماؤں کو تو میں نے اپنے حساب سے سمجھا دیا ہے لیکن آپ کے ذہن میں کوئی اچھی رائے ہو تو ہمیں ضرور بتایئے گا۔

☆ہمیں خط لکھنے، اپنے افسانے اور مراسلات بھیجنے کا ایک ہی ایڈریس ہے جو آپ نوٹ کرلیں۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ...... 63c فیز II ایکس ٹینشن مین کورنگی روڈ...... کراچی...... 75500

☆اور آیئے اس سے قبل کہ بہنوں کی محفل کے کٹھے میٹھے خطوط پڑھیں پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضروری دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

❋ ❋ ❋

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ہماری بہت پیاری مصنفہ نگہت اعظمی کے بیٹے محمد طلحہ جعفری کے ولیمے میں ہم نے بھی شرکت کی تو معلوم ہوا کہ دلہن ثمرین عدیل نقوی کے ساتھ ان کی امی، نانی، کزنز سب ہی پاکیزہ کی اور ہماری مداح نکل آئیں...... اس تقریب میں ہماری بہت سی مصنفات نے شرکت کی۔ جن کے نام یہ ہیں...... ثریا انجم، رضیہ مہدی، شگفتہ شفیق، سیمارضا، سائرہ غلام نبی، شائستہ عزیز اور ہمیں اپنی بہت سی مصنفات کی غیر حاضری بے حد محسوس ہوئی...... پیاری نگہت آپ کو اور آپ کی فیملی کو بیٹے کی شادی اور اس کی خوشیاں مبارک ہوں، آمین۔

☆معروف براڈ کاسٹر اور ادیب قمر علی عباسی کی تحریروں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق نے ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا جس میں...... قمر علی عباسی کے مداحین نے شرکت کی اور انہیں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے ایشیا کا سب سے بڑا سفر نامہ نگار قرار دیا۔ اس تقریب میں ہم نے بھی شرکت کی اور قمر علی عباسی کی تحریروں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور عین اسی دن آرٹس کونسل میں بھی ایک تعزیتی تقریب منعقد ہوئی جس میں مایہ ناز ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی اور قمر علی عباسی کی شخصیت اور تحریروں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

☆اس ماہ پاکیزہ کے بے شمار قارئین نے (جن کے نام لکھے نہیں جاسکتے) ٹیلی فون پر ہم سے قمر علی عباسی کے انتقال پر تعزیت کی...... کہ وہ پاکیزہ کے ساتھ وابستہ تھے...... اور قارئین کے دلوں میں رہتے تھے۔

☆ہماری مایہ ناز مصنفہ اختر شجاعت کی اولین مگر خوب صورت ترین کتاب ذکر صالحین شائع ہوگئی ہے جس کا انتساب سرور کونین آقائے دو جہاں ﷺ کے نام ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر جہاں آگاہی کے در روشن ہوں گے وہاں دلی طمانیت بھی محسوس ہوگی کہ یہ کتاب ایسے پھولوں کا گلدستہ ہے جس کی خوشبو سے روح تک مسحور ہوجائے گی یوں تو اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف پانچ سو روپے ہے مگر آپ یہ کتاب اپنی استطاعت کے حساب سے بھی حاصل کرسکتی ہیں کہ اختر شجاعت کا یہ کتاب شائع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے فون کیجیے۔ 03632342678۔ 36616714 یا خط لکھیے۔ اختر شجاعت۔ 3-d,16/3 ناظم آباد، کراچی۔

☆ہماری پیاری مصنفہ لبنیٰ عروج کی فیملی کے حوالے سے کچھ خبریں۔ لبنیٰ کی پیاری بیٹی منیٰ ظفر کی شادی عاطف میر کے ساتھ عید کے دوسرے دن ہو رہی ہے۔ یہ رخصت ہو کر دبئی جائیں گی۔ (دلی مبارک باد) لبنیٰ کے لاڈلے بیٹے محمد اطیب ملک کا نکاح ماریہ اقبال کے ساتھ ہوگیا ہے۔ اطیب کے لیے یہ لڑکی لبنیٰ عروج نے اپنے آخری ایام میں پسند کی تھی۔ لبنیٰ عروج کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد اسامہ ملک KESE میں منیجر الیکٹرک کے عہدے پر فائز ہوگئے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆پاکیزہ کی مستقل قاری افشین شاہد، جدہ نے گزشتہ دنوں لبنیٰ عروج کے نام کا عمرہ ادا کیا۔ (جزاک اللہ)

☆پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر تہمینہ اپنے دوست واقارب کی شادیوں میں شرکت کرنے کے لیے لندن سے پاکستان آرہی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ہماری پیاری مصنفہ سلمیٰ غزل اپنے بچوں کے پاس کراچی سے امریکا جارہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار رفعت مبین رفی نے امریکا میں اپنا قیام بڑھالیا ہے۔

☆پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار انجم گلزار نے ان دنوں قرآن پاک کی کتابت شروع کررکھی ہے اور ماشاء اللہ دو پارے کتابت کرچکی ہیں۔ (مبارک باد)

☆پاکیزہ کی تبصرہ نگار تسنیم ماہ پارہ ان دنوں کوکنگ چینل پر مزے مزے کے کھانے پکاتی نظر آرہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆موسمِ گرما کی تعطیلات میں ہماری مصنفات، تبصرہ نگار بہنیں سیر و تفریح میں مصروف ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆مصنفہ رفاقت جاوید ان دنوں گلگت گئی ہوئی ہیں۔

☆شاعرہ اور افسانہ نگار نسیم ناز صدیقی اپنے شوہر کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔

☆مستقل تبصرہ نگار ثمینہ وحید، لندن جانے کا پروگرام بنارہی ہیں۔

☆شاعرہ اور تبصرہ نگار مسز شمع حسین کینیڈا سے لاہور آرہی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆شاعرہ اور افسانہ نگار عظمیٰ آفاق سعید اپنی فیملی کے ساتھ ان دنوں ملائشیا گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆شاعرہ سارہ سید اپنی فیملی کے ساتھ کراچی سے مری گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆فرزانہ شعیب، سوات کی طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ (الحمدللہ)

☆پاکیزہ کی مستقل قاری رعنا شاہ کی منگنی سجاد شاہ سے لاہور میں ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)

☆تبصرہ نگار اور شاعرہ فائزہ شہزاد ہنوز بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆تبصرہ نگار ڈاکٹر میمونہ غوری ہنوز بسترِ علالت پر ہیں، ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ہمارے قارئین کی ایک بڑی تعداد امینہ عندلیب، سیالکوٹ والی کی بیماری کے بارے میں بے حد متفکر ہے اور اس ماہ میرے پاس بلاشبہ بے شمار فون آئے ہیں تو آج میں آپ کو بتارہی ہوں کہ یہ بہادر لڑکی کئی سالوں سے معدے کے کینسر کا مقابلہ کررہی ہے اور انشاء اللہ جیت اسی کی ہوگی۔ امینہ عندلیب کی کلی صحت اور زندگی کے لیے تمام قارئینِ پاکیزہ سے استدعا ہے...... وہ قارئین جو عمرے اور حج کی سعادت حاصل کرنے جارہے ہیں ان سے بھی دردمندانہ اپیل ہے کہ اپنی اس بہن کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ (نوازش)

☆معروف شاعرہ یمنیٰ احمد کی بہن حنا عروج کے لیے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

☆پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر کراچی شدید بیمار ہیں ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری خیر النساء کے بھائی شدید بیمار ہیں، ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ گزشتہ دنوں جناب و بیگم ایوب احمد صدیقی کی بیٹی اور مسز یاور کی بہن سنبل ایوب کی شادی سید مزمل حسن کے ساتھ ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ (مبارک باد)

☆ محترمہ کرن نذیر ان دنوں امریکا میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں ان کا موضوع پاکستان کی مصنفات اور ٹی وی چینلز میں کام کرنے والی خواتین ہیں، اس سلسلے میں وہ کراچی آئیں تو پاکیزہ کے آفس بھی گئیں اور ہمارے گھر بھی آئیں۔ (پاکستان میں خوش آمدید)

☆ معروف مصنفہ رضوانہ پرنس کے پاکیزہ میں شائع ایک افسانے کی ٹیلی فلم خاموش محبت بے حد مقبول ہو رہی ہے اور رضوانہ ان دنوں خوب تعریفیں وصول کرتی نظر آ رہی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ گزشتہ دنوں نیو شاعرہ کلب جوہر ٹاؤن، لاہور میں نئی نسل کی معروف شاعرہ فریدہ خانم کی کتاب مختلف کے اعزاز میں ایک تقریب بھی ہوئی اور محفلِ مشاعرہ بھی...... جس کی صدارت نذیر قیصر نے کی۔ فریدہ خانم آپ کو بے حد مبارک باد۔

☆ بالآخر ہمارے کہنے پر صبا نور، لیہ نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دے ہی دیا ہے اور انشاء اللہ وہ پاس بھی ضرور ہوں گی کہ ان کے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی ایک بار پھر شدید بیمار ہیں۔ اس کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ اسے صحت اور زندگی دے، آمین۔

انتقالِ پُر ملال

☆ گزشتہ ماہ ملتان کی معروف شاعرہ فصیحہ آصف خان کی خالہ، خالو اور تایا انتقال کر گئے۔

☆ معروف مصنفہ اور شاعرہ سویرا ملک، کراچی کی والدہ خالقِ حقیقی سے جاملیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نوشابہ رئیس کے شوہر رئیس الدین انصاری، لاہور طویل علالت کے بعد چل بسے۔

☆ نوٹ: تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کی دعا کریں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

✍ دعا احمد، اسلام آباد سے۔ ''قیصرہ حیات صاحبہ کا ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل بہت ہی شاندار جا رہا ہے ساتھ ہی عنیزہ سید کا شامِ شہر یاراں بھی کسی سے کم نہیں جناب! افسانے بھی بہترین تھے ابھی تک جو پڑھے گئے۔ فسانہ نہیں حقیقت ہے میں دانش نواز سے مل کر ہمیشہ کی طرح بہت مزہ آیا۔ جلترنگ میں نے جب پڑھا تو مجھے خود سے ہنستے دیکھ کر میرے بچے حیان، معد اور فردان تھوڑی دیر کے لیے ڈر گئے کہ مما جانی کو کیا ہوا مگر اگلے پل وہ بھی میرے ساتھ قہقہے لگانے میں شامل تھے میرے بچوں کی عمریں بالترتیب 8,4,2 سال ہیں مگر بے حد حساس ہیں۔ بہنوں کی محفل میں دردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ کو پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ دردانہ نوشین کا ایک خط جو انہوں نے مجھے 6 سال پہلے لکھا تھا آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور جب بھی وہ خط کھول کر پڑھتی ہوں تو دنیا میں اچھے لوگوں کی موجودگی کا احساس شدید ہو جاتا ہے اسی طرح دھنک علی، اسلام آباد بھی بڑی اچھی دوست ہیں۔ امینہ عندلیب، سلانوالی کے بارے میں پڑھ کر صدقِ دل سے ان کی کلی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ معراج رسول صاحب، فائزہ شہزاد، شہناز، کراچی سبھی کے لیے بہت دعائیں اللہ پاک ان سب کو صحت کلی عطا فرمائے۔ (آمین) رضوانہ پرنس آپ کی یاد بہت آتی ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ...... رضوانہ پرنس کہہ رہی ہیں اگر یاد کرتی ہو تو کراچی آ کر مل لو)

✍ مسرت رانی، خلیل کراچی سے۔ ''پاکیزہ تو ہمارا دل پسند رسالہ ہے عرصہ ہو گیا پڑھتے پڑھتے اس میں انجم باجی کے اداریے سے لے کر آخر تک معلومات، تفریح اور اچھی باتوں کا خزانہ ہوتا ہے۔ مجھے تو اس میں شامل کوئشنز اور مراسلات بھی بہت پسند آتے ہیں آپ لوگ واقعی دل و جان سے محنت کرتے ہیں اور ہم قارئین کو بہتر سے بہتر مواد فراہم کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ آپ کے پورے ادارے اور تمام اراکین کے لیے نیک خواہشات...... انجم باجی کا جلترنگ تو بہت ہی لطف دیتا ہے اور آپ نے جو انٹرویوز کا سلسلہ رکھا ہے وہ بھی بہت اچھا ہے محترمہ انجم انصار صاحبہ کا انٹرویو دلوا دو وہ آئے بزم میں

کی نزہت اصغر کا انٹرویو بھی ضرور لگائیں۔ آپ سب کے بارے میں لکھتی ہیں تو اپنے بارے میں بھی ضرور بتائیں۔ مجھے تو پاکیزہ کا ایک ایک لفظ عزیز ہے امید ہے آپ ان فرمائشوں پر غور فرمائیں گی۔ ایک بات اور کہتی چلوں کہ مدیرہ اعلیٰ محترمہ عذرا رسول صاحبہ جس محبت کا اظہار اپنے قارئین اور رائٹرز سے کرتی ہیں تو ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ میری ڈھیر ساری دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔'' (پیاری مسرت یہ آپ کی ہم سے محبت ہے ورنہ پاکیزہ میں ہمارے بارے میں کوئی بات بھی پوشیدہ تو نہیں ہے)

✍ ثوبیہ طہور، ضلع اٹک سے۔ ''آپ کا بہت شکریہ باجی کہ ٹیلی فونک گفتگو کو بھی برابر کی اہمیت دیتی ہیں۔ میں ان بہنوں کو سراہتی ہوں جو باقاعدگی سے خط ارسال کرتی ہیں کسی زمانے میں میری والدہ تبصرہ لکھا کرتی تھیں اب تو خیر وہ حیات نہیں اور اب ہم خطوط وغیرہ سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ ماہ جون میں چھپنے والی نصرت شمشاد کی کہانی ناک آؤٹ اچھی تھی۔ مختصر سی کہانی میں کافی بڑی بات کہہ گئی نواسی، سعدیہ رئیس نے درست لکھا بعض دفعہ اچھی بہو کو بھی لوگ برا ہی سمجھتے ہیں چاہے وہ گھر کی عزت کا گھر والوں سے زیادہ دھیان کیوں نہ رکھے۔ جگنو کی شادی، صائمہ قیصر نے خوب کروائی۔ مجھے صائمہ قیصر کی لائٹ انداز کی تحریریں بہت پسند ہیں اس کے علاوہ بہنوں کی محفل تو ہوتی ہی مزیدار ہے آپ کافی معلومات دے دیتی ہیں۔'' (نوازش)

✍ نفیسہ آرا، دبئی سے۔ ''اداریے میں لکھی عام باتیں... بہت ہی بہت خاص لگتی ہیں۔ آپ کی اس بات سے میں سو فی صد متفق ہوں کہ اپنے دل کی بات دوسرے کے نام سے لگا کر کہنے کا رواج بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ یہاں ہر کمیونٹی کے لوگ ہیں مگر خواتین لگتا ہے تمام عالم کی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرنے والی...... سب سے پہلے سلسلے وار ناولز کی بات ہو جائے۔ عنیزہ سید کی اس قسط سے کردار واضح ہوئے ہیں۔ رفعت سراج بھی کچھ آگے بڑھی ہیں اور قیصرہ حیات نے حمنہ کی موت سے اداس کر دیا۔ آزر کا انجام بھی برا ہونا چاہیے۔ نزہت جبیں ضیا نے مختصر ترین کہانی لکھی مگر بہت بڑا پیغام دیا کہ ہمیں بڑھاپے میں اپنے والدین کی زیادہ دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ سادہ سی کہانی نزہت نے اچھی لکھی۔ دانش نواز سے ملاقات ملی جلی رہی ان کی بیگم کی بھی تصاویر ہوتیں تو پورا افسانہ ہوتا اس کے علاوہ مستقل سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ [illegible] کم ہو گئے۔ کھانے کی ڈشز بھی موسم کے اعتبار سے تھیں۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ دانش کی بیگم مصروف تھیں ان سے ملاقات کا احوال بھی آپ جلد پڑھیں گی)

✍ سکینہ فرخ، کراچی سے۔ ''انجم آپا، عذرا رسول اور دیگر ارکان میری نیک تمنائیں اور پُر خلوص دعائیں آپ کے اور آپ کے ادارے کے ساتھ ہیں جو قارئین میری تحریریں پسند کرتے ہیں ان سب کا بے حد شکریہ۔ انجم آپا کا خلوص اور ادارے کے تمام اراکین کی محنت صاف نظر آتی ہے۔ پاکیزہ سے ہمارا رشتہ محبت کا ہے۔ عذرا رسول صاحبہ کا اخلاق اور محبت متاثر کن ہے۔ نزہت اصغر سے فون پر بات ہوئی بہت اچھا لگا آپ سب ہی اپنے رائٹرز اور قارئین کو بہت پیار اور عزت دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں پاکیزہ ایک فیملی کی طرح لگتا ہے۔ میری دعا یہ ہے کہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ اس کے تمام سلسلے اچھے لگتے ہیں قسط وار کہانیاں بھی بہت اچھی جا رہی ہیں۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ادارے کے ساتھ رہیں گی۔'' (اور آپ جیسی محبت کرنے والی بہنوں کا ساتھ بھی شامل رہے آپ سب کی خوشیوں کے لیے دعا کرتی ہوں)

✍ ایک نامعلوم قاری، اسلام آباد سے۔ ''ماہ مئی میں چھپنے والی نوشین ناز اختر کی کہانی احسان تیرا نے بہت متاثر کیا...... اور اس میں کچھ حقیقت جھلکتی نظر آئی دیگر کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ آپ کے رسالے میں روزمرہ زندگی کی کہانیاں اور اپنے اردگرد بسنے والوں کے حال احوال کہانی کی صورت لگتے ہیں۔ جبھی ان سب میں سچائی نظر آتی ہے۔ بہرحال آپ کے رسالے کا ایک نام ہے۔'' (پیاری گڑیا آئندہ اپنا نام سب سے پہلے لکھنا کہ ہم بے نام خطوط شامل نہیں کرتے۔ ہاں اس محفل میں خوش آمدید)

انتقالِ پُر ملال

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ کارکن جناب رضی الدین مشیتِ ایزدی سے انتقال کر گئے۔ ہم ان کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔

✍ نگہت آصف، اسلام آباد سے۔ ''آپ کا بے حد شکریہ کبھی کبھار اشعار لگا دیتی ہیں اس کے علاوہ میں مراسلات بھی بھیجتی رہی ہوں، وہ کم لگتے ہیں۔ کہانی لکھنے کی ہمت اور صلاحیت نہیں ہے البتہ تمام رائٹرز کی کہانیاں شوق سے پڑھتی ہوں کسی شمارے میں سکینہ فرخ کی کہانی ساس، بہو کے موضوع پر پڑی تھی بہت اچھی طرح اس مسئلے کا حل بتایا گیا مگر اس کے لیے برداشت بہت ضروری ہے۔ سالگرہ نمبر 2 وردانہ نوشین کی کہانی بھی بہت اچھی تھی آج کل یہ مرض بہت عام ہو رہا ہے اس کہانی کے ذریعے کافی لوگ ہمت پکڑ سکتے ہیں۔ شہناز وسیم نے بال وپر بڑے مزیدار انداز میں لکھی۔ کیا یہ نئی رائٹر ہیں؟'' (شہناز وسیم ہماری ایک سینئر رائٹر ہیں)

✍ نسیم نیازی، لاہور سے۔ ''وردانہ نوشین خان جی آپ واقعی اس محفل میں آکر اپنی بہت سی پرانی پڑھنوں سے وقتاً فوقتاً ملتی رہیں گی اور خوش ہوتی رہیں گی۔ ویسے یہاں بھی ہم آپ کی اچھی اچھی تحریروں کے منتظر رہیں گے۔ سب سے پہلے امانت کے بارے میں...... واقعی فی الحال رفعت سراج کی سابقہ تحریروں کا ساسحر قائم نہیں ہو پا رہا ہے، نئے دور میں اک پرانی سی کہانی کے تانے بانے بنے نظر آرہے ہیں ہوسکتا ہے آگے چل کر کہانی میں بہتری کے آثار دکھائی دے جائیں۔ سائرہ رضا پاکیزہ میں بہت اچھا اضافہ ہیں کیونکہ وہ تو آئی ہیں اور چھائی ہیں ٹھا کر کے بہت اچھا لکھ رہی ہیں جس کے باعث ان کی ہر تحریر ٹھا کر کے من میں اترتی ہے۔ اس مرتبہ صائمہ اکرم کی بنت حوا عام سی تحریر ہو کر بھی بہت خاص لگی کہ اینڈ بہت اچھا تھا ورنہ عموماً کہانیوں کی ہیروئنز کو نیک پروین بننے کا بہت شوق ہوتا ہے ہیروں کے آنسو دیکھ کر محترمائیں عموماً موم کے مانند پگھل جاتی ہیں مگر بنت حوا کی حریم نے بہت درست فیصلہ کر کے کہانی کے اینڈ میں جان ڈال دی گڈ...... جی ویسے تو آپ سے ملاقات کا ہمیں بہت شوق تھا۔ آخر آپ ہماری ڈھول والی سرکار تھیں جگنو کی شادی بھی ایک چلتی پھرتی اچھی تحریر تھی۔ شکر ہے جگنو کے والدین کو اینڈ میں سمجھ آ گئی۔ پاپا کچھ خاص متاثر نہیں کر پائی۔ ناک آؤٹ ان بزرگ خواتین کے لیے اک اچھی کوشش رہی جو اپنی بیٹیوں کے لیے اچھا، اچھا سوچتی ہیں اور پرائی بیٹیوں کے لیے برا، تو اسی کے جواب تے نانی کو ٹھیک ناک آؤٹ کیا۔ اک پل مختصر سی تحریر مگر جاندار رہی کوئی ایک بھی اس اک پل کے سحر میں آکر سنور جائے تو اس کی دنیا اور آخرت ... سنور جائے گی۔ اک آزمودہ وظیفہ برائے شادی (میرا نہیں) البتہ بہت سی بہنوں کا جن سے میں خود واقف ہوں، ماہ رمضان کی... 11,12,13 کی شب عشا کی نماز کے اور تراویح کے اہتمام کے بعد بارہ نفل دو دو کر کے ہر نفل میں الحمد کے بعد 12 مرتبہ سورہ قل ھو اللہ احد پڑھنی ہے اور اس طرح بارہ نفل پڑھنے کے بعد بہت خشوع وخضوع کے ساتھ 100 مرتبہ درود ابراہیمیؑ پڑھ کر لڑکی خود یا امی دعا کریں انشاء اللہ دوسرے رمضان تک مراد بر آئے گی۔ باقی بہنوں سے گزارش ہے کہ ماہِ رمضان میں نمازِ تہجد کا خصوصی اہتمام کریں۔ رمضان کی لوٹ سیل عبادتوں کا جی بھر کر مزہ لیں۔ (بے شک) اور پاکیزہ کی جو بھی بہن ماہ رمضان میں عمرے کے لیے جائے سب پاکیزہ بہنوں کے لیے خصوصی دعائیں کریں کہ اللہ ہم سب کی حاضری بھی لگوائے۔ بار بار بار لگوائے۔ کسی بھی بہن کے پاس دیمک سے نجات کا کوئی ٹوٹکہ ہو اور سرخ چیونٹی سے نجات کا بھی ہو تو ضرور بتائیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ سیدہ علیشاہ، بہاول پور سے۔ ''آپ کے قلم سے لکھا گیا مجھے کچھ کہنا ہے کا ہر لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے سچ ہے آنٹی جھوٹ آج ہم سب کے خون میں شامل ہو چکا ہے۔ اللہ پاک ہمیں معاف فرمائے۔ (آمین) اب بات ہو گی شام شہر یاراں کی...... ناول اچھا ہے مگر کرداروں کی بھرمار ہے، زرنگار ہی میرال ہے یہ تو طے ہے۔ امانت بھی اچھا جا رہا ہے لیکن کہیں دیپ جلے کہیں دل میں اب کوئی چارم نہیں رہا۔ سوری قیصرہ جی آپ کی پہلے لکھی گئی تحریروں میں یہ مس فٹ لگتی ہے۔ وہ اک پل، نوری، فیصلے زندگی کے، اک خواب تم بھی ہو، تینوں اچھے لیول کی گڈ اسٹوریز تھیں مگر نزہت جبیں کی پاپا بہت ہی معصوم سی اسٹوری لگی۔ مکمل ناول دونوں ہی لاجواب تھے۔ اک چومی صائمہ آپی کے لیے میری طرف سے ناک آؤٹ اور گھر کی عزت ابھی پڑھ نہیں سکی۔ دین کی باتیں پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ اور سندیسے رہے ہمیشہ کی طرح عمدہ! اور جلترنگ میں خود کو پہچانیے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ بہنوں کی محفل اچھی مگر شارٹ سی لگی اور ہاں میرا انتخاب کی چھٹیاں شاید ختم ہو گئیں اسی لیے نظر آیا دوبارہ سے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ سعدیہ مریم، گولاڑچی سے۔ ''پاکیزہ واقعی پاکیزہ ہے، کافی عرصے کے بعد اس نوری پاکیزہ کا ساتھ نصیب ہوا،

مہینے کے آخری عشرے میں اوائل دنوں میں ہی شمارہ ہاتھوں میں آیا، بہت اچھا لگا ٹائٹل ایک دم ہٹ رہا، ویسے مجھے کبھی کبھی کسی رسالے کا ہی ٹائٹل پسند آتا ہے، ڈریس اچھا تھا کیونکہ میرے دماغ میں ایسا ڈریس بنانے کا پہلے سے ہی آئیڈیا تھا، خیر، عنیزہ سید کا نام ہی اعتماد کا ہے، میں نے انہیں کافی کم پڑھا ہے مگر بہت اچھا پایا ہے اللہ تعالیٰ ان کو صحت و تندرستی عطا فرمائے آمین، عمیرہ احمد کا ناول عکس کیا کتابی شکل میں شائع ہوا؟ بہنوں کی محفل تو بہت اچھی لگی، یوں لگ رہا تھا جیسے یہ خواتین کا پارلیمنٹ ہاؤس ہو یا خواتین کانفرنس، مجھے سب سے اچھا سلسلہ یہی لگتا ہے جہاں ہر کسی کے دل کی آواز پہنچتی ہے، ساجدہ حبیب کا انٹرویو دل شاد کر گیا، پاک فوج سے تو ہمیں عشق ہے اور آپا آپ پاک فوج پر لکھتی ہیں اس لیے ہمیں آپ سے بھی محبت ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ عذرا کنول، ڈیرا غازی خان سے۔ ''شامِ شہر یاراں، میں عنیزہ سید بڑی خوب صورتی سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں، قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی انتہائی دلچسپ موڑ اختیار کر گیا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ آزر، یمنیٰ کے ساتھ دوستی کا ڈراما رچا رہا ہے۔ ویری ویل ڈن قیصرہ جی۔ رفعت سراج کی امانت، اپنے طرز کی ایک منفرد کہانی ہے۔ اس میں مجھے برہان کا کردار بہت اچھا لگا۔ معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی کافی جاندار کہانی ہے۔ ناولٹ، آگہی کا ایک پل، جس میں سائرہ رضا نے دل جیت لیا۔ ویری ویل ڈن، سائرہ جی! افسانہ، اس شب کی سحر نہیں، میں رضوانہ پرنس نے تو رلا ہی دیا۔ وہ سین تو بار بار میری آنکھوں میں آسماتا ہے جب دھماکے کے بعد عباد کو نمرہ کا ہاتھ ملتا ہے، وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ آپ یقین جانیں آنسو خود بخود میری آنکھوں سے امڈے چلے آرہے تھے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اس کہانی کی کیا تعریف کروں، رضوانہ پرنس صاحبہ آپ نے تو دل چھو لیا۔ دعائے خیر، میں رفاقت جاوید نے بھی دل جیت لیا۔ حقیقت پر مبنی ایک اچھوتی کہانی تھی۔ اس کے بعد دل تھام کر بہنوں کی محفل میں جا گھسی جہاں شہزادیوں سے مل کر دل باغ باغ ہو گیا۔ انجم باجی! آپ نے اپنے دل کا مشورہ مان کر سب کے دل خوش کر دیے۔ تمام بہنوں کے تبصرے اچھے تھے۔ خصوصاً فصیحہ آصف، شمیم فضل خالق اور سعدیہ رئیس کے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ عائشہ خالد، میر پور خاص سے۔ ''سب سے پہلے تو معذرت ایک سال کی لمبی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں، خیر پاکیزہ کبھی بھی اگنور نہیں ہوا۔ ہمیشہ ہر حالات میں زیرِ مطالعہ رہا کہ کافی ٹینشن کی دوا بھی ہے اور کچھ تحریریں رلا کر دنوں یاد رہتی ہیں۔ عکس کا اسٹارٹ سے اینڈ تک کا سفر بہت اچھا رہا۔ اب تبصرہ اس ماہ کے پاکیزہ پر اس ماہ کے ڈائیلاگ کے حساب سے سب سے اچھی تحریر بنت حوا تھی۔ روایتی اینڈ بھی نہیں تھا۔ فیصلے زندگی کے ایک اچھی مگر پرانی سی تحریر تھی کہ وہ ہی ایک بہن پسند کرے دوسری شادی کرے۔ ناک آؤٹ بہت چھوٹی مگر بہت ہی سبق آموز، پاپا بھی سو سو تھی، بے گمان لمحے جیسی بہت سی کہانیاں سچی تحریروں جیسے کہانیوں میں آتی ہیں اور اب یہ خط لکھنے کی وجہ جو تحریر بنی وہ سیما یاسمین مجتبیٰ کی نوری تھی۔ سیما پلیز مائنڈ نہیں کرنا مگر لاسٹ منتھ کے سرگزشت میں بالکل ایسی ہی سچ بیانی آئی تھی۔'' (اس سلسلے میں، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ سیما کی یہ کہانی ہمارے پاس کافی عرصے سے رکھی ہوئی تھی اور سیما جیسی سینئر رائٹر کی کہانی کی تھیم تو کسی سے مل سکتی ہے مگر وہ کسی کی کاپی کیوں کریں گی کیا وہ لکھنا نہیں جانتیں)

✍ سنبل ملک، لاہور سے۔ ''گلہ شکوہ اپنوں سے ہی انسان کرتا ہے نہ کہ غیروں سے؟ میں غور سے ہر ماہنامے کو پڑھتی ہوں۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ ہر قاری، تبصرہ نگار آپ کے لیے اہم ہے ساجدہ حبیب آنٹی کی پُر کیف گفتگو بالکل پُر کیف تھی۔ آنٹی آپ کا سرزنش کرنے کا انداز اچھا لگا۔ امانت مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے آنٹی رفعت آپ کو بہت مبارک، اللہ پاک نے آپ کو بہت زرخیز ذہن عطا فرمایا ہے۔ شامِ شہر یاراں، عنیزہ سید، کا بھی گڈ ویری ویری گڈ...... آنٹی رضوانہ پرنس آپ تو چھا گئی ہیں۔ شمیم فضل خالق کی چھوٹی سی بات، محبت تمام شد قانتہ رابعہ کی تحریر پسند آئی۔'' (شکریہ)

✍ شبنم کنول، حافظ آباد سے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں آپی آپ نے میرا ایک شعر تو شائع کیا غزل اور خط شائع نہیں کیا، کیا میری غزل اچھی نہیں تھی خیر آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں آپ نے میرا شعر شائع کر کے مجھے پاکیزہ کی پکی دوست بنا دیا ہے۔ بہت بہت شکریہ میں کہانیاں بھی لکھ کر بھیجنا چاہتی ہوں۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل بہت اچھا ہے کہ کہانی بہت اچھے موڑ پر آگئی ہے سب بہت ہی اچھا لکھتے ہیں۔'' (شکریہ)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ”پاکیزہ سا سرورق خوب صورت آنکھوں سمیت دل میں اتر گیا۔۔۔ خوب صورت آنکھیں میری کمزوری ہیں۔ اب یہ پتا نہیں چل سکا کہ لینس کا کمال نہ ہو کہیں۔ ہم سب نہ چاہتے ہوئے دن میں کئی بار جھوٹ بولتے ہیں۔ کبھی عادتاً تو کبھی مصلحتاً، یا ضرورتاً بہر حال اس سے پرہیز از حد ضروری ہے، آپ کی باتوں میں یقیناً اثر ہے تو سمجھیں پچاس فیصد بولنا چھوڑ دیں گے۔ (وعدہ کرو بہنو) بصیرت افروز مضامین کے بعد امانت کی جانب دوڑے، بعض جگہوں پر فلمی اسٹوری کا گمان ہوا۔ میں عالیہ صاحبہ سے متفق ہوں کہ رفعت کی یہ تحریر ان کی سابقہ تحاریر سے خاصی مختلف ہے پھر آپ کی بات کہ مزہ آئے گا، چلیں انتظار کرتے ہیں، واہ جی کیا بات ہے، عنیزہ سید کی شامِ شہر یاراں میں ایک ساتھ کئی کہانیاں چل رہی ہیں اور ہر کہانی کا اپنا ایک الگ لطف ہے، راز کی بات بتاؤں؟ زرنگار ہی میرا ل ہے، دیکھ لیجیے گا زدی حسین کا کردار معصوم سا ہے دانیال کو شوق مہنگا پڑا۔ مجموعی طور پر یہ تحریر جاندار و شاندار ہے۔ ناک آؤٹ بھنے والی تحریر تھی۔ وہ ایک پل رُلا گیا ویسے اس بار ماں کے موضوع پر تحاریر تھیں۔ ماں نمبر بھی نکالیے ناں؟ نوری کے ساتھ برا ہوا، شوہر فلوق ہی عجیب ہے، ہے ناں؟ اسما قادری کی بے گماں لمحے، بالکل پسند نہیں آئی، حقیقت سے بے حد دور اور بے مزہ تحریر رہی، فیصلے زندگی کے پسند آئی، بنت حوا اپنی مثال آپ رہی۔ صائمہ نے خوب لکھا، دانش نواز کی باتیں مسکرانے پر مجبور کرتی رہیں۔ باجی مجھے ریشم کی طرف سے بیسٹ رائٹر کا ایوارڈ ملا ہے، عظمیٰ خورشید صاحبہ کو دیکھ کر مسرت ہوئی، اینہ عندلیب، اللہ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے۔“ (بہت بہت مبارک ہو)

شیریں ظفر، ملتان سے۔ ”دانش نواز کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ افسانے اس بار بھی سپر کلاس تھے۔ سدرۃ المنتہیٰ کا اک خواب تم بھی ہو، صائمہ قیصر کا ناولٹ جگنو کی شادی، سلمیٰ غزل کی فیصلے زندگی کے۔ اسما قادری کا مکمل ناول بے گمان لمحے بن ما یک پر پہلے بھی ایک دو ناول لکھے جا چکے ہیں مگر یہ بھی اچھی کوشش تھی بور بہت نہیں ہوئی مگر آخری صفحے پر ناول کے اختتام ہم جو ۔ صورت جملوں نے وزن ۔۔ لیا جو کہ ناول کی جان تھے۔ جس کے خلوص کا یقین ہوا اسی سے شکوہ شکایت نہیں کرتے۔ زبردست بات، صائمہ اکرم چوھدری نے بھی۔ بنت حوا لکھا اور خوب تھا۔ اکثر تحریریں بے جا طوالت لیے ہوتے ہیں، صائمہ اکرم لکھتے لکھتے قلم پر گرفت آ ہی گئی۔ بنت حوا الفاظ کا چناؤ، ماحول کی سیٹنگ، ہیرو، ہیروئن کے مکالمے واقعات اور اتفاقات دائیں بائیں جھولتے ہوئے نہیں تھے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... کالا شاہ کالا بھی اچھا لگا تھا مگر بنت حوا نمبر ون...... پاپا، نزہت نے بزرگوں کے رویّے اور ڈیمانڈ کی صحیح ترجمانی کی وہ ایک پل روشانے نے ماں کی قدر ایک بار پھر دل میں اجاگر کر دی۔“ (شکریہ)

سامعہ تبسم، ملتان سے۔ ”اداریہ، افسانے، خصوصی مضامین، مستقل عنوانات، سبھی اے ون تھے۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی سپر تھا۔ باجی آپ کچھ انعامی سلسلے بھی رکھیں، اس میں مقابلے کی وجہ سے بہتر سے بہت چیز کی تلاش رہتی ہے۔ امید ہے اس پر آپ ضرور غور فرمائیں گی۔ جلترنگ تو ہر دفعہ مزہ دے جاتا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

اقبال بانو، وہاڑی سے۔ ”جولائی کا پاکیزہ آیا تو سب سے پہلے انجم تمہارا افسانہ متاعِ جاں پڑھا اور جیسے جیسے میں افسانہ پڑھتی گئی میں ذہنی طور پر اسی ماحول میں پہنچ گئی جیسے کہا جاتا ہے کہ مغرب کے وقت بلایات اترا کرتی ہیں اور مغرب سے پہلے پہلے گھر میں آجانا چاہیے اور اب ایسا ہی لگ رہا ہے کہ ایسی ہی بلایات ہر طرف گھوم رہی ہیں اور لوگوں کو نگل رہی ہیں۔ انجم اگر یہ افسانہ پڑھ کر دس لوگ بھی محتاط ہو جائیں تو تمہارے افسانہ لکھنے کا مقصد پورا ہو گیا...... یہ بات میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ اس کے بعد کچھ پڑھا ہی نہیں گیا۔ اتنی سچائی سے ایک تلخ حقیقت لکھنے کا شکریہ۔ دل چاہ رہا ہے کہ تمہارے ہاتھ چوم لوں۔“ (نوازش)

عصمت، لاہور سے۔ ”میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں۔ اکثر رابطے میں بھی رہتی ہوں۔ پاکیزہ لے کر آئی تو فہرست میں آپ کا افسانہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا اور جب افسانہ پڑھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ واقعہ کس طرح رونما ہوا، مجھے نہیں معلوم مگر آپ نے اسے جس طرح لکھا ہے، وہ لفظوں سے ایک سچ کی اتنی صاف تصویر کھینچی ہے جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ آپ پاکیزہ میں ہمیشہ لوگوں کو نیکی کی طرف راغب کرتی ہیں اور اچھی باتیں بتاتی ہیں۔ یقیناً یہ افسانہ بھی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو پوری رات گھوما کرتے ہیں۔ پلیز اب سب محتاط ہو جائیں کہ سڑکوں پر بھیڑیے دندناتے پھر رہے ہیں اور انہیں نہ کوئی مارنے والا رہا ہے اور نہ ہی کوئی پکڑنے والا۔“ (اللہ تعالیٰ ہماری انتظامیہ کو نیک توفیق عطا فرمائے)

مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”جولائی کا پاکیزہ دلہن نمبر کے طور پر بے حد پسند آیا۔ ٹائٹل کی دلہن سے زیادہ خوب صورت دلہن بنی بنیش لگ رہی تھیں۔ دلہنوں کے البم کی تصاویر قدرے بڑی ہونی چاہیے تھیں۔ سروے، انٹرویوز سب دلچسپ تھے۔ بہنوں کی محفل، جلترنگ، دیگر مستقل سلسلے عمدہ تھے مگر بات ہو جائے متاعِ جاں کی جب اس کو پڑھا تو اسی کے مکالمے کانوں میں گونجتے رہے۔ بیوی کی قربانی کو سلام، ایک عورت نے سارے گھر کو بچا لیا۔ بالکل صحیح فیصلہ کیا اس نے اور سب سے بڑھ کر آپ کا شکریہ ایک سچی کہانی کو تو آپ نے فلم بنا دیا کہ پڑھتے ہوئے اس کے کردار صاف نظر آرہے تھے۔ یقیناً اس کہانی کو پڑھ کر بہت سے خاندانوں کو سبق حاصل ہو گا کہ راتوں کو یوں مارے مارے نہیں پھرنا چاہیے ورنہ مارے جاتے ہیں۔“ (بے شک)

ارم احتشام، ملتان سے۔ ”دلہن نمبر تو رخصتی نمبر سا محسوس ہوا کہ اس کی کہانیاں پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ بہنوں کی محفل اور جلترنگ پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ ناول اچھے جا رہے ہیں۔ رفعت سراج کی تو میں فین ہوں۔“ (میں بھی ہوں)

پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ ”کافی دنوں کے بعد رابطہ کر رہی ہوں مگر پاکیزہ سے غافل نہیں ہوں۔ متاعِ جاں بہترین تحریر رہی۔ قیصرہ حیات کے ناولٹ کے موڑ بہت اچھے آئے ہیں۔ مجھے شیریں حیدر کی کہانیاں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہنوں کی محفل شاندار رہی۔ جولائی کا شمارہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔“ (شکریہ)

تابندہ جبیں، کراچی سے۔ ”انجم باجی آپ تو بھول گئیں مگر میں آپ کی کورنگی کی شہزادی ہوں۔ شادی اور پھر بچوں کے بعد اس محفل میں لکھنے کے حوالے سے ضرور دور ہوں مگر پڑھنے کے حساب سے اس میں شامل ہوں۔ قمر علی عباسی کی صحت کی ابھی دعا ہی کر رہے تھے کہ ان کی رحلت کی اطلاع آگئی۔ بے حد افسوس ہوا۔ آپ نیلوفر عباسی تک ہماری تعزیت پہنچا دیں۔“ (پہنچائی جا رہی ہے)

انیلا ناہید، لیہ سے۔ ”میرا گھر میں نک نیم نیلو ہے۔ میرے والد ریڈیو بہت شوق سے سنتے تھے انہیں نیلوفر عباسی کی آواز پسند تھی اس لیے ان کی وجہ سے میرا نک نیم بھی نیلو پڑ گیا۔ ہمارا پورا گھرانہ نیلوفر عباسی اور قمر علی عباسی کی تحریروں کا مداح ہے اور پاکیزہ میں ان کے بارے میں مزید جان کر ہمیں وہ بہت اچھے لگتے تھے۔ اب ان کے انتقال کی خبر سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ اس ماہ پاکیزہ میں انجم باجی آپ کا افسانہ پڑھ کر بہت روتی رہی۔ آپ نے ایسی تحریر لکھ کر لکھنے کا حق ادا کر دیا اور بے شمار لوگوں کی آنکھیں کھولی ہیں۔ رفعت سراج کے ناول کی قسط بے حد پسند آئی ہے۔“ (شکریہ)

منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ”جولائی کا پاکیزہ اے ون رہا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ آپ کا افسانہ متاعِ جاں پڑھ کر دل سے بے اختیار دعائیں نکل رہی ہیں کاش وہ عورت واپس مل جائے جس نے اتنی بڑی قربانی دی۔ بہنوں کی محفل اس دفعہ کم سی لگی۔ رفعت سراج کا ناول اچھا گیا ہے۔ ہاں میری جانب سے نیلوفر عباسی کو دلی تعزیت پہنچا دیں کہ قمر علی عباسی کے انتقال کا ہمیں بہت صدمہ ہوا ہے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”بہت عرصے بعد عذرا رسول سے بات ہوئی تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ معراج رسول صاحب کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ محترمہ نیلوفر عباسی سے دلی تعزیت کہ قمر علی عباسی کی رحلت کا از حد افسوس ہوا۔ انجم تمہارا افسانہ متاعِ جاں پڑھ کر تو یوں لگا کہ دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ تم نے سچائی کو بڑی خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ناولوں میں عنیزہ سید کا ناول بہت سارے کرداروں کے باوجود پسند آرہا ہے۔ جلترنگ، بہنوں کی محفل اچھی تھی۔ اینہ عندلیب کی صحت کے لیے اور دیگر تمام بیماروں کے لیے دعا گو ہوں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✉ روما محمود، مقام، نامعلوم۔ ہم آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔ آپ اپنی ہر تحریر کے ساتھ اپنے شہر کا نام بھی ضرور لکھا کریں۔

✉ فائزہ فاروق سحر، لاہور۔ گڑیا کبھی نیلے یا کالے رنگ کے قلم سے بھی لکھ لیا کرو۔ تم اتنے لائٹ رنگ کے مارکر سے خط لکھتی ہو کہ میں انگل سے ہی سمجھتی ہوں۔ بہر حال تمہارا اور تمہاری بہن کا ہماری تحریریں پسند کرنے کا شکریہ۔

⊠ سدرہ کلثوم مروت، لکی مروت نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کیا میں پاکیزہ کے ذریعے کسی سے دوستی کی درخواست کر سکتی ہوں۔ مجھے آج کل دوستوں کی بہت ضرورت ہے میرا مطلب پیاری سی سہیلی کی۔ اس بارے میں تو ہماری بہنیں ہی آپ کو جواب دیں گی کہ وہ آپ کی پیاری سہیلی بننا چاہتی ہیں یا نہیں۔

⊠ فریدہ بانو، سندھ۔ خوش آمدید، گڑیا۔ میں کوئی خط ضائع نہیں جانے دیتی۔ آپ دیکھتی ہوں گی کہ ایک افسانے پر تین تین ماہ تک تبصرے اس وجہ سے چلتے ہیں کہ تاخیر سے ملنے والے خطوط بھی بزم میں شامل کر لیے جاتے ہیں کہ آپ کی پسندیدگی ہماری رائٹرز کے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کی اس رائے سے ہم اتفاق نہیں کریں گے کہ صرف سینئر رائٹرز کی تحریریں شائع ہونی چاہئیں۔ ہماری نئی رائٹرز اب بہت محنت سے اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں آئندہ خط کا انتظار رہے گا۔

سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "دانش نواز کی سچی سچی باتیں پڑھ کر اچھا لگا۔ اچھی بری خوبیاں سب میں ہوتی ہیں لیکن انسان اپنی خامیوں پر پردہ ڈالے رکھے یہ سب سے بڑی خامی ہوتی ہے۔ اسما قادری کی تحریر بے گماں لمحے اچھی تھی۔ جب انسان برائی کو ترک کرنا چاہتا ہے تو قدم قدم پر لوگ اور ماحول اس کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں لیکن جو ثابت قدم ہوتے ہیں وہ ڈٹے رہتے ہیں۔ نزہت جبیں ضیا نے اچھے موضوع پر لکھا۔ بچوں کی طرح بڑوں کو بھی ٹائم دینے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ مرجھا جاتے ہیں۔" (بالکل)

صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی سے۔ "جون 2013ء کا شمارہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ میرے روبرو جلوہ گر رہا۔ اپنائیت کے سارے سلسلے لیے انجم آپی مجھے کچھ کہنا ہے اور جلترنگ میں چھائی رہیں جبکہ دانش نواز جیسے ذہین اور شوخ و چنچل اداکار کے انٹرویو کی شمارے میں موجودگی ذہن و دل کو تر و تازہ کر گئی۔ بے ساختہ ہنسی آتی رہی...... خدا انہیں بھی خوش رکھے۔ (آمین) بہنوں کی محفل اور پاکیزہ کے دیگر دلچسپی پر مبنی سلسلے عروج پر رہے...... اور اس بار افسانے بازی لے گئے...... ناک آؤٹ، مشرقی معاشرے کی ایک حقیقت ہے جبکہ سعدیہ رئیس کی گھر کی عزت میں عندلیب جیسی پُرخلوص بہو کا کردار دکھائی دیا۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ پُرخلوص دل اکثر ٹوٹ جاتے ہیں۔ نزہت جبیں ضیا کی پاپا تو خیر ایک سرسری واقعے کو لے کر بے حس اولادوں کو جگانے کی کوشش تھی...... مگر درحقیقت یہ آج کے دور کا اتنا بڑا اور قابلِ شرم موضوع ہے کہ جس کی پہلے ادوار میں مثال نہیں ملتی۔ اسما قادری نے بھی خوب لکھا...... جس کے خلوص پر یقین ہو اس سے شکوہ نہیں کرتے...... یوں ان کے بے گماں لمحے یقین میں بدل گئے۔ سلمیٰ غزل کے فیصلے زندگی کے تلخ تو تھے مگر اچھے رہے...... جگنو کی شادی، صائمہ قیصر کی فیورٹ تحریر ہے...... (ہاہاہا) صائمہ اکرم جی کی بنت حوا میں ہمیشہ کی طرح حسین مناظر اور دھیرے دھیرے جلتی سلگتی محبت نے متاثر کیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کا اک خواب تم بھی ہو بہت اچھا مسیج ہے۔" (شکریہ)

امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ "پاکیزہ سے وابستہ آپ سب بہنوں کی دعاؤں اور محبتوں کی مقروض ہوں۔ کیسے قرض ادا کروں؟ محبتوں کا قرض کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ سب میری صحت کے لیے اتنی پریشان ہیں باجی انجم انصار سے فون پر پوچھتی ہیں باجی میرے لیے دعا کرواتی ہیں۔ انشاء اللہ آپ سب کی دعاؤں سے جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا دامن خوشیوں سے بھرا رکھے، آمین۔ پیاری باجی انجم انصار کی بے لوث شخصیت اس قدر خیال دعاؤں کا انبار ان کا حوصلہ دینا میری آنکھیں برسنے لگتی ہیں، اتنی دعائیں مجھے رونے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ اللہ تعالیٰ باجی انجم آپ سب بہنوں کو زندگی کی ہر خوشی نصیب فرمائے، آمین۔ آپ سب بہنوں کا میرے دل میں یکساں مقام ہے۔ میں آج تک اپنی پاکیزہ کی کسی بہن سے ناراض نہیں ہوئی اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی بذریعہ خط کلیئر کی شب معراج طبیعت بہت خراب تھی۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ سب بہنوں کے نام لے کر دعائیں مانگیں۔ جو بہنیں ہم میں نہیں ہیں ان کے نام لے کر مغفرت کی دعائیں کیں۔ اللہ پاک میری ہر بہن کی دعا کو قبول فرما۔ سب کا دامن، خوشیوں، مرادوں سے بھر دے، آمین۔ صائمہ قیصر، جگنو کی شادی میری ملتی جلتی کہانی ہے۔ آنسو آ گئے بھابیوں کا ناروا سلوک...... ہائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہوتے ہیں اس کے امر کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسی بھابیوں کو یہ سوچنا چاہیے ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔ ایسی لڑکیاں کہاں جائیں؟ ماں، باپ کا گھر، شوہر کا...... آخری گھر قبر وہ تو سب کا ٹھکانا ہے۔ خدارا ایسی بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ دعا ئیں

لیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

خالدہ نسیم، لندن سے۔ "پاکیزہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ اس بار بہت دنوں کے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں ہر بار اچھے بلکہ بہت ہی اچھے افسانے اور قسط وار ناول پڑھنے کو ملتے ہیں جلترنگ اور بہنوں کی محفل کا جواب نہیں مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی مگر حقیقت میں بڑی باتیں پڑھتے ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔ "میں بی ایڈ کے پیپرز دے کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ خداوندِ کریم کا کرم ہوا کہ میں بفضلِ تعالیٰ تیسری مرتبہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی ہوں۔ دو بچوں کی ذمے داری، گھر داری اور طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے تبصرہ نہ کر سکی البتہ پاکیزہ میں ریگولر پڑھتی رہتی ہوں اور دوسری وجہ اسے تاخیر سے اختتام پزیر کرنا ہے۔ میں چاہ کر بھی اسے جلدی مکمل نہیں کر پاتی۔ شادی سے پہلے تو دو دن میں مکمل کر ڈالتی تھی مگر میرڈ لائف کی مصروفیات آپ سے بہتر بھلا کون جانتا ہوگا؟ پنجاب میں چونکہ ماسٹرز کے پیپر کا سیزن چل رہا ہے اس لیے بھی کچھ مصروف ہو گئی ہوں کہ ایم اے اسلامیات کی تعلیم دے رہی ہوں اور تعلیم کو پھیلانے میں اپنا کوٹہ ادا کر رہی ہوں۔ آپ سے التماس ہے کہ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور پلیز آپ نے آپریشن سے بچنے کا روحانی علاج جو شائع کیا تھا پھر سے شائع کر دیں۔ اتنا تو مجھے یاد ہے کہ نویں مہینے یہ عمل کرنا ہے۔ سلسلے وار ناول امانت میں تو کچھ کچھ گتھیاں سلجھ رہی ہیں مگر رفعت جی نے اس مرتبہ لگتا ہے کہ مزاج سے ہٹ کر لکھا ہے اور عنیزہ جی آپ نے اپنی شخصیت کی طرح سنجیدہ موضوع ہی چنا ہے گو کہ اس ناول کا شروع ہے مگر یہ دل من مسافر من کی طرح دل کو نہیں چھو رہا۔ شیریں آنٹی آپ کا بھی انتظار رہتا ہے پلیز جلدی آیا کریں۔ قیصرہ حیات نے کہیں دیپ جلے کہیں دل یکمشت لکھ ڈالا...... مجھے یقین نہیں آتا۔ اقساط کی صورت میں اتنا طویل ہے تو مکمل ناولٹ کتنا طویل ہوگا؟ یمنیٰ کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی بڑی دردناک ہے اور حمنہ بے چاری تو بے موت ماری گئی اب ناولٹ کس کروٹ بدلتا ہے انتظار رہے گا۔ جگنو کی شادی آج کے معاشرے کی عکاس لگی۔ اکثر گھرانوں میں اسی طرح لڑکیوں کو بوڑھا کر دیا جاتا ہے۔ فسانہ نہیں حقیقت میں رضوانہ آنٹی نے دانش نواز کی شوخ و چنچل ہستی کو متعارف کروا کر پاکیزہ کا مزہ دوبالا کر ڈالا۔ اب عدا یاسر اور یاسر نواز کا کھٹا میٹھا انٹرویو ہو جائے تو کیا کہنے۔ افسانے ابھی زیرِ مطالعہ ہیں البتہ دونوں مکمل ناولوں کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔" (شکریہ)

صاعقہ ریاض، حیدرآباد سے۔ "آپ نے اس ناچیز بندی کو شہزادی کا لقب دیا بہت مہربانی ورنہ ہم اس قابل کہاں۔ پاکیزہ سے میں کافی دن سے واقعی گمشدہ ہوں مگر پاکیزہ پڑھتی ضرور ہوں چاہے اس میں لکھنے کے لیے مجھے ٹائم ملے یا نہ ملے مگر پڑھنے کا تو ٹائم مل ہی جاتا ہے کافی دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے دل و دماغ میں کوئی شاعری نہیں آتی تھی کہ کیا لکھوں اور کیا بھیجوں آپ سب میری بہتر طبیعت ہو جانے کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی عطا فرمائے) اور ایک بات بتاؤں آپ کو کہ میں اور میرے شوہر اس سال حج پر جا رہے ہیں آپ اور تمام بہنوں کو میں ضرور اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔" (اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا)

بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹہ ختم ہوا۔ آئیے اب ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہان میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔ آمین ثم آمین۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیب

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

نعت رسول مقبول ﷺ

کبھی جالی کبھی گنبد کبھی مینار کے ساتھ
لپٹی جاتی ہے نظر نور کے آثار کے ساتھ
ابھی الفاظ ہی سوچ تھے کہ یوں مانگیں گے
رحمتیں بیٹھ گئیں لگ کے طلب گار کے ساتھ
یہ مدینے کے اجالوں کو ہمیشہ دیکھیں
رکھ کے آجاؤں میں آنکھیں انہی انوار کے ساتھ
قول اور فعل میں یکجائی مسلم اُن کی
اُن کا کردار بھی بے مثل تھا گفتار کے ساتھ
باندھے رکھتا ہے شفاعت کے تصور سے اسے
آس کا ایک سرا آپؐ کے بیمار کے ساتھ
جن اجالوں سے بصارت کو جلا ملتی ہے
متصل ہیں وہ فقط آپؐ کے دربار کے ساتھ
آپؐ سا کوئی ہوا ہے نہ کبھی بھی ہوگا
جو بھی خوبی ہے وہ منسوب ہے سرکارؐ کے ساتھ

شاعرہ: نورین طلعت عروبہ، راول پنڈی

گھوڑا وہیں چھوڑ دیا

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حد درجہ متقی تھے۔ ایک دفعہ آپؒ ایک منزل پر اترے، آپؒ کے پاس ایک نہایت قیمتی گھوڑا تھا۔ آپؒ جب نماز میں مشغول ہوئے تو گھوڑا ایک کھیت میں جا کر چرنے لگا۔ جب آپؒ نے یہ حالت دیکھی تو گھوڑے کو اس خیال سے وہیں چھوڑ دیا کہ غیر حلال چارہ اس کے پیٹ کے اندر چلا گیا ہے اور آپؒ پیدل ہی سفر پر روانہ ہوگئے۔

اقتباس: حکایات کا انسائیکلوپیڈیا
مرسلہ: صدف نورین، لاہور کینٹ

تکبر کا علاج

☆ حدیث پاک ہے۔ ”دستر خوان پر گری ہوئی چیز (لقمہ) ہمیشہ پونچھ کر کھالیا کرو اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑو یہ تکبر کا بہترین علاج ہے اور اس سے رزق میں فراخی ہوتی ہے۔“

(مسلم)

☆ بعض دوسری احادیث میں ہے کہ جو شخص دستر خوان سے گری ہوئی چیز اٹھا کر کھاتا ہے تو وہ جنت کی حوروں کے لیے (حق) مہر ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کی اولاد کو جذام، برص اور جنون سے محفوظ رکھے گا، انشاء اللہ۔

☆ دستر خوان کے اوپر گرے ٹکڑے شفا سمجھ کر نوشِ جان کرو۔

انتخاب: فائزہ شہزاد، پشاور

شیخ سعدیؒ کی خوب صورت بات

میرے پاس وقت نہیں ان لوگوں سے نفرت کرنے کا جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ میں مصروف رہتا ہوں اُن لوگوں میں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

مرسلہ: ام ایمان، کوٹ چھٹہ

نظم

کیونکر جذبات کی توہین گوارا کرلوں
کیوں کہوں تجھ سے کہ دل تیرا تمنائی ہے
کیونکر ان عام جذبات کو سہارا کرلوں
کیا ضروری ہے کہ تو مجھ سے محبت کرلے
اور یہ پھول سے رخسار فسردہ ہو جائیں
آنکھوں کے یہ انوار کہیں کھو جائیں
اور تو میری طرح سوگ کی تصویر بنے
نہیں واللہ! مجھے یہ ہی تو منظور نہیں
ہے یہی طور کہ نفرت کو جگاؤں کچھ اور

تیرے وہموں کو حقیقت میں بناؤں کچھ اور
نقش بنتے رہیں الفت کے حسین اور حسین
تیری بد مست نگاہوں کو خبر تک بھی نہ ہو
مر بھی جاؤں تو تیرے دل پر اثر تک بھی نہ ہو

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

قابلِ غور

ایک مرتبہ ایک عورت نفسیاتی معالج کے پاس گئی اور شوہر سے روز روز جھگڑے کی شکایت کرنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحب ہم دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ بات بات پر شوہر غصہ کرنے لگتے ہیں اور پھر مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔“

اس پر ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کا علاج نہایت آسان ہے۔ تم شیر کی گردن کے تین بال لے آؤ۔“

عورت ہمت کر کے چڑیا گھر گئی۔ شیر کے لیے کچھ گوشت لے گئی جسے شیر نے کھالیا۔ عورت کا ڈر کچھ کم ہوا اور وہ روزانہ شیر کے لیے گوشت لے جانے لگی۔ پہلے وہ گوشت دور سے پھینکتی تھی پھر نزدیک سے پھینکنے لگی۔ یہاں تک کہ جب وہ گوشت کھانے لگتا تو پنجرے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر پیار کرنے کی کوشش کرتی۔ جب شیر اس سے کافی مانوس ہو گیا تو اس کے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تین بال کھینچ لیے اور معالج کے پاس لے آئی۔ اس پر اس نے کہا۔

”کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے رویے اور نرم دلی سے شیر کو تو مانوس کر سکتی ہو جو وحشی جانور ہے مگر ایک مرد اور وہ بھی جو تمہارا شوہر ہے تم سے مانوس نہیں ہوتا۔“

مرسلہ: فرحت احمد، کراچی

غزل

وہ کہتا ہے اب ہمیں الفت نہیں ہے
مجھے تم سے ملنے کی فرصت نہیں ہے
بڑا ہے وہ جھوٹا سب ہی جانتے ہیں
کہ اس دل میں پھر بھی عداوت نہیں ہے
سنا ہے کہ کہتے ہیں میرے مہرباں
کبھی بھی رہی ہم میں قربت نہیں ہے
وہ میٹھی نگاہیں وہ ٹھنڈی آہیں
کہ سب کچھ ہے پھر بھی محبت نہیں ہے
بڑے کام باقی ہیں گھر کے بجن جی
ابھی دل لگانے کی فرصت نہیں ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

سچی باتیں

☆ انسان سب سے لڑ سکتا ہے سوائے موت کے۔ موت کے آگے انسان بے بس ہو جاتا ہے اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔ کچھ تصویریں، کچھ یادیں، کچھ باتیں پھر ہمارے ساتھ وہ بھی ختم۔

☆ خواہشات تاریک جنگل ہیں جن میں بھٹکتے بھٹکتے عمر بیت جاتی ہے مگر منزل کا رستہ پھر بھی نہیں ملتا۔

مرسلہ: صدیقہ خان، آزاد کشمیر

فرق

تمہاری بات لمبی ہے
مثالیں ہیں
دلیلیں ہیں
ہماری بات چھوٹی ہے
ہمیں تم سے
محبت ہے

شاعرہ: مسز راحت وفا راجپوت، لاہور

نظم

اس نے کہا ہی نہیں
مجھے تم سے محبت ہے
ہوئے لب بھی وا
اور
ملی نگاہیں بھی
ڈبڈبائی آنکھوں کی

پلکیں کپکپائیں بھی
مگر
اس نے کہا ہی نہیں
مجھے تم سے محبت ہے

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

بنیاد

ٹھیکیدار۔ ''یہ بتائیے کہ آپ کس قسم کا مکان بنوانا چاہتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں کس قسم کا نقشہ ہے؟''
شوہر۔ ''میرے ذہن میں تو کوئی خاص نقشہ نہیں ہے۔ بات بس اتنی ہے کہ میری بیوی پچھلے اتوار بازار سے دروازے کا ایک ہینڈل خرید لائی تھی بس کوئی ایسا مکان بنا دیجیے جس میں وہ ہینڈل طریقے سے لگ جائے۔''

غلطی

''وہ بدصورت عورت کون ہے جو ٹی وی کے پاس کھڑی ہے۔''
''وہ میری بیوی ہے۔''
''اوہ معاف کیجیے گا مجھ سے غلطی ہوگئی۔''
''نہیں جناب غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔''

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

سخاوت

تونے دل مانگا میں نے دیا
تونے جدائی مانگی سر تسلیم خم کیا
اور اب اپنی جفاؤں کی معافی مانگی تو
میں نے تجھے آزاد کیا
لیکن اے مانگنے والے ستمگر
کبھی تونے یہ بھی سوچا کہ
سخاوت کرنے والی کو کیا ملا؟
دل لٹا، جدائی ملی
اور تمام عمر کی تنہائی ملی

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

محبت

محبت کرنے والوں کے لیے ان کا محبوب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پیر بھی، مرشد بھی، درگاہ بھی، خانقاہ بھی، دم بھی، دعا بھی، مرضی بھی، مسیحا بھی، ریاضت بھی، چلہ بھی، عطا بھی، دوا بھی، متاع بھی سب کچھ وہی ہوتا ہے۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

غزل

یہ حسرت تھی تجھے خواب میں دیکھوں
بند آنکھوں یا کھلی کتاب میں دیکھوں
تجھے پاؤں میں شبنمی فضاؤں میں
چاند تاروں یا آفتاب میں دیکھوں
نیلے پربت پر دیکھوں، رنگیں نظاروں میں
زرد کلیوں یا سرخ گلاب میں دیکھوں
کہاں کہاں نہ تجھے تلاش کیا اے جان
آبِ راوی یا چناب میں دیکھوں
دل کی دھڑکن یہ کہہ رہی ہے تم سے
ساری خوبیاں جناب میں دیکھوں

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

شوہر کے نام

تم میرے ہر خواب کا حصہ ہو
تم ہی آرزوئے جاناں
تم ہی من کی آشا ہو
تم ہی تسکینِ جاں
تم زیست کا حاصل بھی ہو
اور وجۂ زندگی بھی
تم ہر منظر کا جزو لازم اور ہر موسم کا رنگ
تم پریت، تم گیت اور تم ہی میرے درماں
یہی سچ ہے میرے ہمدم، میرے ساتھی
تم میری روحِ رواں اور
تمہاری محبت
میرے لیے سرمایۂ حیات ہے

شاعرہ: سویرا فلک، کراچی

خوب صورت ماحول

عید کے دنوں میں سب کے ہاں مہمان آتے ہیں، ہر گھر میں مہمانوں کو جہاں دیگر لوازمات کھانے پینے کے لیے دیے جاتے ہیں وہاں ان کو لازمی سوّیوں کی کوئی ڈش کھلائی جاتی ہے۔
سوّیاں کھا کر بہت کم مہمان اس کی تعریف کرتے ہیں...... اکثر جو تعریف کرتے ہیں وہ اس طرح کی ہوتی ہے۔
گزشتہ سال کی سوّیاں کیا مزے کی بنائی تھیں جب کہ گزشتہ سال بھی یہی جملے ادا کر کے صرف وہی نہال ہوئے...... اہلِ خانہ نہیں۔
دعوت میں آنے والے مہمان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو کھانے پینے کی چیزوں پر ڈاکوؤں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں...... کتنی چیز ہے اور کس کس نے کھانی ہے اس کی انہیں پروا بھی نہیں ہوتی۔
دوسری طرح کے مہمان کھانا کھاتے نہیں صرف سونگھتے ہیں...... انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کھانے کی میز کی بھری پڑی ڈشز دیکھ کر ہی نہ صرف ان کا پیٹ بھر جاتا ہے بلکہ ان میں یہ ادا بھی ہوتی ہے کہ میزبانوں کو خالی پیٹ اپنا لیکچر بھی ضرور دیتے ہیں...... جس میں گوشت، چاول، مرغ و ماہی میں جی بھر کر کیڑے بھی ڈالتے ہیں...... یہ ابنارمل سے مہمان ڈاکو مہمانوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں...... کہ تعریف کرنے میں بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی خرچہ ہوگیا ہے...... جس کا ملال ان کے چہرے پر صاف نظر آتا ہے۔
نقاد مار کہ مہمانوں کو دیکھ کر کوئی میزبان کبھی خوش نہیں ہوتا...... مگر نفسا نفسی کے اس دور میں ایسے ہی مہمان...... پھل پھول رہے ہیں جدھر دیکھو چنگی لینے والے...... نقصان پہنچانے والے مہمان خاردار جھاڑیوں سے زیادہ نظر آتے ہیں۔
یوں تو مہمانوں کی اقسام بے شمار ہیں مگر ہم ان کی درجہ بندی کرنے سے قاصر ہیں جب بھی اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا سوچیں تو شاید اس ضمن میں کامیاب ہو جائیں...... مگر مہمان ذاتی طور پر آ کر وہیں سے لوٹ جاتے ہیں کہ دروازے پر موجود چوکیدار ان کو بتاتا ہے کہ ہم گھر پر نہیں کہ یہی اس کا فرضِ اولین ہے۔
اس چوکیدار کی تنخواہ صرف اسی ماحول پر طے ہے کہ اگر وہ کوئی مہمان بھگائے تو فی مہمان اس کو ہم بیس روپے...... دیں گے اور اگر وہ کسی مہمان کو بھگانے...... میں ناکام ہوگیا اور مہمان ہمیں بور کرنے کے لیے دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے تو دس روپے فی مہمان اس پر جرمانہ ہوگا (اسی لیے چوکیدار بھاگ گئے...... بلکہ تہوار کے موقع پر ہمیں کوئی چوکیدار نہیں ملتا ہے)
نوٹ بلکہ اس خصوصی نوٹ کے طور پر یہ سطور بھی ضرور پڑھی جائیں کہ ہمارے دل کے تمام مہمانِ گرامی اس قانون سے مستثنیٰ ہیں...... مگر ان کی تعداد بے حد کم ہے...... بے حد...... بے حد ہی کم۔
ہمیں وہ مہمان سخت زہر لگتے ہیں جنہیں جب ان کی منشا کے مطابق چائے دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں۔
''ارے آپ اتنی جلدی چائے لے آئیں، کیا بھگانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''
تب دل چاہتا ہے کہ فوراً کہا جائے ہاں...... ہاں۔
''چلیے آدھے گھنٹے بعد چائے پلا دیجیے گا۔''
بعض مہمان احسان دھرتے ہوئے کہتے ہیں انہیں یہ

تک معلوم نہیں کہ ان کا یہ آدھا گھنٹا ہمارے دو مہینے کے برابر ہوتا ہے...... جو کسی طرح کٹتا ہی نہیں۔

تب بنی ہوئی چائے آرام سے واش بیسن میں بہا دی جاتی ہے کہ دوبارہ گرم کی ہوئی چائے میں مزے کا فقدان ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب چائے کا مگ دیا جائے تو کہتے ہیں...... ”ارے آپ اتنے بڑے مگ میں چائے لے آئیں، یہ کریں کہ آپ ایک خالی مگ یا کپ لے آئی...... اتنی زیادہ چائے تو ہم پی ہی نہیں سکتے۔“

”ارے آدھی چائے چھوڑ دینا۔“ دل ہزار صلواتیں چپکے چپکے سناتا ہے۔

تب وہ چائے چھلکا کر آدھی کپ میں ڈالتے ہیں، آدھی میز پر گرائی جاتی ہے...... کچھ چھینٹے صوفے پر پڑتے ہیں اور کچھ چائے قالین پر گرتی ہے۔

ہمارا ڈارک براؤن قالین جب نیا خرید کر لایا گیا تھا تو اس کا رنگ آف وائٹ تھا...... اس کا کلر ہمارے مہمانوں نے کب اور کیسے تبدیل کر دیا کہ ہمیں تک پتا نہیں چلا...... بلکہ اب تو ہمیں بھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا رنگ شروع سے ہی ڈارک براؤن تھا۔

چائے اِدھر اُدھر گرنے کے مرحلوں میں کچھ چائے چھلک کر مہمانوں کے ہاتھوں پر بھی آجاتی ہے...... ہاتھوں پر گری چائے کو صوفے کے کشن سے صاف کر دیا جاتا ہے یا پھر صوفے پر ہی ہاتھ رگڑ دیے جاتے ہیں۔

بڑی چاچی نے ایک مرتبہ برنال طلب کی تھی...... اور چھوٹے ماموں نے ٹوتھ پیسٹ مانگا تھا...... آج تک ہمارے صوفوں پر سفید اور پیلے دھبے ہماری یادوں میں آگ کی روشنی کرتے ہیں...... کہ چائے کے ساتھ برنال اور پیسٹ بھی کس بے رحمی سے صوفوں پر رگڑا گیا تھا۔

بعض مہمان خواتین تو پان کھا کر اپنی انگلیاں دیواروں اور پردوں سے پونچھتی ہوئی جاتی ہیں۔

چائے پینے سے پہلے ایک گلاس پانی کی طلب 75 فیصد مہمانوں کو ہوتی ہے...... خواہ مخواہ کی پیاس...... ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیں گے...... مگر پانی ضرور مانگیں گے...... یہ تک نہیں سوچیں گے کہ اس علاقے میں پانی آتا بھی ہے یا نہیں......! یا بے چارے میزبان کے گھر ہر ہفتے ٹینکر ڈالا جاتا ہے...... اور قطرے قطرے کا حساب رکھا جاتا...... دومنٹ سے زیادہ کوئی غسل کرنے میں لگا دے تو دروازہ پیٹ دیا جاتا ہے...... اور چھوٹے موٹے جھگڑے بہ آسانی گھر کا ماحول تک ”کرارا“ کر دیتے ہیں۔

اس طرح کے مہمانوں کے آنے سے صرف ایک کپ انہیں چائے دینے میں سترہ برتن سامنے جاتے ہیں...... چائے پینے والے کو بے شک سواد نہ آیا ہو پلانے والوں کو تو بالکل نہیں آتا...... مگر جب مہمان بھی چائے پی کر اپنے چہرے کے زاویے بگاڑ دیں...... اور کمرے کی چھت کو دیکھ کر ماتھے پر تیوریاں بھی ڈالیں...... تو خوش خلقی واقعی بہت بڑا وصف بلکہ ہنر بھی معلوم ہوتا ہے۔

مہمان داری کرنے والے واقعی ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس نفسانفسی کے دور میں جب خون کے رشتوں میں دراڑیں پڑ رہی ہوں...... ہر بات کو ٹیڑھا کر کے دیکھنے کا رویہ عام ٹھہر جائے...... ایسے میں کسی مہمان کا جب بھی فون آتا ہے کہ میرا آپ کے ہاں آنے کا آج شام ارادہ ہے تو میری طرح کا ہر میزبان فوراً تڑپ کر یہی کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ آپ نے آنے سے پہلے فون کر لیا نہ صرف آج بلکہ پورے ہفتے تک ہم گھر پر نہیں ہوں گے، ہم سب کا پروگرام دوسرے شہر جانے کا ہے۔

اپنے آنے کے بارے میں بھی ہم حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کب آئیں گے۔ دل لگ گیا تو زیادہ دن ٹھہر جائیں گے۔ دل نہ لگا تو آگے کہیں نکل جائیں گے۔

خیر آپ کو فون کر دیں گے اگر ہمارا فون ٹھیک ہوا تو...... خیر وہ تو اکثر خراب ہی رہتا ہے۔

اصل وجہ

چھوٹی پھپھو شروع سے پیسے والی رہی ہیں۔ جتنی تھیں نہیں اس سے زیادہ بھڑکیاں مارتی تھیں۔ خاندان کے غریب گھرانوں میں گھوم گھوم کر اپنی امارت کے قصے ایسے آنکھوں میں سجا کر سناتی تھیں کہ دل چاہتا تھا کہ ان کے ہاں ڈاکا پڑ جائے۔

”کل رضوان میرے لیے ایک سونے کا سیٹ لے آئے اب بتاؤ پچھلے مہینے ہی تو چوڑیاں لائے تھے...... کل بچوں کو برگر منگوا کر دیا تو سارا، سارا انہوں نے باہر پھینک دیا کہ دیر سے کیوں آیا“ ہم سب لوگ دل میں سوچتے کہ کہاں پھینکا ہے ہم وہاں سے اٹھا کر لے آتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں تو دال بھی فساد کے بعد پکتی تھی۔

”بس دل جلانے کی باتیں ہی آتی ہیں جمیلہ کو۔“ ایک دن امی سب بچوں کے سامنے غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اب کیا ہوا امی؟“ بڑی بہن پوچھنے بیٹھ گئیں۔

”لو، بتاؤ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ بھابی پچھلے مہینے جو رضوان نے مجھے چوڑیاں دلوائیں تھیں وہ دس تھیں یا بارہ، مجھے یاد نہیں آ رہا کیونکہ صرف دس مل رہی ہیں۔“

”لو مجھے کیا پتا بہن؟ تمہاری چوڑیاں تمہارے ہاتھ میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ بہت شوق اور ندیدے پن سے میری ہر چیز دیکھتی ہیں ناں...... تو میں نے کہا کہ آپ کو یاد ہوگی، میرا تو آپ کو پتا ہے کہ اتنی چیزیں ہیں کہاں یاد رہتا ہے اب ایک دو آپ کی طرح ہوں تو یاد بھی رکھوں کہ شادی کے لیے ابنارمل سے بندے اور میت کے لیے تنگ نکلے ٹوپس ہوتے ہیں۔“

تب امی کے ساتھ ساتھ ہم چاروں بہنوں کا یہ دل چاہا...... کہ پھپھو...... کو اتنی سنائیں اتنی سنائیں کہ آواز کم پڑ جائیں۔ مگر کچھ بھی نہیں کہہ سکے...... کاش چھوٹی پھپھو پیسے والی نہ ہوتیں...... تو کوئی ہماری ہمت دیکھتا...... ہاں۔

میرا پلان

جب کبھی میں یاسمین کا فون ریسیور کرتی ہوں، بے حد پریشان ہو جاتی ہوں۔ یاسمین کے پاس ہمیشہ وقت کی فراوانی ہے اور وہ اس قدر طویل گفتگو کرتی ہے کہ میں بور ہو جاتی ہوں۔ کیا کھایا، کیا پکایا سے لے کر آج کتنی بار بجلی گئی اور آئی۔ کام والی ماسی نے کیا نئے بہانے بنائے اور اسٹار پلس کے ڈراموں میں منفی کردار کیسے ناچ نچا رہے ہیں۔ یاسمین سے بات کرتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فون کا سلسلہ کس طرح ختم کروں مگر وہ اپنی باتوں کے شکنجے میں اس طرح کستی ہے کہ میں سوائے اس کی باتوں کے جواب میں ہوں، ہاں کرنے کے کچھ بولنے کی سکت نہیں پاتی حالانکہ میری عادت ایسی نہیں ہے۔ میں ناپسندیدہ لوگوں کو منہ تک نہیں لگاتی ہوں، ان کی جانب دیکھنا تک پسند نہیں کرتی ہوں مگر یاسمین کی ہر بات میں بظاہر بڑے شوق سے سنتی ہوں اس کی کسی بات سے اختلاف تک نہیں کرتی ہوں۔ اس کے بور سے جوک پر قہقہہ لگا کر اپنی شگفتہ مزاجی کا اظہار کرتی ہوں۔ جس کی صرف یہ وجہ ہے کہ یاسمین میری ہونے والی نند کا نام ہے جو اسد کی منہ چڑھی بہن ہے۔

یاسمین میری ایسی نند ہے جو آفت کی پرکالہ ہے جس نے اپنی تمام بھابیوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ جس کے بارے میں میرا پلان یہ ہے کہ شادی کے بعد میں اسے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔

اس نے محبت سے اگر قدم بڑھایا بھی تو میں نفرت سے وہیں روک دوں گی...... آخر ہماری محبت کی شادی ہو رہی ہے اب اسد کو میری آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا چاہیے، کیا خیال ہے......؟

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

ماریہ دانش......چکوال
شادابیاں ہیں اور کہیں آنکھوں میں اشک ہیں
لایا ہے چاند عید کا کتنے عجیب رنگ
☆سائرہ خان......گجرات
کاش اس عید سعید کے حسین لمحوں میں
میری ذاتِ گم گشتہ بھی تجھے یاد آئے
☆غزالہ باجوہ......راول پنڈی
ہلالِ عید کو دیکھو تو روک لو آنسو
جو ہوسکے تو محبت کا احترام کرو
☆سعدیہ خاور......اوکاڑہ
جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں
پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رُت آئی ہے
پھر سے دلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں
☆فائزہ شاہ......ساہیوال
جب بھی ٹھہرا ہے ذرا آ کے تیری دید کا رنگ
دور تک پھیل گیا ہے میری جاں عید کا رنگ

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ
نظر جو چاند پہ کی دل میں مسکرائے تم
دعا کو ہاتھ اٹھائے تو یاد آئے تم
بہار آئی ، صبا آئی ، ہر خوشی آئی
سب آئے عید کے مہماں مگر نہ آئے تم
☆امیمہ اشرف......اسلام آباد
کتنے ترسے ہوئے ہیں خوشیوں کو
وہ جو عیدوں کی بات کرتے ہیں
☆راحیلہ......لاہور
تعبیر جو مل جاتی تو اِک خواب بہت تھا
جو شخص گنوا بیٹھے ہیں نایاب بہت تھا
میں کیسے بچالیتا بھلا کشتیِ دل کو
دریائے محبت میں سیلاب بہت تھا
☆فرزانہ رحمٰن......سرگودھا
وابستہ ہو چکی تھیں کچھ امیدیں آپ سے
امید کے چراغ بجھانے کا شکریہ
☆تبسم......بھلوال
جہاں جاتا ہے میرا ذکر وہ کرتا ہے نفرت سے
یہ اس کی مہربانی ہے مجھے بھی ساتھ رکھتا ہے
☆سائرہ رانی......خانیوال
ملتا رہا وہ خواب میں کتنے خلوص سے
آنکھیں کھلیں تو خواب کی تعبیر ہم نہ تھے
☆اریبہ ضیا......سکھر
چار روزہ زندگی پر کیا گمانِ زندگی
چند قدموں ہی چلے گی داستانِ زندگی
☆میمونہ عزیز......اسلام آباد
یہ بوند بوندی سی بارش کسی کی یادوں کی
مرے یقین کا کچا مکاں گرائے گی
☆سونیا سرور......کراچی
ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر کام میں عجلت کرنا
☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



پالک پنیر

اجزا: پالک، ایک پاؤ۔ (گرم پانی میں دو منٹ ابال کر ٹھنڈے پانی میں رکھیں دو منٹ بعد نچوڑ کر باریک کاٹ لیں) پیاز، دو عدد۔ (باریک کاٹ لیں) ہری مرچ، پانچ عدد۔ (باریک کاٹ لیں) ٹماٹر، تین عدد۔ (باریک کاٹ لیں) ادرک، لہسن کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ فریش کریم، دو کھانے کے چمچ۔ گرم مسالا، (پسا ہوا) چار چائے کے چمچ۔ پنیر یا کاٹیج چیز، ایک پیکٹ۔ (چھوٹی کیوب بنالیں) نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: تیل گرم کرکے پیاز گولڈن براؤن کر کے ٹماٹر ڈالیں ساتھ ادرک، لہسن کا پیسٹ، ہری مرچ ڈال کر اچھی طرح سے بھون لیں ساتھ نمک ڈالیں تا کہ ٹماٹر گل جائے۔ اب پالک ڈال کر ہلکا سا بھون کر پنیر ڈالیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور پانچ منٹ ہلکی آنچ پر رہنے دیں۔ اب درمیانی آنچ پر بھون لیں ساتھ گرم مسالا اور فریش کریم بھی مکس کر کے چولھا بند کردیں۔

ڈش میں نکال کر پنیر اور فریش کریم سے گارنش کریں۔

سامعہ تبسم، ملتان

مونگ کی دال کے پکوڑے

ترکیب: ایک پاؤ مونگ کی دال پانچ گھنٹے بھگو کر گرائنڈر یا سل پر پیس لیں۔ اس میں ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ، پیاز باریک باریک کتر کر مکس کرلیں۔ نمک اور سرخ مرچ حسبِ ذائقہ ملائیں۔ سفید زیرہ، ایک کھانے کا چمچ اور ادرک بھی باریک کاٹ کر ایک چمچ کے قریب ملا کر بیسن کی طرح پھینٹ لیں پھر کڑاہی میں تیل گرم کر کے پکوڑوں کی طرح تلتی جائیں۔

کیری اور پودینے کی کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

اسی طرح چنے کی دال کے بھی بنا سکتی ہیں۔

چائنیز پکوڑے

اجزا: شملہ مرچ، دو عدد باریک کاٹ لیں۔ بند گوبھی، (باریک کٹی ہوئی) دو پیالی۔ ہری پیاز، 1/2 پاؤ۔ پارسلے یا ہرا دھنیا، ایک پیالی۔ چائنیز گاجر، باریک کٹی ہوئی ایک پیالی۔ چائنیز گوبھی۔ سویا ساس، چلی ساس، کارن فلاور، دو چمچ دودھ یا پانی میں مکس کر کے۔ تیل، تلنے کے لیے۔ اجینو موتو، کالی مرچ، حسبِ ذائقہ۔ بیسن، تین پیالی۔

ترکیب: تمام سبزیاں باریک لمبائی کی صورت کاٹ کر مکس کرلیں، ایک برتن میں بیسن اور کارن فلاور ڈال کر پانی ملے دودھ سے پھینٹ لیں اور اس میں دو کھانے کے چمچ سویا ساس، چلی ساس، ایک ٹی اسپون اجینو موتو، کالی مرچ ڈال کر پھینٹیں۔ اب اس آمیزے میں تمام سبزیاں ملالیں، کڑاہی میں تیل کو گرم کرلیں اور اس میں چمچ کی مدد سے پکوڑے ڈالتے جائیں سنہرا ہونے پر نکال لیں اور کیچپ کے ساتھ تناول فرمائیں۔

اگرچہ چین میں تو پکوڑوں کا تصور نہیں ہاں پاکستان میں چینی سبزیاں استعمال کر کے پکوڑے

بنائے جاسکتے ہیں اور اس میں ہری مرچ اور سرخ مرچ کا استعمال بھی اپنے ذوق کے مطابق ضرور کیجیے۔

مہرین خان، سکھر

رائل بریڈ پڈنگ

اجزا: ڈبل روٹی کے سلائسز، چھ سے آٹھ عدد۔ دودھ، آدھا لیٹر۔ چینی، آدھی پیالی۔ کنڈینسڈ ملک، آدھی پیالی۔ کارن فلاور، دو کھانے کے چمچ۔ الائچی، بادام، پستے، حسبِ پسند۔ گھی، تلنے کے لیے۔

ترکیب: سلائس کو گول گول کاٹ لیں، فرائنگ پین میں گھی ڈال کر سلائس سنہرے تل لیں۔ چینی کا شیرا بنانے کے لیے اس میں چوتھائی پیالی پانی ڈال کر اچھی طرح ملالیں اور اسے درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ پکا کر چولھے سے اتارلیں۔ فرائی کیے ہوئے سلائسز کو شیرے میں ڈال کر دو سے تین منٹ رکھیں اور نکال کر سرونگ پلیٹ میں رکھتے جائیں۔ دودھ کو ابلنے رکھیں اور ابال آنے پر اس میں الائچی اور بادام پستے ڈال دیں، پانچ سے سات منٹ پکا کر اس میں چمچ چلاتے ہوئے کارن فلاور (دو کھانے کے چمچ ٹھنڈے دودھ میں ملا ہوا) شامل کردیں۔ دو سے تین منٹ میں جب دودھ گاڑھا ہونے پر آجائے تو اس میں کنڈینسڈ ملک ملالیں اور اچھی طرح ملاتے ہوئے چولھے سے اتارلیں۔ چمچ کی مدد سے اس آمیزے کو پھیلا کر سلائسز پر لگادیں۔ اس کی پریزنٹیشن کو خوب صورت بنانے کے لیے کسٹرڈ بناتے ہوئے اس میں چٹکی بھر فوڈ کلر ملالیں اور اوپر سے تھوڑے سے بادام پستے چھڑک دیں۔

حنا، حیدرآباد

بالائی کی سویّاں

اجزا: سویّاں، ایک کلو۔ کشمش، ایک پاؤ۔ شکر، ایک کلو۔ گھی، ایک چھٹانک۔ بالائی، ایک کلو۔ بادام پستے، تین چھٹانک دودھ، ایک کلو۔ زردے کا رنگ، آدھا چائے کا چمچ۔ لونگ، الائچی، تین سے چار عدد۔

ترکیب: پہلے گھی میں لونگ، الائچی کا بگھار دے کر سویّوں کو اس میں ڈال دیں، جب سویّاں بادامی رنگ کی ہوجائیں تو دودھ بھی ملادیں، بعد ازاں کشمش صاف کر کے اور بادام پستے کی ہوائیاں کاٹ کر اس میں ملادیں، جس وقت دودھ خشک ہوجائے تو شکر ملا کر دس منٹ تک خوب چلائیں، جب سب ایک جان ہوجائیں تو اس میں زردے کا رنگ ملا کر اور خوشبو کے لیے کیوڑا اور زعفران حل کر کے ملادیں، دو تین ابال آنے پر اتارلیں۔

ہما انصار......کراچی

فروٹی کریمی سویّاں

اجزا: سویّاں، آدھا پیکٹ۔ دودھ، دو کلو۔ فریش کریم، ایک کپ۔ بادام، (کٹا ہوا) دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک کپ۔ گھی، دو کھانے کے چمچ۔ انگور، آدھا کپ۔ آم، ایک چوتھائی کپ۔ سیب، ایک چوتھائی کپ۔ کیلے، آدھا کپ۔ چھوٹی الائچی، پانچ عدد۔ لونگ، دو عدد۔

ترکیب: دودھ میں دو الائچی ڈال کر پکالیں۔ اب ایک پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں الائچی اور لونگ ڈال کر کڑکڑالیں۔ اب اس میں سویاں ڈال کر بھونیں پھر اس میں دودھ ڈال دیں تھوڑی دیر پکانے کے بعد اس میں چینی ڈال کر پکالیں۔ تھوڑی ٹھنڈی ہونے پر اسے ڈش میں نکال کر اس میں کریم تمام پھل اور بادام ملالیں۔ فروٹی کریمی سویاں تیار ہیں۔

شازیہ افضل......کراچی

☆☆☆

سندیسے



چاندرات

ٹہنی ٹہنی ڈالی ڈالی
ہر اک پھول ہر کلی مسکرائی
بچوں بڑوں سب ہی کے لبوں پر
آسودگی ہنسی بن کے آئی
ستاروں نے کالے آسماں پر
اپنی حسیں کہکشاں پھر سجائی
چندا نے اپنے چہرے پر سے
بادلوں کی سفید چادر ہٹائی
نظر جو پڑی چاند پر تو
ہر اک کی زباں پر یہی بات آئی
شکر ہے خدا کا ہوئے پورے روزے
مبارک ہو سب کو پھر چاندرات آئی

شاعرہ: عالیہ ضیا، کراچی

تیرے نام عید کی خوشیاں

عید کی خوشیاں تیرے نام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
ہوش اڑائی جیون شام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
ہاتھوں میں مہندی کی آگ عرش سے اونچے تیرے بھاگ
پیار کے خالص تجھے پیام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
جو رنگ پہنے بج جائے جو دیکھے ششدر رہ جائے
خاص ہو کوئی یا کہ عام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
روپ کا کندن دہکا دہکا حسن کا جادو مہکا مہکا
نین کٹورے بھیگے جام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
بانہوں میں چوڑی کی کھن کھن، پیروں میں پائل کی چھن چھن
یکجا ہوجائیں راگ تمام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
پھول تیرے قدموں سے کھیلیں دوست بلائیں تیری لے لیں
چین ہوں حاصل تجھے دوام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
خوشبو تیرے سنگ سنگ گھومے بکھری لٹ یہ ماتھا چومے
اندھیارے ہوں دور تمام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
دل سے نکلی ہر ہر آس پوری ہو اور بجھ جائے پیاس
عالی کے بیٹھے پیغام، کاش کہ اب کے ایسا ہو

شاعرہ: عالیہ بشیر عالی، اسلام آباد

رمضان نامہ

کل رویتِ ہلال کمیٹی کے صدر نے
چندا میاں سے پوچھا بڑے احترام سے
کیوں دیر کر کے آئے ہو جب رات ہوگئی
بولا پھنسا ہوا تھا ٹریفک میں شام سے

......☆☆......

اس کی فیاضی کے بارے میں کیا کہوں آپ سے
شان و شوکت سے کہا سب کو تم گھر لے چلا
دعوتِ افطار دی تھی اپنے گھر کنجوس نے
سارے مہمانوں کو جو مسجد کے اندر لے چلا

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

ایک آسانی

جس دن سے اس بے وفا کو چھوڑا ہے دوستو!
یقین کرو
موبائل کی بیٹری
تین سے چار دن آرام سے چل جاتی ہے

مرسلہ: سنبل ملک، لاہور

روحانی مشورے

ادارہ



فضائل شب قدر

☆نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لیے) کھڑا ہو، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

☆حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا گویا ساری ہی خیر سے محروم رہ گیا اور اس کی بھلائی سے محروم نہیں رہتا مگر وہ شخص جو حقیقتاً محروم ہی ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

☆نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ شب قدر میں حضرت جبرائیلؑ ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں اور اس شخص کے لیے جو کھڑے یا بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہا ہے (اور عبادت میں مشغول ہے) دعائے رحمت کرتے ہیں اور جب عیدالفطر کا دن ہوتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اپنے فرشتوں کے سامنے بندوں کی عبادت پر فخر فرماتے ہیں اور ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! اس مزدور کا جو اپنی خدمت پوری پوری ادا کر دے کیا بدلہ ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی اجرت پوری دے دی جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتوں! میرے غلاموں نے اور باندیوں نے میرے فریضے کو پورا کر دیا پھر دعا کے ساتھ چلاتے ہوئے (عیدگاہ کی طرف) نکلے ہیں میری عزت کی قسم، میرے جلال کی قسم، میری بخشش کی قسم، میرے بلند مرتبے کی قسم! میں ان لوگوں کی دعا ضرور قبول کروں گا پھر ان لوگوں کو خطاب فرما کر ارشاد ہوتا ہے کہ جاؤ تمہارے گناہ معاف کر دیے ہیں اور تمہاری برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا ہے، پس یہ لوگ عیدگاہ سے ایسے حال میں لوٹتے ہیں کہ ان کے گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

شب قدر کی دعا

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اگر مجھے معلوم ہو کہ شب قدر کون سی ہے تو (اس رات میں) کیا دعا کروں......؟ فرمایا (دعا میں) یوں کہو۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ

ترجمہ: اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند فرماتا ہے لہٰذا مجھے معاف کر دے۔ (مسند احمد)

قرآن کریم کی تلاوت کے فضائل

روزانہ قرآن عظیم کی تلاوت کیا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ قرآن پڑھا کرو۔ اس لیے کہ یہ قرآن قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرنے کے لیے آئے گا۔

☆حدیث قدسی میں آیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں، جس شخص کو قرآن کریم (کی تلاوت کرنے، یاد کرنے یا تفسیر و ترجمہ پر غور و فکر کرنے) کی مشغولیت (مصروفیت) نے میرا ذکر کرنے اور مجھ سے دعائیں مانگنے سے روک دیا (ذکر کرنے اور دعا مانگنے کی فرصت نہیں ملی) تو میں اس شخص کو اس سے بڑھ کر دیتا ہوں جو میں دعائیں اور حاجتیں مانگنے والوں کو دیتا ہوں (اس کی تمام حاجتیں اور مرادیں پوری کر دیتا ہوں) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کو تمام کلاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے (اور فوقیت) حاصل ہے

جیسی خود اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنی تمام مخلوق پر۔

☆ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ قابل رشک دو ہی شخص ہیں ایک وہ شخص جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کی دولت عطا فرمائی اور وہ شب و روز اس پر عمل کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا اور وہ شب و روز (اس کے حکم کے مطابق اس مال کو) خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ روزانہ کچھ نہ کچھ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرے، اس سے قرآن کریم سے تعلق بھی رہتا ہے اور گھر میں اور کاموں میں برکت بھی حاصل ہوتی ہے۔ رمضان المبارک میں چونکہ اجر بڑھا دیا جاتا ہے تو قرآن پاک کو پڑھنا اپنے اوپر لازم کرلیں...... ثواب جتنا لوٹنا ہے اس مقدس ماہ میں لوٹیں کہ پھر پتا نہیں اگلا رمضان ملے بھی یا نہیں، اپنی دعاؤں میں اپنی اس گناہ گار بہن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

آئیے دعا مانگیں

اس دعا پر بار بار غور کیجیے کہ کتنی اہم دعا ہے اور اس دعا کو حضرت سلیمانؑ مانگ رہے ہیں، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور نبی خود اس بات کی دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما تو اندازہ لگائیں کہ ہم سب کو شکر کی توفیق مانگنے کے لیے کتنی دعائیں مانگنی ہوں گی۔ چنانچہ ہمیں یہ دعا مانگنی چاہئیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ شَکَّارًا لَکَ ذَکَّارًا لَکَ رَھَّابًا لَکَ مِطْوَاعًا لَکَ مُخْبِتًا اِلَیْکَ اَوَّاھًا مُنِیْبًا

ترجمہ: اے رب! کردے مجھے ایسا کہ میں تیرا شکر کیا کروں، تجھے بہت یاد کیا کروں، تجھ سے بہت ڈرا کروں، تیری بہت فرمانبرداری کیا کروں، تجھ ہی سے سکون پانے والا اور آہ و زاری کے ساتھ متوجہ ہونے والا ہو جاؤں۔''

آپ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ شَکُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا

ترجمہ: ''اے اللہ! مجھے نہایت شکر گزار بندہ بنادے اور کردے مجھے اعلیٰ درجہ کا صبر کرنے والا۔''

اس دعا میں یہ مانگا گیا ہے کہ مجھے شکور بنا یعنی بہت زیادہ شکر کرنے والا اور اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کو قرآن کریم میں عَبْدًا شَکُوْرًا (شکر گزار بندہ) کا خطاب دیا گیا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا شَاکِرِیْنَ لِنِعْمَتِکَ مُثْنِیْنَ بِھَا قَابِلِیْھَا وَاَتِمَّھَا عَلَیْنَا

ترجمہ: ''اے اللہ ہم کو اپنی نعمتوں کا شکر گزار اور ان پر تعریف کرنے والا اور اس کا قبول کرنے والا بنادے اور ہمارے اوپر اپنی نعمت پوری فرمادے۔''

آپ ﷺ شکر کے لیے یہ دعا بھی مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اُعَظِّمُ شُکْرَکَ وَاُکْثِرُ ذِکْرَکَ وَاَتَّبِعُ نَصِیْحَتَکَ وَاَحْفَظُ وَصِیَّتَکَ

ترجمہ: ''اے اللہ! تو مجھے ایسا بندہ بنادے کہ خوب تیرا شکر کروں، تجھے کثرت سے یاد کیا کروں اور تیری نصیحت مانوں اور تیرے حکم کی پاس داری کروں۔'' کبھی فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَحُسْنَ عِبَادَتِکَ

ترجمہ: ''اے اللہ! میں آپ کی نعمت پر شکر گزاری مانگتا ہوں اور آپ کی عبادت کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنے کا طالب ہوں۔'' غور کیجیے، شکر کتنی اہم اور عظیم دولت ہے کہ آپ ﷺ مختلف دعاؤں کے ذریعے اس کو مانگا کرتے تھے۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بچی کا قد

نور الھدیٰ......فیصل آباد

سوال:۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی عمر 12 سال ہے اور اس کو ماہواری آگئی ہے۔ لیکن اس کا قد بہت چھوٹا ہے۔ یعنی 4 فٹ اور 14 انچ ہے۔ ماہواری کے بعد کیا لڑکی کا قد نہیں بڑھتا، اس سلسلے میں، میں بہت پریشان ہوں۔ میری ایک ہی بچی ہے مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کریں۔ کوئی اچھی سی دوا بتائیں تاکہ اس کا قد بھی نکلے اور رنگ بھی صاف ہوجائے۔ کیونکہ اس کا رنگ بھی سانولا ہوتا جارہا ہے۔ چھوٹی تھی تو گوری تھی مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی جارہی ہے اس کا رنگ سانولا ہوتا جارہا ہے اور قد بھی چھوٹا ہے۔ کوئی نسخہ تجویز فرمادیں تاکہ یہ سر اٹھا کر زندگی گزار سکے، عمر بھر آپ کو دُعائیں دوں گی۔

جواب:۔ گھبرانے اور پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ ہوگا وہی جو رب چاہے گا۔ متوازن غذا دیں (سبزی، دال، پھل، گوشت، دودھ، انڈے) گھر کی بنی ہوئی۔ ورزش کرائیں۔ قد ہمیشہ خاندان (ماں اور باپ) کے حساب سے بڑھتا ہے۔ تین ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرا کر بچی کی حالت بتائیں۔ Pulsatilla30 Sarsaprilla 30 Iodium 30 ہر دوا کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کرائیں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

____

☆☆☆

مینسز کا مسئلہ

افشین......حیدر آباد

سوال:۔ بہنوں کی بیماریوں سے متعلق یہ نیا سلسلہ بہت اچھا ہے اور قابلِ ستائش ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میری بیٹی 24-23 سال کی ہے۔ آغاز میں چند سال اسے مینسز بالکل درست اور وقت پر آرہے تھے۔ مگر اُن چند سالوں کے بعد یہ سلسلہ خود بخود رک سا گیا ہے اور اب دو، دو، تین، تین ماہ کے بعد آنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں نے دو ڈھائی ماہ ہومیو پیتھک علاج بھی کروایا تھا مگر مینسز کا وقفہ درست نہ ہوا۔ عرض یہ ہے کہ اب دو تین ماہ بعد اس کی شادی ہے۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد کوئی الجھن تو پیش نہیں آئے گی۔ ویسے صحت کے لحاظ سے ماشاء اللہ بالکل فٹ اور تندرست ہے اور کوئی دوسرا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر جلدی جواب اور علاج تجویز کریں۔

جواب:۔ فکر اور پریشانی سے بھی بعض اوقات فرق پڑ جاتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی میڈیسن ایک ماہ کے استعمال کے بعد حالت سے آگاہ کریں۔ Calc.Carb 30 ، Pulsatilla30 کے 5,5 قطرے اور Q-



Alet Farinosa کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

★★★

بدخیالات ولیکوریا

نسرین......وزیر آباد

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا ہے۔ اس کا بہت علاج کروایا ___ ایلوپیتھک کا بھی، ہومیو پیتھک کا بھی، حکمت کا بھی اور ٹونے ٹوٹکے بھی استعمال کیے جو کہ میری دادی جان نے کروائے تھے مگر مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میں اب بے حد مایوس ہوگئی ہوں۔ پھر میں نے پاکیزہ میں ہومیو کلینک پڑھا تو سوچا کہ مجھے آپ سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اس لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے کسی بھی رسالے میں۔ مجھے اس میں اُمید کی کرن نظر آئی ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں پہلے مجھے لیکوریا تھوڑا تھا لیسدار پیلے رنگ کا۔ پھر بڑھتا رہا اب یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ پانی کی طرح شروع ہوگیا ہے جس سے میرے کپڑے خراب ہوجاتے ہیں اور بدبو بھی بہت آتی ہے جس کی وجہ سے مجھے نماز پڑھنے میں بھی دقت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے میری کمر میں تو درد ہوتا ہی تھا اب بہت زیادہ رہنے لگا ہے اور اگر میں تھوڑا سا چل .... لوں یعنی بازار وغیرہ چلی جاؤں تو کمر میں تکلیف ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اب میری پنڈلیوں میں بھی درد رہتا ہے اور میرے بریسٹ بھی تھوڑے نرم پڑ گئے ہیں اور میں بہت کمزور بھی ہوں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ پیلا ہے، یعنی رنگت میں سرخی نہیں ہے۔ آنکھیں بھی اندر سے پیلی پڑی ہوئی ہیں اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی بے تحاشا ہیں۔

میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مجھے عجیب وغریب خواب آتے ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہوں۔ میرے خط کا جواب ضرور اور جلدی دیجئے گا اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

جواب: عمر کے ساتھ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے (کسی بھی طریقہ سے) بعض اوقات جب ہم ان چیزوں کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں تو وہ ہمارے خواب میں بھی آجاتی ہیں۔ چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ وہ نہیں جو آپ کر رہی ہیں۔ کیونکہ یہ خیالات چپکنے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا خیالات کو آنے دیں' ان کو مثبت کی طرف لے جانے کی مشق کریں۔ نماز پابندی سے پڑھتی رہیں۔ اچھی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کریں۔ ہیجان انگیز فلموں اور ڈراموں سے اجتناب کریں۔ کھانا متوازن کھائیں۔ تیز مرچ ومصالحہ استعمال نہ کریں۔ کوئی گیم کھیلیں، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس وغیرہ۔ صبح نہار منہ دودھ پیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ Kreosote 30 , Origanum 30 کے 5,5 قطرے اور Alfalfa Q کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ ہر کھانے کے ایک گھنٹے بعد استعمال کریں۔

***

نیند میں کانپنا

اُم اعیان.........ڈیرہ غازی خان

سوال: ڈاکٹر صاحب' بعد سلام عرض ہے کہ میری بیٹی جس کی عمر اس وقت ساڑھے پانچ سال ہے اس کو ایک مسئلہ درپیش ہے۔ شیر خوارگی کی عمر سے ہی میں نے محسوس کیا ہے کہ نیند میں اگر اسے ہلایا، جلایا جاتا ہے جیسے عموماً بچے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نیند سے اُٹھا کر لٹا دیا جاتا ہے تو اس کا جسم کانپنے لگ جاتا ہے جو کہ آج تک برقرار ہے۔ لیکن اس کی یہ کیفیت سیکنڈز یعنی چند لمحات کی ہوتی ہے۔ جسم کچھ دیر کانپتا ہے لیکن اس کی نیند ڈسٹرب نہیں ہوتی۔ میرے شوہر آرمی میں میڈیکل کور میں شعبۂ نفسیات میں نائیک ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا اس کنڈیشن کے دوران بچی بستر پر پیشاب تو نہیں کرتی تو ہم نے کہا نہیں۔ میری بچی دودھ شوق سے پیتی ہے باقی کھانے پینے کی چور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ماشاء اللہ ذہین اور ایکٹو بچی ہے۔ اپنی کلاس میں پوزیشن لی ہے۔ ون کلاس میں ہے۔ ویسے بھی ٹھیک ہے لیکن اب بھی کبھی کبھار اس کا جسم نیند میں کانپتا ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں آپ سے اپنی تسلی کے لیے مشورہ کرنا چاہتی ہوں کہ کیا کروں۔ کوئی ہومیوپیتھک دوا بتائیں۔ بچی کی رپورٹس کی کاپیاں آپ کو ارسال کر رہی ہوں۔ دوا تجویز کر کے مہربانی فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ یہ کس وجہ سے ہے۔ کیا آئندہ زندگی میں اس کے لیے کوئی مسئلہ بن سکتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں، میری رہنمائی کریں۔

جواب: آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ آپ فکرمند ہوں۔ ہمیں لگتا ہے کہ بچی میں آئرن وکیلشیم کی کمی ہے۔ اس لیے کہ وہ اور

چیزوں کی طرف رغبت نہیں رکھتی۔ تین ماہ تک اس کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Fer.Phos 30 صبح وشام اور Calc.Carb 30 دوپہر رات کو پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کرائیں۔ انشاء اللہ بچی جلد بہتر ہوجائے گی۔

***

بدنما ناک

قربان علی... سبی، بلوچستان

سوال: ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ناک کی نرم والی ہڈی، یعنی دونوں نتھنوں کے درمیان والی ہڈی ٹیڑھی ہے۔ اس طرح کہ الٹی طرف والی سیدھی طرف ہے یعنی الٹی طرف چنے کی دال جتنا گڑھا بنا ہوا ہے اور وہ سیدھی طرف کو نکلا ہوا ہے اور ناک تھوڑی بڑی ہے۔ جب چھوٹا تھا تو ناک چھوٹی تھی اور ہڈی بھی سیدھی تھی مگر میں نے ناک کو دبا دبا کر اور نتھنوں میں انگلیاں مار مار کر اس طرح کر دیا ہے۔ ناک کی تھوڑی بہت چونچ بھی نکلی ہوئی ہے۔ برائے کرم ایسا علاج بتائیں کہ ناک کی ہڈی سیدھی ہوجائے اور ناک کی چونچ بھی درست ہوجائے اور ساتھ ساتھ ناک چھوٹی بھی ہوجائے بہت ہی پریشان رہتا ہوں۔ جب آپ محترم کا نام اور قابلیت سنی اور پڑھی تو مجھے میری منزل نظر آئی۔ ہاتھ جوڑ کر آپ سے فریاد کرتا ہوں میری مدد فرمائیں، مجھے تسلی بخش جواب دیں۔ تاعمر دعائیں دوں گا۔

جواب: تم خود یہ کیسے تشخیص کر رہے ہو کہ تمہاری ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں اس ہڈی کے ٹیڑھے ہونے سے کیا تکلیف ہوتی ہے یہ تم نے نہیں لکھا۔ میری رائے میں کسی پلاسٹک سرجن کو دکھاؤ وہ تمہارا صحیح حل نکال سکتا ہے۔ ویسے تسلی کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Flour 30 کے پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔



***

برے کام کے بدنتائج

احسن خان..........اسلام آباد

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کو بڑی مجبوری میں خط لکھ رہا ہوں۔ قبیح عادت کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا ہوں۔ عادت تو چھوٹ گئی ہے لیکن بیس سال وہ عادت رہی۔ اب تمام بیماریوں میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ذکاوتِ حس، سرعتِ انزال اور احتلام زیادہ ہونے سے جسم بالکل کمزور ہو چکا ہے۔ اعصابی کمزوری' کندھوں، ٹانگوں، کمر میں درد اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا ہے۔ ہر وقت غصہ آتا رہتا ہے۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ نظام انہضام خراب ہو چکا ہے۔ کوئی میٹھی چیز، طاقت والی چیز نہ پی سکتا ہوں اور نہ کھا سکتا ہوں۔ بادی بواسیر بھی ہو گئی ہے۔ کافی علاج کروایا لیکن فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ اگر معدے کا اور بواسیر کا علاج کرواتا ہوں تو جسم کمزور ہوتا جاتا ہے اور اگر جنسی علاج کرواتا ہوں تو قبض اور بواسیر کی پرابلم پیدا ہوجاتی ہے۔ صرف چیکو کھانے سے پاخانہ ٹھیک آتا ہے۔ برائے مہربانی دونوں کے لیے کوئی اچھی سی دوا... تجویز کریں کیونکہ زندگی گزارنی

مشکل ہوگئی ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر مجھ پر رحم فرمائیں۔

جواب:۔ احسن یاد رکھو! جب بھی کوئی غلط کام کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کو خراب ہی ملے گا۔ جو کو بو کر گندم نہیں کاٹی جاسکتی۔ گناہ سے توبہ کرنے کے بعد اچھے کام کریں۔ ان چکروں میں نہ پڑیں۔ سادہ غذا کا استعمال کریں۔ مرچ مصالحے اور مرغن غذائیں بالکل بھی استعمال نہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد اپنی حالت سے آگاہ کریں Nux Vomica 30 Origanum 30 ...... کے 5, 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور کھانے کے بعد Alfalfa Q کے دس قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

***

پتلے اور روکھے بال

سمعیہ سہیل......کراچی

سوال:۔ میں 19 سال کی ہوں اور مجھے آپ سے اپنا یہ مسئلہ بیان کرنا ہے کہ میرے بال بہت ہلکے ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں، میں انہیں تیل بھی لگاتی ہوں، ہفتے میں دو دفعہ سے زیادہ شیمپو بھی استعمال نہیں کرتی۔ لیکن بال بہت ہلکے اگتے ہیں۔ میں انہیں مہینے دو مہینے کے گیپ سے کٹواتی بھی رہتی ہوں (جو نوکیں نکل آتی ہیں) لیکن پھر بھی بہت پتلے اور روکھے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ بڑھتے نہیں ہیں لیکن صرف نوکیں ہی بڑھتی ہیں۔ مجھے بڑے اور لمبے بالوں کا بہت شوق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھ میں ایک دانہ ہوا تھا جیسے ہوجاتے ہیں آنکھ کی کھال پر۔ مجھے اس میں کوئی تکلیف یا چبھن نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہوجائے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ گرم کپڑے کی سکائی کرو، میں نے کی، ڈاکٹر کو دکھایا، کھانے کے لیے دوا دی اور کہا کہ بیس دن بعد آکر نتیجہ بتائیں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی اثر نہیں ہوا۔ تھوڑی سی سوجن کم ہوگئی لیکن دانہ ابھی تک ہے اور اس کو ہوئے تقریباً تین مہینے ہوچکے ہیں۔ مجھے کسی نے اس پر مٹی کے پیالے کا لیپ لگانے کا کہا لیکن ابھی تک یہ ٹوٹکا میں نے نہیں آزمایا۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے دونوں مسائل کا حل بتادیجیے، میں آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔

جواب:۔ بی بی، آنکھ کا معاملہ ہے بغیر دیکھے دوا تجویز نہیں کی جاسکتی۔ ہاں البتہ بالوں کے لیے زیتون کا تیل استعمال کریں تو ایک شیمپو بھی دیں گے۔ کھانے کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Phos 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور Alfalfa Q کے سات قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔